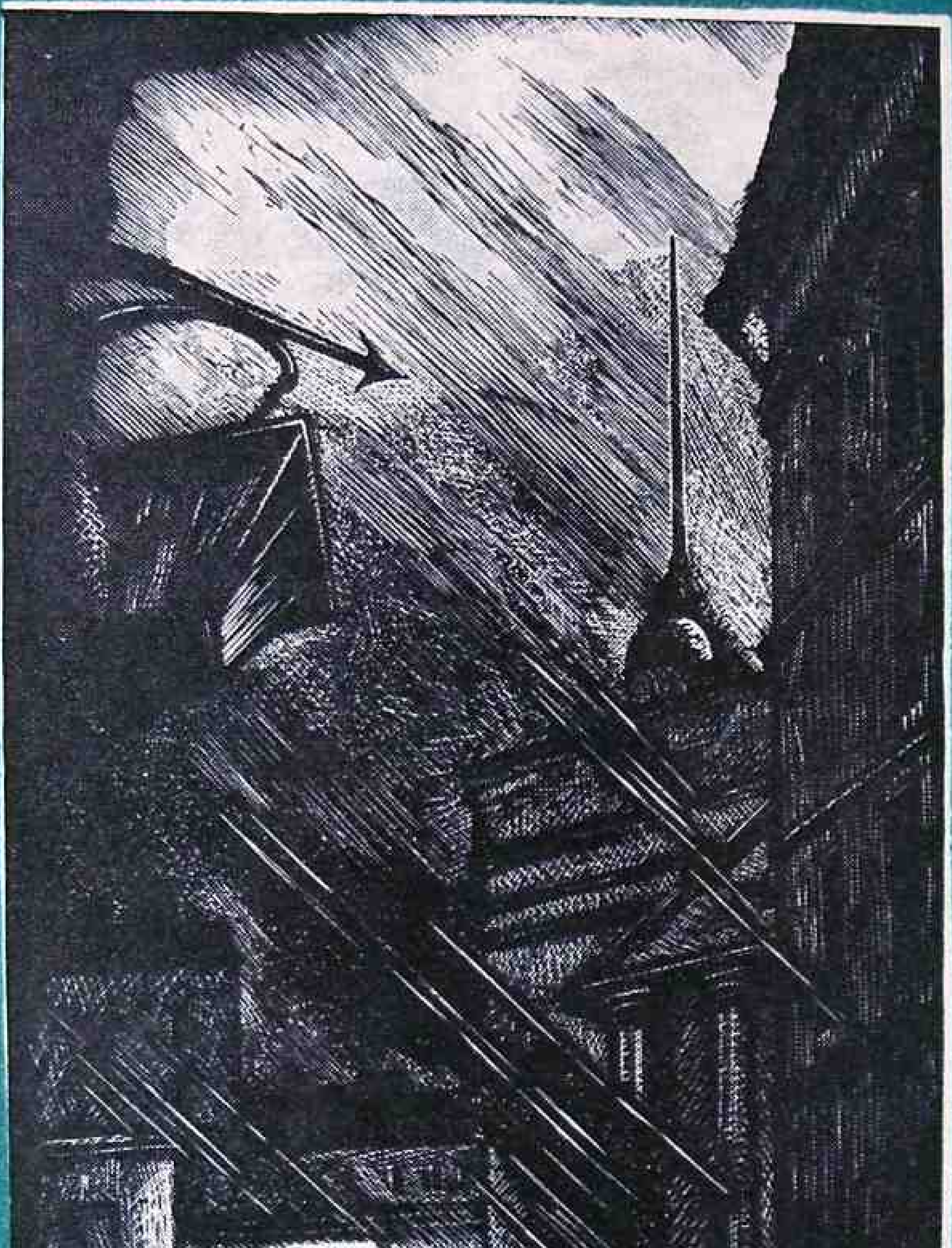
فیودر
دستوئیفسکی



ذلتوں کے مارے لوگ

''ذلتوں کے مارے لوگ'' فیودر دستوئیفسکی (۱۸۲۱ء تا ۱۸۸۱ء) کے مشہورترین اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناولوں میں سے ایک ناول ہے۔

یہ ناول ۱۸۶۱ء میں دستوئیفسکی کی چارسالہ قید بامشقت اور معمولی سپاہی کی حیثیت سے چند برس کی فوجی خدمت کے بعد، جس کی انہیں ۱۸۴۹ء میں ایک اشتراکی حلقے میں شرکت پر سزا دی گئی تھی، ان کی پیٹرسبرگ واپسی کے فوراً بعد شائع ہوا تھا۔

ناول کے کرداروں — اخمنیف خاندان، یتیم بچی نیلی، مبتدی ادیب ایوان پترووچ — کی کہانی میں دستوئیفسکی نے اپنے فن کے مرکزی موضوع یعنی ''انسانیت کے اس نوے فیصد'' حصے کی زندگی کے لئے درد کا اظہار کیا ہے جسے اس کے ہم‌عصر سماج نے اخلاقی طور پر کچل دیا تھا، بےنصیب کر دیا تھا۔

فیودر
دستوئیفسکی

ذلّتوں کے مارے لوگ

(چار حصے اور اختتامیہ)

"رادوگا" اشاعت گھر
ماسکو

ترجمہ: ظ۔ انصاری

Ф. Достоевский

УНИЖЕННЫЕ И ОСКОРБЛЕННЫЕ

на языке урду

Fyodor Dostoyevsky

THE INSULTED AND HUMILIATED

in Urdu

فہرست

پیش لفظ

دستوئیفسکی نے ''کرامازوف برادران''، ''جرم و سزا'' اور ''ایڈیٹ'' جیسی شاہکار کتابیں بھی تخلیق کی ہیں لیکن ''ذلتوں کے مارے لوگ'' ایک اور طرح کی کتاب ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جس سے گذرکر ہم اس عظیم مصنف کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں ان کے وہ ابتدائی خاکے ہیں جن میں رنگ بھرنے پر بعد کے عظیم شاہکار سامنے آئے۔ جو لوگ ''ذلتوں کے مارے لوگ'' سے دستوئیفسکی کی تصانیف کا مطالعہ شروع کریں گے خوش قسمت ہوں گے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ ان لاانتہا پیچیدگیوں اور بھرپور فلسفے سے ڈر نہیں جائیں گے جو دستوئیفسکی کے بڑے بڑے ناولوں میں موجود ہیں اور دوسری طرف وہ اس لاانتہا پیچیدہ دنیا کے جذباتی ماحول کو دل سے محسوس کر لینے کے بھی قابل ہوجائیں گے جس کی طرف ناول ''ذلتوں کے مارے لوگ'' ہمیں لے جاتا ہے۔ بعد میں اس دنیا میں داخل ہوکر انسان، جان لینے کی روحانی تڑپ کے ساتھ، کسی مستقل، اہم اور اس کا مطلب ہے کہ خود دستوئیفسکی کے لئے قابل قدر جذبے کے ساتھ لمس محسوس کرنے لگتا ہے۔ دردمندی اور غصے کے جذبات، جو ''ذلتوں کے مارے لوگ'' کے کردار اتنی وضاحت کے ساتھ ابھارتے ہیں وہ دستوئیفسکی کے ضخیم ناولوں کی پیچیدگیوں، تضاد کی گرہوں کو سمجھنے اور دستوئیفسکی کے محبوب کرداروں کی مثال پر نیکی تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

دستوئیفسکی کی دنیا کو سمجھنے کا یقیناً ایک اور راستہ بھی ہے۔ ناول ''ذلتوں کے مارے لوگ'' کو مصنف کی بڑی بڑی کتابوں کے بعد پڑھ کر، ایک مختلف قسم کا لطف بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قاری کو یہاں وہ ابتدائی کونپلیں ملیں گی جن سے بعد میں مشہور زمانہ کردار اور خیالات منظر عام پر آئے۔

''ذلتوں کے مارے لوگ'' کو پڑھنے کا ایک اور تیسرا طریقہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اسے نہ صرف پہلی کتاب کے طور پر پڑھا جائے

بلکہ دستوئیفسکی کی کتابوں کے آخر میں، انجام کار نتائج اخذ کرنے کے لئے پڑھا جائے۔ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا یہ ناول دستوئیفسکی کی پہلی بڑی تصنیف تھا، جو انہوں نے قید بامشقت، جلاوطنی اور فوجی خدمت کے بعد لکھا اور پیٹرسبرگ میں واپسی پر چھپوایا۔ ''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں دستوئیفسکی براہ‌راست اپنے ماضی، ماضی کی اپنی تخلیقات کی طرف رجوع کرتے ہیں جب ۱۸۴۶ء میں وہ ایک پچیس سالہ فوجی انجنیر تھے اور انہوں نے خطوں کی صورت میں ''بیچارے لوگ،، کے عنوان سے پیٹرسبرگ کی کہانی لکھی تھی۔ ان کی بڑی قدر ہوئی تھی اور قید بامشقت اور جلاوطنی کی دس‌سالہ گمنامی میں کھو جانے سے پہلے وہ روسی ادب کے عروج پر پہنچ کر بہت جلد مشہور و معروف ہو گئے تھے۔

''ذلتوں کے مارے لوگ،، کے کردار ایوان پتروویچ کی پہلی ادبی تخلیق کی کہانی میں خود فیودر دستوئیفسکی کی ابتدائی ادبی زندگی کی تقریباً ہو بہ ہو تصویرکشی کی گئی ہے اور تنقید نگار بلینسکی کے لئے مصنف کے دل میں ابھی تک باقی، احسان‌مندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس طرح مصنف نے اپنے مقدم دوست اور ادبی استاد کی مہربانی کا اعتراف کیا ہے۔ تاہم ایوان پتروویچ کی پہلی تصنیف کے بارے میں کرداروں کے مستقل بحث و مباحثے کا کچھ اور مطلب بھی ہے۔

قید بامشقت کے بعد دوردراز سائبیریا کی جلاوطنی میں دستوئیفسکی کو بھی فکر رہی کہ اس کی اس قدر پرامید ادبی زندگی کی شروعات ہم‌عصروں کی یاد سے ہمیشہ کے لئے محو ہو گئی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا اور اس کے لئے وہ اپنے اندر غیرمعمولی قوت محسوس کرتے تھے۔ ان کا دماغ منصوبوں، خاکوں اور امیدوں سے بھرپور تھا لیکن ان کے ذہن کو مستقل اندیشے بھی گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اندیشہ یہ تھا کہ کیا وہ پہلی عظیم کوششیں رائیگاں تو نہیں ہو جائیں گی؟ اور سخت فوجی خدمت، مفلسی اور اپنی خوفناک حد تک غیرمتعین زندگی کی وجہ سے کیا اب وہ اپنی جوانی کی شہرت کو کبھی بھی لوٹا نہ سکیں گے؟ اس سے آگے بڑھ نہ سکیں گے؟

عظیم مصنف، جس نے ابھی اپنے عظیم شاہکار تخلیق نہیں کئے تھے، قابل احترام پڑھنےوالوں کو اپنے ماضی کی، اس وقت کی جب

وہ جوان اور مقبول تھا، جس تکرار کے ساتھ یاد دلاتا ہے اس سے دل مسوس کر رہ جاتا ہے: دیکھئے میں وہی ہوں جس کی آپ نے قدرافزائی کی تھی اور جسے آپ نے کبھی تسلیم کیا تھا۔

ایوان پتروویچ کی پہلی ادبی تخلیق کی کہانی میں، اس کے کام کرنے کے ڈھنگ اور حالات کا دوسرے ادیبوں کے کام سے موازنہ، ہیرو کے ناشر کی تصویر، یہ سب نوجوان دستوئیفسکی کی سوانح عمری کے حقیقی واقعات ہیں جو ناول میں بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن کردار ادیب کی بعد کی زندگی، شہرت کے عروج کی چوٹی سے اچانک محتاجی، بیماری اور تنہائی کی گمنامی میں گر جانا — دستوئیفسکی کی ادبی تخلیق میں اس کی اس زندگی کی محض بالواسطہ اور جذباتی عکسی ہے جو اچانک بیچ میں سے حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔

''ذلتوں کے مارے لوگ،، کئی لحاظ سے — خاکوں پر انحصار، کرداروں، یورپی ادب میں حقیقت نگاری کے معیار کے لحاظ سے بھی اور ''بیچارے لوگ،، میں شروع کی گئی خود اپنی روایت کے براہ‌راست تسلسل کے لحاظ سے بھی، ابھی ایک روایتی ناول ہے۔ اس بارے میں دستوئیفسکی نے ۱۸۵۷ء میں سائبیریا سے اپنے بھائی کو لکھا تھا: ''میں پیٹرسبرگ کی زندگی کے بارے میں 'بیچارے لوگ' کی طرز کا ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں (جس کا خاکہ 'بیچارے لوگ' سے بھی بہتر ہو)،،۔ وہ اس سب کچھ کو، جو آٹھ سال قبل بےرحم طاقت کے ذریعے منقطع کر دیا گیا تھا، جاری رکھنے، اس سے آگے نکل جانے پر بضد تھے۔ اپنی نوجوانی کی تصانیف سے وہ بعد میں آگے نکلے، ''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں مستقبل کے راستوں کے محض چند خطوط مرتب کئے گئے تھے۔

اپنے بعد کے ناولوں میں دستوئیفسکی نے تاریخی واقعات کی ترتیب کا کتنی صحت اور توجہ سے خیال رکھا ہے! لیکن ''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں وقت اور تاریخی واقعات کی ترتیب جیسے کہ جان بوجھ کر بدل دی گئی ہے۔ گویا کہ مصنف نے ان دس بارہ برسوں کو، جو ان کی ادبی زندگی سے چھن گئے تھے، نظر انداز کر دیا ہے۔ کچھ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنی طویل غیرموجودگی کے بعد، ان تاریخی زمانوں کے فرق کو واقعی ابھی محسوس نہیں کیا تھا جن کے بیچ ان کا اپنا المیہ واقع ہوا تھا یا ادیب کی زندگی پر

پہلی بار قلم اٹھاتے ہوئے وہ جان بوجھ کر اس غیرمعین صورتحال کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

ایوان پتروویچ کے روحانی کرب کی غیرواضح نوعیت پر تنقید نگار دبرولیوبوف نے، ناول کے منظر عام پر آتے ہی توجہ دلا دی تھی۔ لیکن کیا یہ خصوصیت ناول کی صرف جمالیاتی کمزوری کا نتیجہ تھی؟ خود اپنے احساس کے بارے میں کردار ادیب کی خاموشی میں آج ہمارے لئے، ناول کے ہیرو کے دکھ کو، مکمل اور واضح طور پر، صرف محبت کے المیے سے منسلک نہ کرنے کی مصنف کی خواہش دیکھ لینا مشکل نہیں۔ مصنف کے لئے ان مصائب کی ٹھوس وجوہات کو چھیڑے بغیر، جو ہیرو کو گھیرے ہوئے تھے، اہم یہ دکھانا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔ یہاں اس بلائے ناگہانی کے نفسیاتی نتیجے کا، جو گزر چکی تھی، پوری گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''اس لمحے میری تمام مسرت خاک میں مل گئی اور میری زندگی کے دو ٹکڑے ہو گئے!''، اس طرح ایوان پتروویچ اپنی منگیتر کے اچانک پرنس کے بیٹے کی محبت میں گرفتار ہو جانے کے بارے میں بتاتا ہے۔ یہ الفاظ ان دوسرے الفاظ کی یاد دلاتے ہیں جو بالکل دوسرے موقع پر کہے گئے تھے: ''خدا حافظ! مجھے اب اس سب کچھ سے بچھڑنا پڑ رہا ہے، جو مجھے عزیز تھا، اس سے جدا ہونا میرے لئے تکلیف دہ ہے! اپنے آپ کو، اپنے دل کو دو ٹکڑے کرنا میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ خدا حافظ! خدا حافظ!''، یہ الفاظ دستوئیفسکی نے اپنے بڑے بھائی کو ۲۲ دسمبر ۱۸۴۹ء میں لکھے تھے جب انہیں قید بامشقت کے لئے روانہ کیا جا رہا تھا۔

۶۱ — ۱۸۶۰ء میں دستوئیفسکی نے اپنے زمانے کے مرض آلود اور ناسازگار ماحول اور اس کے گہرے المیے کو، اپنی عظیم ذہانت کے ساتھ سمجھتے ہوئے اور ہولناک ذاتی تجربہ رکھتے ہوئے اس کی عکاسی کی۔ ایک صاحب فکر اور سچے مصور کی حیثیت سے انہوں نے اپنی تمام قوت، اپنے ہمعصر سماج کی شخصیتوں کی خطرناک بیماریوں کے نفسیاتی اثرات کی تحقیق پر مرکوز کر دی۔ ''ذلتوں کے مارے لوگ''، میں دستوئیفسکی نے نہ صرف اس انسان کا جو بلاواسطہ سماجی ناانصافی کے مصائب جھیل رہا ہے بلکہ اپنی پہلی تصنیف کے برعکس اس نے یہاں اس سماج کے ہر باسی کا گہرائی

اور باریکی کے ساتھ تجزیہ کرنے کی سعی کی ہے جس میں اس ناانصافی کا راج ہے۔ ''ذلتوں کے مارے لوگ''، میں اس نے شر سے شر کی پیدائش کی جدلیات کو موضوع تحریر بنایا ہے۔

''بیچارے لوگ''، اور ''ذلتوں کے مارے لوگ''، عنوانات کی شکل میں دستوئیفسکی کے دو کلیے ہیں۔ وہ مصنف کی ادبی زندگی کے مختلف ادوار میں اس کے سماجی و جمالیاتی موقف کی عکاسی کرتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں دستوئیفسکی نے روس کے دارالحکومت پیٹرسبرگ کی آبادی کے دھتکارے ہوئے حصے کی بےچارگی اور ذلت کی دہشتناک تصویروں کی طرف انسانی دل کے احساسات کو مبذول کرانے کا مقصد سامنے رکھا ہے۔ پیٹرسبرگ کے ''کونوں کھدروں''، کی مفلسی، ''مالکنیوں''، کی خوفناک شبیہیں، جو لگے ہاتھ زندہ مال کا بیوپار بھی کرتی تھیں، تپدق سے فنا ہوتے ہوئے نوجوان دانشوروں کی المناک زندگی — یہ سب کچھ دستوئیفسکی کی تصانیف میں شروع سے موجود تھا۔ اس کی خود دریافت کی ہوئی یہ دنیا اب کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑےگی اور بار بار وہ ''جرم و سزا''، ''ایڈیٹ''، اور ''نابالغ''، نامی اس کی تصانیف میں نظر آئےگی۔

لیکن یہ دنیا کیسے وسعت اختیار کرتی ہے، کیسے الجھتی ہے اور گہری ہوتی ہے! روحانی کشمکش کی باریکیوں میں جھانکنے کے لئے اس بےقراری کو ''ذلتوں کے مارے لوگ''، کے عنوان میں ظاہر کیا گیا ہے۔ نقادنگار دبرولیوبوف نے دستوئیفسکی کے دو کلیوں کے موازنے کے اصولی مفہوم کو محسوس کر لیا تھا اور انہوں نے اس ناول کے بارے میں اپنے مضمون کو ''ستمزدہ لوگ''، کا نام دےکر ایک تیسرا کلیہ سامنے رکھا۔ دبرولیوبوف نے یہاں، خود دستوئیفسکی کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے، اس عنوان کے تحت مسئلے پر، ایک انقلابی کی حیثیت سے، اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دستوئیفسکی نوجوانی کے اپنے خیالات کی تصحیح کرتے ہوئے کہتے ہیں: مصیبت صرف یہ نہیں کہ یہ بیچارے لوگ ہیں، زیادہ اہم یہ ہے کہ ذلتوں کے مارے ہیں۔ دبرولیوبوف اپنے طور پر دستوئیفسکی کی تصحیح اس طرح کرتے ہیں: مصیبت صرف یہی نہیں کہ یہ ذلتوں کے مارے لوگ ہیں، زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ستمزدہ ہیں جو خود پختہ خیالات اور مصمم اقدامات کی سکت نہیں رکھتے، لیکن دستوئیفسکی کی بدولت یہ لوگ دوسرے، روحانی لحاظ سے زیادہ

مضبوط اور زیادہ آزاد لوگوں کو فیصلہ کرنے اور عمل کرنے کے لئے بیدار کرتے ہیں۔

اپنے سماجی و جمالیاتی موقف کے نئے کلیے کو سامنے لاتے ہوئے دستوئیفسکی ایک مختلف، مفہوم کے لحاظ سے حقیقت نگاری کے ایک اونچے درجے کی طرف شعوری پیش رفت کی نشاندھی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ناول ''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں مصنف کو فن کی نئی بلندیاں سر کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں؟ اہل نظر قارئین کو اس ناول میں اکثر نظر آیا اور اب بھی نظر آئے گا کہ کئی فنی ترکیب بندیاں ڈھیلی سی ہیں، خاکوں کی ترتیبی چالیں کہیں کہیں فرضی معلوم ہوتی ہیں اور کئی مناظر ادبی لحاظ سے نئے نہیں ہیں۔

لیکن جو لوگ دستوئیفسکی کی بعد کی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں انہیں ان جمالیاتی خامیوں میں امیدافزا شروعات کے خطوط نظر آئیں گے۔ ایسے خطوط، جنہوں نے مصنف کے لئے مستقبل کا راستہ ہموار کیا اور جو ایک ناول کے لئے یہاں بہت زیادہ ہیں۔

تنقیدنگاروں نے ''ذلتوں کے مارے لوگ،، کا استقبال سردمہری سے کیا، اس ''پہلے قدم،، سے وابستہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ مصنف نے، جو خود بھی ناول سے مطمئن نہ تھا، تنقید نگاروں کے طعنوں کا جواب ایک کھلے خط کے ذریعے دیا، جس میں اس نے ''ذلتوں کے مارے لوگ،، پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا: ''... اس ناول کوشروع کرتے وقت جو کچھ میں وثوق کے ساتھ جانتا تھا وہ یہ ہے: ۱) کہ شائد ناول کامیابی سے ہم کنار نہ ہو پائے لیکن یہ شعریت سے خالی نہ ہوگا، ۲) کہ اس میں دو تین پرجوش اور موثر منظر ہوں گے، ۳) کہ دو سنجیدہ ترین کرداروں کی پوری صحت بلکہ فنکارانہ مہارت کے ساتھ تصویرکشی کی جائے گی۔ مجھے اس پر یقین تھا اور یہ میرے لئے کافی تھا۔ تصنیف عجیب و غریب نکلی لیکن اس میں کوئی پچاس صفحے ایسے ہیں جن پر مجھے فخر ہے...،،

اس بات کا تعین کرنا کہ کن پچاس صفحات پر دستوئیفسکی کو فخر تھا، کن مناظر کو وہ ''پرجوش اور موثر،، سمجھتا تھا اور کن کرداروں کی وہ ''پوری صحت اور فنکارانہ مہارت،، کے ساتھ تصویرکشی کرنا چاہتا تھا، کافی دلچسپ امر ہے۔

جیسا کہ عظیم مصنفوں کی کتابوں کے ساتھ ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ مختلف قارئین کو مختلف مناظر، مختلف مقامات بلکہ مختلف کردار بھی ''پرجوش،،، متاثرکن اور اہم نظر آئیں۔ لیکن ناول کے پہلے ہی اوراق میں مفلس بوڑھے اور اس کے خستہ حال کتے کے جو پیکر نظر آتے ہیں اور جو بھوتوں کی مانند، چپ پیٹرسبرگ کی سرد گلیوں میں گھسٹتے رہتے ہیں شائد ہی کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے گا۔ شاید خود یہ پیکر، جن پر انیسویں صدی کے اوائل کے مغربی یورپ کی ناول نگاری کی چھاپ بہت نمایاں ہے، اتنے متاثرکن نہیں جتنا اس لاعلاج بےچارگی کا، جرمن قہوہ خانے کے باسیوں کی مضحکہ‌خیز کندذہنی کے ساتھ، اختلاف متاثرکن ہے۔ یہ اب محض روسی رنگ میں ہوفمان اور ڈکنس نہیں بلکہ خود دستوئیفسکی ہے جو اپنے آپ کو اس یورپی ثقافت کا حق‌دار جانشین محسوس کرتا ہے جسے وہ دل و جان سے چاہتا ہے اور جس کے طویل راستوں کے خودپسند انجام سے وہ نفرت کے ساتھ منہ موڑ رہا ہے۔

پھر یہاں دوسرے اوراق اور دوسرا منظر ہے جس میں بالکل مختلف خیال اور مختلف شاعری ہے۔ ایک دوشیزہ ''ہاتھ سینے پر باندھے، اپنے خیالوں میں غرق،، بےقراری کے ساتھ ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہے۔ میز اور اس پر ٹھنڈے ہوتے ہوئے سماوار کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اس نظم کے اشعار گنگنا رہی ہے جس میں اسی طرح کا سماوار ہے، کھڑکی کے اس پار کہیں دور سے گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے اور اسی طرح ماضی میں مسرت اور حال میں غم اور تنہائی ہے۔ ''ہائے کیا خوب! کیسے پردرد اشعار ہیں، وانیا،، یہ نتاشا کے الفاظ ہیں، ''وہ سماوار، وہ گاڑھے کا موٹا پردہ — کس قدر اپناپن ہے ان میں...،، اس کے بعد اضطراب بھری، وہ گفتگو شروع ہوتی ہے جو سوچ اور احساس کی انتہائی باریکیوں میں اتر جاتی ہے۔ وہ گفتگو جو انسان پر ماضی کے اختیار، محبت کے تضادات اور انوکھے پن، ایثار اور فخر کے جذبات کے بارے میں ہے۔

روس میں عرصہ ہوا سماوار اور بستر کے پاس گاڑھے کے موٹے پردے بہت کم نظر آتے ہیں اور گھنٹی کی آواز بھی شائد ہی کسی نے سنی ہو لیکن اس منظر میں آخر کونسی وہ خاص بات ہے کہ ناول کی کہانی کی تمام پیچیدہ گرھیں بھول جاتی ہیں اور بےقراری کے ساتھ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی ہوئی یہ دوشیزہ یاد رہتی

ہے؟ ہو سکتا ہے اس لئے کہ دستوئیفسکی کے ناولوں میں اس کے یکے بعد دیگرے ایسی عورتوں کے کئی کردار ابھریں گے جو انتہائی مخلص احساسات کی اسی قوت کی مالک ہوں گی جو اسی طرح ''کرب، نزاکت اور برداشت،، کے ساتھ مسکرا رہی ہوں گی اور اسی طرح فخر کے ساتھ قربان ہو جانے اور معاف کر دینے کے لئے تیار ہوں گی؟ یا ہو سکتا ہے کہ اس لئے کہ لینن کے پردے اور گھنٹی کی قریب آتی ہوئی آواز کا اسی طرح کا منظر، بیس سال بعد، دستوئیفسکی کے اہم‌ترین ناول ''کرامازوف برادران،، میں دھرایا گیا ہے؟.. ''سائبیریا میں کس لئے؟ لیکن اگر تم چاہتے ہو تو میں سائبیریا چلنے کے لئے بھی تیار ہوں، کوئی فرق نہیں پڑتا... وہاں کام کریں گے... سائبیریا میں برف ہوتی ہے... مجھے برف پر سواری کرنا پسند ہے... اور جب گھنٹی بھی ہو... تم سنتے ہو، گھنٹی بج رہی ہے... یہ گھنٹی کہاں بج رہی ہے؟،، یہاں اب گروشینکا میتیا کرامازوف سے لینن کے پھولدار پردے کے پیچھے مخاطب ہے جو قید باشقت میں بھیجے جانے سے پہلے میتیا کی آخری جائے پناہ ہے۔ غالباً یہ سچ ہے کہ دستوئیفسکی کے دوسرے مناظر اور دوسری عورتوں کی تصویروں کی چمک ''ذلتوں کے مارے لوگ،، کی، اپنی الجھی ہوئی قسمت کے فیصلے کی منتظر نتاشا کی اس تصویر پر پڑ رہی ہے اور اسے کسی گہری ''اپنائیت،، کے مخصوص معنی پہنا رہی ہے لیکن پھر بھی تصویروں کی اس گیلری میں وہ پہلی ہے اور ان دوسری تصویروں کی تخلیق کی تیاری میں، وہ شامل رہی ہے...

ناول میں بہت سے دوسرے ''پرجوش،، اور شاعرانہ مناظر بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن، جیسا کہ پہلے کہا گیا، وہ ہر قاری کے لئے مختلف ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک کرداروں کا تعلق ہے تو اہمیت، طبع‌زادی اور فنکاری کے لحاظ سے وہ کم موضوعی ہیں۔ ان کا تجزیہ زیادہ صحت کے ساتھ کرنا ممکن ہے اور وہ زیادہ راست انداز میں تصنیف کے اہم تصورات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم ان کے تعین میں بھی اہم اختلافات کا امکان موجود ہے۔

ادب میں ایک بےمثال اور نئے کردار کی تخلیق کو دستوئیفسکی ادبی تصنیف کی اہمیت اور اصلیت کی مستقل کسوٹی سمجھتا تھا۔ ''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں اس طرح کا طبع‌زاد اور خاکے کے

لحاظ سے ''سنجیدہ،، کردار پرنس والکوفسکی تھا۔ دستوئیفسکی کے اس ہیرو کی اہم خصوصیت، جسے وہ پہلی بار حقیقت کی رنگا رنگ کہما گہمی سے اپنے ناول کے دھندلے اور نشیب و فراز میں روشن پردے پر لے آیا تھا، تنقید نگار دبرولیوبوف نے ان الفاظ میں بیان کی: ''اس سے ضمیر تو بالکل نکال دیا گیا ہے،،۔ دبرولیوبوف کردار پرنس والکوفسکی کی فنی کمزوری پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں اس کردار میں ''انسانی چہرہ،، موجود نہیں ہے اور یہ محض ''بڑی مگن کے ساتھ، خباثت اور بےحیائی کی خصوصیات جمع کرکے، مکمل بےہودگی کی تصویر کشی ہے،،۔

دستوئیفسکی کی نظر میں کردار پرنس والکوفسکی ایک ایسا مردہ ضمیر ہے جو ناقابل معافی ہے اور جس کا اختتام بھی موجود نہیں ہے کیونکہ نہ صرف سارے روس میں بلکہ سارے یورپ میں اس کی بہت گہری جڑیں موجود ہیں۔ روسی کسان غلامی کے سماج نے کل یورپی بورژوا انفرادیت‌پسندی کے اس بےشرم اور بےلگام چہرے کو محض ایک غیرمعمولی، ایک مخصوص رنگ دے‌دیا ہے۔ پرنس والکوفسکی دعوی کرتا ہے ''میں ہر بات سے اتفاق کر لیتا ہوں جب تک کہ مجھے تسلی رہے۔ دنیا میں سب کچھ مٹ‌مٹا جائے گا مگر ایک ہم ہیں کہ کبھی نہیں مٹ سکتے،،۔ اس طرح والکوفسکی اپنی یگانہ، استثنائی حیثیت پر نہیں بلکہ اپنی مثالی حیثیت پر زور دیتا ہے۔ گویا کہ اس نے اپنی شخصیت کے اشرافی رکھ رکھاؤ کی ناپائیداری اور اپنے نظریے کے وسیع پیمانے پر پھیلنے کے امکان کا احساس کر لیا ہے۔ پرنس والکوفسکی کہتا ہے: ''سب بکواس ہے جو کچھ بکواس نہیں، وہ شخصیت ہے، میں بذات‌خود،، اور جو کوئی اس بات سے اختلاف کرتا ہے وہ ''ابھی انگلی پکڑ کر چل رہا ہے،،۔ انسانیت، نیکی اور لوگوں کے لئے بھلائی کی خواہش کو پرنس وسیع النظر اور نفیس شخصیت کی محض ''ضد،، قرار دیتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں ''انسان کی تمام اعلی اوصاف کی گھتی میں انتہائی شدید قسم کی خودپسندی پڑی ہوتی ہے،، اور ''اخلاق اور کیا ہے، دراصل وہی تسکین،،۔ کردار ادیب پڑھنے‌والوں کو بتاتا ہے ''اسے کوئی لطف محسوس ہوتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ جس طرح میرے سامنے بےحیائی، بےشرمی سے، بدتمیزی سے آخر اس نے اپنی نقاب الٹ دی تھی اس سے پرنس کو خاص طرح کی لذت محسوس

هو رہی تھی،،۔ اس کمینگی کی خصوصیت میں کوئی شک باقی نہ رہنے دینے کے لئے مصنف پرنس کے ''فلسفے،، کو براہ‌راست زندگی میں اس کے عملی رویے سے جوڑتا ہے۔ کردار کے اس نمونے کو دستوئیفسکی ساری عمر تکمیل تک پہنچاتا رہا۔ پرنس والکوفسکی سے ''جرم و سزا،، کا سویدریگائلوف، ''بھوت،، کا ستاوروگن، ''نابالغ،، کا ویرسیلوف اور بالاخر دستوئیفسکی کے آخری ناول کا بوڑھے کارامازوف کے کردار نکلے۔ یہ تمام مختلف کردار ہیں لیکن ان میں ایک نہ ایک چڑ ''ذلتوں کے مارے لوگ،، کے پرنس کے اس کردار سے جا ملتی ہے جس کی تصویرکشی موٹے لیکن واضح خطوط میں کی گئی ہے۔ دستوئیفسکی نے اس کردار میں اس عبوری دور کے لئے مخصوص، پرانی روسی امارت کی ظاہری علامات اور مجرمانہ ہیر پھیر میں رنگی بورژوا کاروباری شخصیت کی اندرونی ماہیت کا امتزاج، باریکیوں کے ساتھ نقش کر دیا ہے۔

''ذلتوں کے مارے لوگ،، کے کرداروں نے پرنس کی طرف ''کشش،، کا معمہ حل کیا ہے۔ ایوان پتروویچ کہتا ہے: ''میرے دماغ پر اس نے اپنے وجود کی وہ پرچھائیں ڈالی تھی جیسے کوئی گند ہو، کوئی بہت بڑا مکڑا ہو جسے بری طرح جی چاہتا ہے کہ بس کچل ڈالو،،۔ لیکن ناول میں خود پرنس سب کو کچلتا ہے۔ دستوئیفسکی نے گردوپیش کی دنیا پر اس قسم کی شخصیت کے مہلک اثر پر اپنی فنکارانہ قوتیں مرکوز کردی تھیں۔ وہ تمام عورتیں اور بچے جن کی زندگی کسی طور پر پرنس کے خشک حساب کتاب اور غلیظ عیاشیوں کے تابع ہو گئی، اس کے حرص کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سیاسی مسائل کو تصنیف میں ابھی چھیڑا ہی نہیں گیا ہے۔

پرنس اور اس کے بیٹے الیوشا کے عجیب و غریب تعلقات میں بھی دستوئیفسکی کی مستقبل کی تصانیف کے خیالات اور مشاہدات کی ابتدائی کونپلیں موجود ہیں۔ لگتا ہے کہ الیوشا کا کردار بھی دستوئیفسکی کی ''سنجیدہ،، اختراعات میں سے ہے۔ الیوشا کے بارے میں نتاشا کے الفاظ ہیں: ''اس میں قوت‌ارادی نام کو نہیں، اور وہ... کچھ ایسا ذہین آدمی نہیں، بچے کی طرح ہے۔ مگر یہی ایک چیز تھی جو مجھے اس میں سب سے پیاری تھی،،۔ اس کردار کی فطرت میں سب کو حیران اور متاثر کرنےوالی کوئی ایسی چیز موجود ہے جو سب سے پہلے، اس کے باپ کی سڑتی ہوئی ''جدلیات،،

کے سامنے کھڑی ہے۔ ''اس میں فریب بالکل نہیں ہے،،— یہ الفاظ کاتیا اس کے بارے میں ایسے کہتی ہے گویا اس کی سب سے اہم خصوصیت بیان کر رہی ہو۔ الیوشا کی سچائی، اس کے مہربان دل اور اس کے بھولپن کے بارے میں ناول کے تمام کردار بولتے ہیں۔ دستوئیفسکی، جس کے لئے یہ اخلاقی اوصاف بڑے اہم ہیں، ہمیشہ قائل کن انداز میں ان کی تصویرکشی نہیں کر پاتا لیکن پڑھنےوالے کے شعور میں وہ انہیں ثبت کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ''بگڑا ہوا لڑکا،، شعوری طور پر اس بات کا قائل ہے کہ ''کتنی ہی برائی کو تو صاف‌گوئی سے دور کیا جا سکتا ہے!،، اور یہ الفاظ لاابالی الیوشا ''ایک زبردست خودداری کے ساتھ،، کہتا ہے۔ زندگی کو اس کی پوری سالمیت کے ساتھ دل سے سمجھنا، صاف‌گوئی جو چال‌چلن کا اصول ہے، اور زبردست اندرونی خودداری— ''ذلتوں کے مارے لوگ،، کے کردار کی ان خصوصیات نے دستوئیفسکی کے بعد کے پرنس میشکن اور الیوشا کرامازوف کے کرداروں تک کا سیدھا راستہ ہموار کیا۔ اس طرح دستوئیفسکی نے خصوصی کرداروں میں وہ اخلاقی خوبیاں مجسم کر دینے کی کوشش کی ہے جو مصنف کے خیال میں انسان کے لئے بنیادی طور پر ضروری ہیں۔ ''میں احمق ہی سہی،، اس طرح الیوشا اپنے باپ سے مخاطب ہے ''... لیکن اگر میں غلطی پر بھی ہوتا ہوں تو خلوص اور سچے دل سے ہوتا ہوں،،۔ دستوئیفسکی ان خوبیوں کی بڑی قدر کرتا تھا اور اسی لئے روس کی ''نئی نسل،، نے سب سے پہلے مصنف کی تلاش کے حیرت انگیز خلوص پر لبیک کہا۔

''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں ایسا ایک کردار بھی ہے جو واضح ''سنجیدہ اہمیت،، کا حامل ہے۔ چھوٹی سی بچی نیلی دستوئیفسکی کی تخلیقات کے مستقل نظریات کا ایک ایسا پہلا مجسم اظہار ہے جس میں معصوم بچوں کے مصائب کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور جو مصنف کی ہم‌عصر تہذیب کی مجرمانہ حیثیت کی کوئی صفائی قبول نہیں کرتا۔ یہ نظریہ چھن کر، تقسیم ہوکر اور زیادہ واضح ہوکر مختلف خاکوں اور مختلف حالات میں منظر عام پر آئےگا۔

غیرمعمولی بچی کے کردار اور اس سے متعلقہ تمام خاکے کی ترتیب‌بندی— ادبی و کتابی اور رومانوی ہے۔ اسلوب بیان سے لے کر، جس میں مصنف صورت حال کی غیرمعمولی نوعیت پر زور

دیتا ہے، بچی کے حسب نسب کے معمے تک، جسے مصنف نے مصنوعی انداز میں لمبا کھینچا ہے، یہ کردار احساس دلاتا ہے کہ وہ نیا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ڈکنس کے تعلق سے کسی پرانے کردار کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن دیوانگی کی حد تک بچی کے شعوری احتجاج کا تناؤ اسے ایک ایسے مخصوص بچپے میں تبدیل کر دیتا ہے جو دستوئیفسکی کی اپنی اختراع ہے۔ یہ ان ''سوچ میں غرق،، بچوں میں سے ایک ہے جو اگر زندہ بچ رہے تو ان میں سے بڑے ہوکر باغی (چاہے وہ اطاعت کا پرچار ہی کرتے رہے) اور مفکر (چاہے وہ عقل پر لعنت ہی بھیجتے رہے) نکلے۔

اس بچی نے اپنی قبل از وقت بدبختیوں کے عوض، عیسائی اخلاقیات اور زندگی کی کھری حقیقتوں کے اس تضاد کا، جو لوگوں سے پیار، رحم اور درگزر جیسے اعلیٰ‌ترین اصولوں اور زندگی میں ان پر عمل درآمد کے عدم امکان میں موجود تھا اور جو دستوئیفسکی کو ساری عمر اذیت پہنچاتا رہا، نہ صرف احساس ہی کر لیا تھا بلکہ اس نے اپنے رویے اور الفاظ میں اس کا بھرپور اظہار بھی کیا۔

نیلی کی سخت‌دلی میں، پیار اور نگہداشت کے خلاف اس کی بغاوت میں، اس سے پیار کرنےوالوں سے تحفہ قبول کرنے کی بجائے بھیک مانگنے کے لئے اس کے تیار رہنے میں، روزمرہ زندگی کی سادہ مثالوں کے ذریعے شر کی شر سے پیدائش کی جدلیات کو دکھایا گیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے، کیا پرخلوص مدد کو اس طرح دھتکار دینا مروت ہے؟ لیکن کیا انتہائی حد کی توہین کی نمائش — بےعزت ہوئے شخص کی ذلیل کرنے، بےعزت کرنے کی جوابی خواہش نہیں؟ تناشا — نیلی — نیلی کی ماں — یہ بےعزت ہوئے لوگوں کی سخت‌دلی کے گہرا ہونے کا تسلسل ہے۔ باہمی توہین کے سلسلے کو توڑ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے کو صرف پیار اور معاف کر دینے کی طاقت سے توڑا جاتا ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی کہا گیا ہے ناول کے خاکے میں یہ کسی حد تک سادگی سے دکھایا گیا ہے۔ لیکن یہاں خیال سادہ ہرگز نہ تھا کیونکہ کبھی تو، کہیں تو ضرور اس لاانتہا سلسلے کو توڑ دینا چاہئے؟ اور اگر اسے وہ لوگ نہیں توڑیں‌گے جو انتہائی ایماندار ہیں اور جن کا ضمیر صاف ہے تو اسے کون توڑے‌گا؟

لیکن ناول میں یہیں کہیں ایسے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور زور

دےکر کہے ہوئے، ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن میں ناقابل مصالحت احتجاج اور بغاوت کے نسخے موجود ہیں۔ ''اس کے پاس جانا اور اس سے کہہ دینا کہ میں مر گئی لیکن میں نے اسے بخشا نہیں،، — یہ الفاظ نیلی مرنے سے پہلے ایوان پترووچ کو پرنس والکوفسکی کے بارے میں کہتی ہے۔ معاف کر دینا چاہئے لیکن منع ہے، خوب ہے لیکن ناممکن ہے، اعلیٰ‌ترین ہے لیکن ناقابل حصول ہے: یہ ہیں خود دستوئیفسکی کے نکالے ہوئے نتائج۔ دستوئیفسکی کا ذاتی تجربہ اور ملک کا تاریخی تجربہ بغاوت اور مصالحت، احتجاج اور اطاعت کے مسائل کی طرف، ان کے تمام الجھاؤ اور تضاد کے ساتھ مصنف کی توجہ مبذول کراتا تھا۔

''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں فی‌الحال صرف ایک سوال سامنے لایا گیا ہے: انتہائی حد کی بدی سے بھرے شخص کے مقابلے میں کسی انسان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ ''تنہا رہنا، غریب رہنا اور محنت مزدوری کر لینا اور اگر مزدوری نہ ملے تو بھیک مانگ لینا، لیکن ان کے پاس نہ جانا،، — اس طرح نیلی کی ماں اپنی موت سے پہلے اسے سمجھاتی ہے۔ ماں کی محبت سے بھری یہ نصیحت یہ بچی خود کئی بار دہراتی ہے: ''ان کے پاس نہ جانا... وہ بڑے سنگ‌دل اور خبیث لوگ ہیں، اور میری نصیحت تمہیں یہ ہے کہ غریب رہنا، محنت مزدوری کرنا، بلکہ بھیک بھی مانگ لینا لیکن اگر تمہیں کوئی بلانے آئے تو کہہ دینا — 'میں تمہارے ساتھ نہیں جاتی!'،،

''ذلتوں کے مارے لوگ،، میں بغاوت نہیں بلکہ رحم کا پرچار کیا گیا ہے لیکن ناول کے کردار ''امیروں اور ظالموں،، کے تصورات کے خلاف روحانی احتجاج کے لئے بنیاد بناتے ہیں، ان تصورات سے نفرت پیدا کرتے ہیں۔

کچھ برس کے بعد ''ذلتوں کے مارے لوگ،، کے پہلے قاری روس اور پیٹرسبرگ کے کئی واقعات میں ہیروؤں، شاہدوں اور ان لوگوں کی شکل میں سامنے آئے جنہوں نے ان واقعات میں حصہ لیا، ان کی بھینٹ چڑھ گئے اور جن کی زندگی ان واقعات پر محیط تھی۔ لگتا ہے کہ اس ناول کے چند پرجوش مقامات نے، شعریت بھرے کچھ اوراق نے، اس کے دو تین کرداروں نے روس کی ان نوجوان نسلوں کے اخلاقی خدوخال ترتیب دینے میں ضرور اپنا رول ادا کیا

ہوگا جن کا خاصہ مردانہ ایثار، مادی آسائش کے سامنے غیرمتزلزل اخلاق اور بےداغ ضمیر تھا۔

بعد میں یہ ناول ایک سو بیس سال کے دوران بار بار چھپتا رہا اور پڑھا جاتا رہا۔ ظاہر ہے، ہر زمانے میں اسے کسی مختلف، کسی نئے تاثر کے ساتھ پڑھا گیا۔ کبھی وہ انسانی دلوں کے بہت قریب ہوجاتا تھا اور کبھی ان سے دور ہوتے ہوتے اجنبی ہو جاتا تھا۔

لیکن آج وہ پھر اس سچی بےقراری کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جس میں بہت عرصہ پہلے کے معاملات اور روزمرہ زندگی کے واقعات کے لئے دلچسپی پائی جاتی ہے۔ قاری اس وقت کی مکاری اور خباثت کی سادہ‌لوح صاف‌گوئی پر اور چاہے ایک بڑے فنکار کے لئے ہی سہی کمزور ادبی خاکوں کی اجازت پر حیران ہوتا ہے۔ لیکن پھر یہ حیرت چند "پرجوش مناظر" میں بےساختہ جمالیاتی لطف، انسانی دکھوں کے لئے دل سوزی اور انوکھے تصورات کی ابدی اہمیت معلوم کر لینے کی خوشی سے مل جاتی ہے۔

ایکاتیرینا ستاریکووا

پہلا حصّہ

پہلا باب

پچھلے سال ۲۲ مارچ کی شام کو مجھے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اس روز سارے دن شہر کی خاک چھانتا پھرا کہ کہیں رہنے کا ٹھکانا حاصل کروں۔ جہاں میں رہتا تھا وہاں سیلن بہت تھی۔ وہیں سے مجھے کالی کھانسی لگ گئی تھی۔ خزاں کی شروعات ہوتے ہوتے میں نے سوچ لیا تھا کہ یہاں سے اٹھ جانا چاہئے لیکن ٹلتے ٹلاتے ہلاتے بہار کے دن آ پہنچے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی کوئی اچھا سا مکان اب تک نظر میں نہیں جما۔ اول تو میں یہ چاہتا تھا کہ مکان الگ تھلگ ہو۔ ایسا نہیں کہ دوسرے لوگ بھی اسی میں رہتے ہیں اور وہیں میرا بھی ایک کمرہ ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اگر ایک ہی کمرے میں بسر کرنا ہے تو وہ کمرہ خوب کشادہ اور بڑا سا ہونا چاہئے اور کم سے کم کرائے کا۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ گھٹے ہوئے مکان میں خیالات بھی آتے ہیں تو گھٹے گھٹے۔ اور میرا یہ ہے کہ کہانیاں سوچتے وقت میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنا چاہتا ہوں۔ یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ کہانی لکھنے کے مقابلے میں مجھے یہ بات کہیں زیادہ پسند ہے کہ جو کچھ لکھنا ہے اسے پہلے اچھی طرح چشم تصور سے دیکھ لوں کہ جب کہانی لکھی جا چکےگی تو اس کی صورت شکل کیا ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ ایسا میں کوئی سستی کاہلی کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ... پتہ نہیں کیوں؟

سارے دن میری طبیعت اکھڑی اکھڑی رہی۔ شام ہوتے وقت تو حال یہ تھا کہ میں خود کو بہت بیمار محسوس کرنے لگا جیسے بخار چڑھنے‌والا ہو مجھے۔ پھر یہ بھی کہ دن بھر پیدل چلتا رہا تھا اور اب تھک کر چور ہو چکا تھا۔ سورج ڈوبتے وقت جب ہر طرف اندھیرا ہونے‌والا تھا، میں ووزنےسینسکی پراسپکٹ پر چلاجارہا

تھا۔ پیٹرسبرگ شہر* میں مارچ کی دھوپ مجھے پیاری لگتی ہے۔ خاص طور سے جب شام ہوتے موسم صاف ہوتا ہے اور ہوا میں ٹھہر ہوتی ہے تو بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ ساری سڑک ایک دم جگمگا اٹھتی ہے جیسے تیز روشنی میں نہائی ہوئی ہو۔ تمام گھروں میں ایک دم سے چمک سی پیدا ہو جاتی ہے۔ گھروں پر جو مٹیالا، پیلا اور کائی کے رنگ کا منظر ہوتا ہے، اس کی ساری اداسی تھوڑی سی دیر کے لئے اتر جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ روشن اور شفاف ہو گیا ہے، آپ اس طرح چونک پڑتے ہیں جیسے کسی نے آپ کو کہنی سے ٹہوکا دے دیا ہو۔ نئی نظر پیدا ہوتی ہے، خیالوں کا نیا سلسلہ ابھرتا ہے۔ بڑی حیرت ہوتی ہے کہ سورج کی ایک کرن آدمی کی روح کے لئے کیا کچھ کر سکتی ہے!

سورج کی کرن اب ڈوب چکی تھی، ہوا میں ٹھہر بڑھتی جا رہی تھی اور اس نے میری ناک کو مسوسنا شروع کر دیا۔ دھندلکا گہرا ہو گیا۔ دکانوں کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ جب میں مٹھائی فروش ملر کی دکان کے پاس پہنچا تو اچانک میرے قدم وہیں گڑ گئے، اور سڑک کے اس پار میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ گویا مجھ پر یہ وہم طاری ہو گیا کہ ہو نہ ہو، کوئی غیر معمولی واقعہ مجھے پیش آنے والا ہے۔ اور ٹھیک اسی لمحے مجھے سڑک کے اس پار ایک شخص نظر آیا، بوڑھا آدمی اپنے کتے کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ناگوار سنسنی سی مجھے اپنے دل میں محسوس ہوئی۔ خود میں طے نہیں کر سکا کہ یہ کس طرح کی سنسنی ہے۔

میں کوئی صوفی آدمی نہیں ہوں۔ پیش اندیشگی اور الہام کا بھی قریب قریب قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود، غالباً اور لوگوں کی طرح مجھے بھی زندگی کے کئی ایسے تجربے ہوئے ہیں جن کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اب مثال کے طور پر اسی بوڑھے کو لے لیجئے۔ بھلا ایسا کیوں ہوا کہ عین اس لمحے جب اس پر میری نظر پڑی، فوراً یہ خیال دل میں آیا کہ آج شام کو مجھے کوئی نہ کوئی غیرمعمولی واقعہ پیش آئے گا؟ ہاں، یہ ہے کہ

---

*پیٹرسبرگ (موجودہ لینن گراد) — ۱۷۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک روس کا دارالحکومت۔ (ایڈیٹر)

اس وقت میں بیمار تھا اور جب آدمی بیمار ہو تو اس وقت کے وہم و تصور قریب قریب ہمیشہ ہی کچے ہوتے ہیں۔

بڑے میاں فٹ پاتھ پر لکڑی ٹیکتے مٹھائی فروش کی دکان کے پاس پہنچے۔ وہ اس قدر دھیرے دھیرے، کمزور قدموں سے چل رہے تھے اور زمین پر ٹانگیں ایسی اکڑی اکڑی رکھ رہے تھے، جیسے ٹانگیں نہیں ڈنڈے ہیں۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی ایسا عجیب، اس درجہ بےڈھنگی شکل صورت کا آدمی نہیں دیکھا اور پہلے بھی جب کبھی ملر مٹھائی والے کی دکان پر اس سے میری ملاقات ہوئی ہمیشہ ایک تکلیف دہ اثر میرے دل و دماغ پر پڑا۔ دراز قد، جھکی کمر، مردنی چھایا چہرہ جس پر ۸۰ برس کی چھاپ لگی ہوئی۔ پرانا اوورکوٹ سیونوں پر سے نکلا ہوا۔ ۲۰ برس کا پرانا مڑا تڑا گول ہیٹ جو سر پر مڑھا رہتا تھا اور گنجے سر کو جس پر بالوں کی صرف ایک لٹ، اور وہ بھی سفید نہیں بلکہ مٹیالے سے رنگ کی سفید لٹ رہ گئی تھی، اسے ڈھکے ہوئے تھا۔ پھر اس وضع قطع پر بڑے میاں کا ہلنا جلنا، جو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ارادے سے نہیں، بلکہ بےاختیار سرزد ہوتا ہے جیسے اسپرنگ لگے ہوں — یہ سب چیزیں مل ملا کر ایسی تھیں کہ ممکن نہ تھا جو کوئی شخص ان سے پہلی بار ملے اور یہ سب اسے کھٹکے نہیں۔ واقعی، اس بوڑھے سے ملنا ایک عجیب سی بات تھی، جو عمر طبعی سے زیادہ جی رہا تھا، بالکل یکہ و تنہا، بےیار و مددگار، جس کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا تک نہ تھا۔ علاوہ بریں ایسا دیوانہ معلوم ہوتا تھا جو اپنے نگہبانوں سے بچ کر نکل بھاگا ہو۔ ایک اور چیز جو مجھے عجیب لگتی تھی وہ تھا اس کا غیر معمولی سوکھاپن — بدن پر گوشت کا نام نہیں۔ دیکھنے سے لگتا تھا کہ ہڈیوں پر بس چمڑی منڈھ دی گئی ہے۔ اس کی بڑی مگر بجھی بجھی آنکھیں جو نیلے حلقوں میں گویا جڑی ہوئی تھیں، ہمیشہ سامنے گڑی رہتی تھیں، اپنی جگہ سے ہلتی جلتی نہ تھیں اور نہ کچھ دیکھتی تھیں — مجھے اس کا پکا یقین ہے۔ ایسے ہی جب وہ آپ کو دیکھتا تھا تو بس بالکل ناک کی سیدھ میں آپ کی طرف بڑھتا تھا جیسے سامنے کی سب جگہ خالی پڑی ہو۔ کئی بار یہ بات میں دیکھ چکا تھا۔ ملر مٹھائی والے کی دکان پر آنا جانا شروع کئے اس کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ کتا ہمیشہ اس کی دم کے ساتھ لگا ہوتا تھا۔ کسی کو

بھی پتہ نہ تھا کہ یہ شخص آتا کہاں سے ہے۔ نہ تو ملر کے
گاھکوں میں سے کسی نے کبھی اس سے بات‌چیت کرنے کی جرأت
کی اور نہ اس نے ان میں سے کسی کو مخاطب کیا۔

”آخر یہ شخص خود کو یہاں اس دکان تک گھسیٹتا کیوں
ہے۔ اس کا یہاں کیا کام؟“ سڑک کے اس پار کھڑے کھڑے
میں نے جی میں سوچا۔ ابھی تک میری نظر اس شخص پر سے ہٹ
نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کیسی جھنجھلاہٹ اور چڑ سی ہوئی جو
اس وقت غالباً بیماری اور تھکن کا نتیجہ ہوگی۔ اور پھر میں اس
تعجب میں پڑا رہا ”یہ شخص آخر کیا سوچ رہا ہوگا؟ اس کے
دماغ میں کیسے کیسے خیال آتے ہوں گے؟ کیا اب بھی یہ اس قابل
رہ گیا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں سوچ سکے؟ اس کے چہرے
پر ایسی مردنی چھائی ہوئی ہے کہ کوئی کیفیت اس پر جھلکتی
ہی نہیں۔ اس نے یہ کتا، یہ بےہودہ سا کتا کہاں سے پکڑ لیا جو
کبھی اس کی دم سے جدا نہیں ہوتا، جیسے اس کتے سے مل کر
اس کا پورا وجود تیار ہوا ہے اور اسے جدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔
کتا بھی بالکل مالک کی طرح کا ہے۔“

یہ کم‌بخت کتا بھی کوئی ۸۰ برس کا ہوگا۔ ہاں، یقینی اس
سے کیا کم ہوگا۔ اول تو یہی کہ کتا دیکھنے میں دوسرے تمام
کتوں سے کہیں زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ جب پہلی بار میں
نے اس کتے کو دیکھا تو نہ جانے کیوں خیال یہی آیا کہ ہو نہ
ہو، یہ کتا دوسرے کتوں جیسا نہیں ہو سکتا — سب سے نرالا ہے۔
اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات عجیب اور افسانوی ضرور ہے،
کوئی بڑی پراسرار بات۔ ہو سکتا ہے کہ اس کتے کے بھیس میں
کوئی خبیث روح ہو، اس کی قسمت کسی خاص پراسرار اور انجانے
بندھن میں اپنے مالک کی قسمت سے وابستہ لگتی ہے۔ اگر آپ
کتے کو دیکھتے تو آپ بھی اس رائے سے اتفاق کرتے کہ اس
غریب نے پچھلی بار جب کھانا کھایا تھا اس کو ۲۰ برس تو
گزر ہی چکے ہیں۔ کتا کیا تھا — بالکل ڈھانچہ تھا، بلکہ اس بات
کو یوں کہنا بہتر ہوگا کہ قطعی اپنے مالک سے مشابہ تھا۔ اس
کے جسم کے قریب قریب سارے ہی بال جھڑ چکے تھے اور بےبال
دم ٹانگوں کے بیچ میں ایسی لٹکی ہوئی تھی جیسے دم نہیں کوئی
ڈنڈی ہے۔ اس کے لمبے لمبے کانوں والا سر آگے کی طرف بھدے

طریقے سے لٹکا ہوا تھا۔ میں نے ساری عمر میں ایک بھی ایسا
گھناؤنا کتا نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دونوں سڑک پر اس طرح
چلتے کہ آگے آگے مالک، پیچھے پیچھے کتا، تو کتے کی ناک مالک
کے کوٹ کے دامن سے ایسے لگی رہتی جیسے گوند سے چپکا دی
گئی ہو۔ ان دونوں کی چال اور ان کا حلیہ گویا ہر ہر قدم
پر پکارتا تھا:

نہیں ہے ضعیفی سے اب کوئی چارہ
بوڑھاپے نے گھیرا ہے پروردگارا

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار سوچتے سوچتے مجھے خیال
آیا کہ بڑے میاں اور ان کا کتا دونوں ہوفمین * کی قصہ کہانیوں‌والی
باتصویر کتاب سے نکل پڑے ہیں اور ہماری دنیا میں اس کتاب کے
چلتے پھرتے اشتہار کی طرح ٹہلتے پھر رہے ہیں۔ میں نے سڑک
پار کی اور ملر کی دکان میں بڑے میاں کے پیچھے پیچھے لگ لیا۔

دکان کے اندر پہنچ کر بڑے میاں کی حرکتیں نہایت عجیب
ہوتی تھیں۔ اور ملر کا ادھر چند دنوں سے یہ معمول ہو گیا
تھا کہ وہ اس ناخواندہ مہمان کو داخل ہوتے دیکھ کر برا سا
منہ بناتا۔ اول تو یہی کہ یہ انوکھا آنےوالا کبھی کسی چیز
کا آرڈر نہ دیتا تھا۔ ہر دفعہ سیدھا آتش‌دان کے پاس کونے میں
چلا جاتا اور وہاں کسی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اگر آتش‌دان کے
پاس کرسی پہلے سے گھری ہوتی تو اس کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی
کے سامنے ہکا بکا کھڑا تکتا رہتا اور پھر وہاں سے مڑ کر، ایسا
جیسے کسی فکر میں الجھا ہو، کھڑکی کے پاس دوسرے کونے کی
طرف بڑھ جاتا۔ وہاں کوئی کرسی چن کر آہستہ آہستہ اس پر
بیٹھ جاتا، اپنا ہیٹ اتارتا، اسے پہلو میں زمین پر رکھ دیتا اور
ہیٹ کے برابر اپنی چھڑی ٹکا دیتا۔ اس کے بعد کرسی سے پیٹھ
لگا کر پھیل جاتا اور تین چار گھنٹے اسی طرح بےحس و حرکت بیٹھا

---

* ہوفمین، ایرنسٹ ٹیوڈر اماڈئی (۱۷۷۶ء تا ۱۸۸۲ء) — جرمن
رومانی انشاپرداز جس کی تصانیف انوکھے تخیلات کی وجہ سے مشہور
ہوئیں۔ (ایڈیٹر)

رہتا۔ نہ تو وہ کبھی کوئی اخبار اٹھاتا، نہ منہ سے ایک حرف نکالتا، نہ کسی قسم کی آواز اس کے حلق سے نکلتی۔ بس بیٹھا ہے اور ناک کی سیدھ میں کھلے ہوئے دیدوں سے اس طرح خالی خالی اور بےجان نظروں سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے کہ ہر دیکھنے والا یہی قیاس کرے کہ اس آدمی کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اسے نہ وہ دیکھ رہا ہے، نہ سن رہا ہے۔ کتا بھی اسی جگہ دو تین چکر کاٹنے کے بعد مالک کے جوتوں میں ناک ڈال کر اداس سا پڑ جاتا، لمبا سا سانس کھینچتا اور فرش پر دراز ہو جاتا۔ ساری شام یہ بھی یوں ہی پڑے پڑے گزار دیتا تھا، جیسے فی الحال دنیا سے سدھار گیا۔ دیکھنے والے کو گمان ہو سکتا تھا کہ یہ دو وجود سارے دن کہیں مرے پڑے رہتے ہیں اور جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو ایک دم سے ان میں جان پڑ جاتی ہے تاکہ اٹھیں اور اٹھ کر ملر مٹھائی والے کی دکان تک ٹہلتے ہوئے پہنچیں اور وہاں کوئی بڑا پراسرار خفیہ فرض ادا کر دیں۔ اس طرح تین چار گھنٹے بیٹھنے کے بعد بڑے میاں بالآخر اٹھ کھڑے ہوتے، اپنا ہیٹ اٹھاتے اور جہاں بھی ان کا گھر تھا، اس طرف روانہ ہو جاتے۔ کتا بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ بھی جھکی ہوئی دم اور لٹکتا ہوا سر لئے دھیرے دھیرے مالک کے پیچھے بےاختیار لگ لیتا۔ دکان میں جب تک بڑے میاں بیٹھے رہتے، دکان پر آنے والے گاہک ان سے کنی کتراتے، اور تو اور، کوئی ان کے پہلو میں بیٹھنے تک کا روادار نہ ہوتا، جیسے بڑے میاں کو دیکھ کر گھن آتی ہو۔ خود بڑے میاں کی اس بات پر نظر تک نہ پڑتی۔

اس دکان کے اکثر گاہک جرمن تھے۔ یہ لوگ اسی سڑک ووزنیسنسکی پراسپکٹ کے ہر طرف سے یہاں جمع ہوتے تھے۔ ان میں بیشتر خود کسی نہ کسی کاروبار کے مالک تھے یعنی ان میں فٹر، مستری، بیکری والے، رنگریز، ہیٹ اور زین ساز — غرض ٹھیک جرمن معنوں میں ہر قسم کے خاندانی لوگ۔ خود یہ دکان، ملر مٹھائی والے کا کاروبار بھی خاندانی طرز پر چلایا جاتا تھا۔ دکان کا مالک بھی اکثر اپنے گاہکوں کی میز پر آ بیٹھتا اور ان کے ساتھ کافی پونش (شراب) پی لیا کرتا تھا۔ اس گھرانے کے کتے اور بال بچے بھی نکل کر گاہکوں کے پاس آ پہنچتے تھے اور گاہک بھی کتوں اور بچوں کو پیار سے تھپکنے لگتے تھے۔ ان سب کی

ایک دوسرے سے جان پہچان تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ جب مہمان جرمن اخباروں کی ورق گردانی میں مصروف ہوتے تو دکاندار کے اندرونی مکان کے دروازے سے جرمن گانے ''اگسٹین،،* کی دھن ایک بوسیدہ پیانو پر بجتی سنائی دیتی۔ یہ دھن مالک دکان کی سب سے بڑی بیٹی بجایا کرتی تھی، جس کی سنہری گھنگھریالی زلفیں تھیں اور ایسی لگتی تھی جیسے سفید ولایتی چوہیا۔ والز کی اس دھن کو عام طور پر لوگ پسند کرتے تھے۔ میں خود وہاں ہر مہینے کی پہلی تاریخوں میں جایا کرتا تھا تاکہ روسی رسالے جو وہاں آتے تھے پڑھ سکوں۔

جب میں اندر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے میاں حسب معمول کھڑکی کے پاس ڈٹے ہوئے ہیں اور کتا بھی حسب دستور ان کے قدموں میں پھیلا پڑا ہے۔ میں چپکا ایک طرف بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں سوال کرنے لگا کہ بھلا، یہاں جب کوئی میرا کام نہیں ہے تو آیا کیوں؟ پھر وہ بھی ایسے وقت جب کہ میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے جلدی سے گھر پہنچنا چاہئے اور چائے پی پلا کر بستر پر دراز ہو جانا چاہئے! میں کیا صرف اس لئے آیا ہوں کہ بڑے میاں کو گھورے جاؤں؟ مجھے الجھن ہونے لگی۔ ''بھلا مجھے ان سے کیا لینا دینا،، اور اس نامانوس عجیب سے دردناک جذبے کا خیال آنے لگا جو بڑے میاں کو سڑک پر دیکھ کر مجھ میں پیدا ہوا تھا ''اور ان سب بےکیف جرمنوں سے بھی مجھے کیا واسطہ؟ یہ کیسا نرالا موڈ ہے — بے سر و پا؟ یہ کیا حرکت ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجھلاہٹ۔ یہ عیب ادھر کچھ دنوں سے مجھے اپنے اندر نظر آنے لگا تھا اور اس نئی کیفیت نے خود جینے میں اور جیون کی صاف تصویر نظر کے سامنے رکھنے میں خلل ڈال رکھا تھا۔ ایک بڑے صاحب نظر تبصرہ نگار نے میرے پچھلے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس عیب پر نہایت کڑی نکتہ‌چینی کی تھی اور بہت جھاڑ بتائی تھی۔،، میں نے اگرچہ اس سے ذہن کو پاک کرنے کی اور اسے جھٹک دینے کی کوشش کی تاہم کیا حاصل،

---

* یہ عام قسم کا گانا تھا جو اس زمانے کے جرمن سفیدپوشوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کے پہلے بول ہیں: «Mein lieber Augustin» (اگسٹین، میری جان)۔ (ایڈیٹر)

میں اب بھی وہاں کا وہیں رہا اور اس دوران میری طبیعت اور زیادہ بگڑنے لگی اور آخر یہ ہوا کہ اس گرم آرام‌دہ کمرے سے نکل جانے میں ہچکچاہٹ ہونے لگی۔ میں نے فرینک‌فرٹ شہر سے شائع ہونے والا ایک اخبار اٹھایا، اس کی ایک دو سطروں پر نظر دوڑائی اور اپنی جگہ اونگھ گیا۔ مجھے یہاں بیٹھے جرمنوں کی ذرا پروا نہ ہوئی۔ وہ لوگ اخبار پڑھتے، سگرٹیں پھونکتے اور بیچ بیچ میں گھنٹے آدھ گھنٹے کے وقفے سے فرینک‌فرٹ کے اخبار کا کوئی ادھر ادھر کا ٹکڑا یا اس جرمن بذلہ‌سنج کا کوئی مذاق یا چٹکلا دھیمی آواز میں سنا دیتے جو ''سافر،،* کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد وہ پھر دگنے قومی غرور کے ساتھ اخبار پڑھنے میں لگ جاتے۔

میں کوئی آدھ گھنٹے غنودگی کے عالم میں رہا لیکن ایک سخت جھرجھری آئی اور اس نے میری نیند توڑ دی۔ یقینی طور پر اب گھر چل دینا لازمی تھا۔ مگر اسی لمحے ایک بےآواز سین نے جو اس کمرے میں پیش آیا مجھے اٹھنے سے روک دیا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جیسے ہی بڑے میاں کرسی پر جمتے تھے وہ اپنی آنکھیں بھی سامنے کسی شے پر جما دیتے تھے اور جب تک بیٹھے رہتے وہاں سے نظر ہٹاتے نہیں تھے۔ کئی بار میرے ساتھ بھی یہی صورت پیش آچکی تھی۔ میں بھی اس بےسبب، اٹل اور اندھی ٹکٹکی کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس کی زد میں آکر ایسی ناگوار بلکہ ناقابل برداشت کیفیت محسوس ہوتی تھی کہ میں تو عام طور سے جب بھی موقع ملتا اپنی نشست وہاں سے بدل دیتا اور دوسری کرسی پر جا بیٹھتا۔ آج کی شام ایک چھوٹا سا گول‌مٹول، نہایت صاف ستھرا جرمن ان نگاہوں کی زد میں تھا۔ اس جرمن کے کالر خوب کلف لگے اور اکڑے ہوئے تھے اور چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ تھا۔ یہ شخص دکان میں حال میں ہی وارد ہوا تھا۔ وہ خود ریگا شہر کا دکاندار تھا اور نام تھا اس کا آدم ایوانچ شولتس۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ آدم ایوانچ اس دکان کے مالک ملر کا بہت بےتکلف دوست تھا۔ لیکن ابھی تک ان بڑے میاں سے یا دکان میں آنے‌والے دوسرے اکثر گاھکوں سے واقف نہ تھا۔ مزے سے شراب

---

* سافر، موریتس گوٹلیب (۱۷۹۵ء تا ۱۸۵۸ء) — جرمن ادیب، مزاحیہ‌نگار۔ (ایڈیٹر)

کی چسکیاں لیتے ہوئے اور «Dorfbarbier» * پڑھتے ہوئے اس نے جو ایک دم نگاہ اٹھائی تو دیکھتا کیا ہے کہ بڑے میاں اس پر نگاہیں گاڑے ہوئے ہیں۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ وہ بھی سارے ''جرمن شرفا،، کی طرح بہت زود رنج اور حساس تھا۔ یہ بات اسے عجیب اور توہین‌آمیز لگی کہ اسے یوں غیر مہذب طریقے سے گھورا جائے۔ اپنے غصے کو ضبط کرکے اس نے بدتہذیب مہمان کی طرف سے منہ پھیر لیا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور اخبار کو چہرے کے سامنے سپر کر لیا۔ لیکن ایک دو منٹ بعد اسے بےچینی ہوئی اور شک‌وشبہ کے ساتھ وہ اخبار کے پیچھے سے پھر جھانکا۔ اب تک وہی مستقل گھورنے والی آنکھیں، وہی بےمعنی ٹکٹکی اس پر لگی تھی۔ آدم ایوانچ اب کے بھی کچھ نہ بولا۔ لیکن جب تیسری بار بھی اسے یہی منظر دکھائی دیا تو وہ ابل پڑا اور اس نے فرض سمجھا کہ خود اپنے وقار کا پاس کرے اور ایک ایسے معقول مجمع کی نظر میں ریگا جیسے عالی‌شان شہر کی توہین نہ ہونے دے۔ بظاہر اس وقت بزعم خود وہی ریگا شہر کے وقار کا محافظ تھا۔ برھمی کے انداز میں اس نے اخبار کو میز پر پٹک دیا اور زور سے اس ڈنڈی کو ٹھونکا جس میں اخبار لگا ہوا تھا۔ اپنی آن‌بان میں کھول کر، شراب کے نشے میں سرخ ہوکر اور غصے اور توہین میں تپ کر اس شخص نے اپنی چھوٹی چھوٹی سرخ اور سوجی آنکھوں کو اس دق کرنے والے بوڑھے پر جما دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں، یعنی وہ جرمن اور اس کا مقابل بوڑھا ایک دوسرے کو شدید نگاہ کی مقناطیسی قوت سے زیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دونوں منتظر ہیں کہ دیکھیں کون زیر ہوتا ہے اور آنکھیں جھپکا لیتا ہے۔ اخبار والے ڈنڈی کو جس جھٹکے سے پٹکا گیا تھا اس نے، اور آدم ایوانچ کی سنکی حرکتوں نے سارے گاھکوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ سب نے اپنا اپنا کام دھندا ایک طرف رکھ دیا اور گمبھیر اور خاموش حیرت کے ساتھ ان دونوں حریفوں کو تکنے لگے۔ منظر نہایت مضحکہ‌خیز ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے لال بھبھوکا جنٹلمین کی آنکھوں کی مقناطیسیت بالکل ضایع گئی۔ بڑے میاں ٹس سے مس ہوئے بغیر غصے سے ابلتے ہوئے اس شخص کو

---

* «Dorfbarbier» — اس زمانے کا ایک جرمن اخبار۔ (ایڈیٹر)

جوں کا توں گھورتے رہے اور ان کو ذرا بھی اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ عام حیرت و استعجاب کا مرکز بنے ہوئے ہیں — وہ ایسے بےپروا گھورتے رہے جیسے ان کے خیالات زمین پر نہیں بلکہ چاند کی دنیا میں چکر کاٹ رہے ہوں۔ آخرکار آدم ایوانچ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور وہ پھٹ پڑا:

"تم کون ہوتے ہو اس طرح مجھے گھورنے والے؟" وہ جرمن زبان میں نہایت تیز اور زنانے کی آواز سے گرج کر بولا۔

لیکن حریف اس طرح چپ بیٹھا رہا جیسے اس نے اس سوال کو سمجھا تو کیا سنا تک نہیں۔ آدم ایوانچ نے طے کیا کہ روسی زبان میں مخاطب کرے۔

"سنئے ہم تم سے پوچھتا کہ تم ایسا ہم کو کائے کو ٹکٹکی باندھ کے گھورتا؟" وہ دگنے غصے سے چلایا۔ "ہم کو دربار میں سب جانتا۔ تم کو ایک دم کوئی نائی جانتا" اس نے دوسرا جملہ کہا اور کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

بڑے میاں اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جرمنوں میں اس پر فوں فاں ہونے لگی۔ خود مالک دکان ملر اس شور کی طرف متوجہ ہوا اور اس کمرے میں آگیا۔ جب اسے سارے قصے کا پتہ چلا تو وہ سمجھا کہ بڑے میاں بہرے ہیں۔ وہ ان کے کان کے پاس منہ لے گیا اور پوری قوت سے چلا کر بولا:

"شولتس صاحب آپ سے بولتے ہیں کہ آپ انہیں اس طرح سے گور گور کر نہ دیکھو" وہ پورا زور لگا کر چلایا اور اس عجیب بڈھے کا منہ دیکھنے لگا۔

بڑے میاں نے بےاختیار ملر کی طرف دیکھا اور اچانک ان کا وہی چہرہ جس پر اب تک کسی قسم کا کوئی تاثر پیدا نہ ہوا تھا، اس پر کسی وحشت ناک خیال، کسی بےچین ہلچل کے آثار نمودار ہوئے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ ہانپتے کانپتے جھکے کہ ہیٹ اٹھا لیں، جلدی جلدی انہوں نے ہیٹ اور چھڑی سنبھالی اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے — ایک رحم طلب عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ، جو اس بھکمنگے کے چہرے پر پھیل جاتی ہے جسے غلط جگہ بیٹھ جانے کی وجہ سے اٹھا دیا گیا ہو، وہ کمرے سے نکلنے کو کھڑے ہوگئے۔ بےچارے بوڑھے کی اس بےزبانی اور اطاعت شعار پھرتی میں کچھ ایسی دردبھری کیفیت تھی کہ اس پر

ضرور ترس آ جاتا، دیکھنے والا دل مسوس کر رہ جاتا۔ وہاں کے تمام لوگوں کا رویہ، جن میں خود آدم ایوانچ بھی شامل تھا، فوراً بدل گیا۔ یہ بات کھل گئی تھی کہ بڑے میاں کسی شخص کی توہین کرنا تو درکنار، اس بات کا ہر وقت احساس رکھتے تھے کہ ان کو کہیں سے بھی بھکمنگے کی طرح نکال باہر کیا جا سکتا ہے۔

ملر ایک نرم دل اور دیالو آدمی تھا۔

"نہیں، نہیں" اس نے بڑے میاں کی ہمت افزائی کے لئے ان کے شانوں پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹھئے۔ دیکھئے نا — وہ مسٹر شولتس تو صرف یہ کہہ رہے تھے کہ انہیں گھورو نہیں۔ سرکار دربار میں نام آبرو والے آدمی ہوئے نا وہ۔"

لیکن بےچارہ شاید اس کو بھی سمجھ نہ سکا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ بوکھلا گیا اور اپنا رومال فرش سے اٹھانے جھکا، رومال کیا تھا نیلے رنگ کا ایک چیتھڑا تھا جو اس کے ہیٹ سے نکل کر زمین پر گر گیا تھا۔ اس نے اپنے کتے کو آواز دینی شروع کی جو ابھی تک فرش پر بےحس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کتا تھوتھنی پنجوں پر ڈالے گہری نیند سو رہا ہے۔

"ازورکا، ازورکا!" بوڑھے نے اپنی کانپتی ہوئی سن رسیدہ آواز سے دھیرے دھیرے پکارا۔ ازورکا ذرا بھی نہ ہلا۔

"ازورکا، ازورکا!" بڑے میاں نے دکھی ہوکر چمکارا اور اپنی چھڑی اس کو بھونکی لیکن کتا اس پر بھی نہیں ہلا۔

چھڑی بوڑھے کے ہاتھ سے گر گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا، اکڑوں ہوا اور ازورکا کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا۔ بےچارہ ازورکا! وہ مرا پڑا تھا۔ ازورکا چپ چاپ اپنے مالک کے قدموں میں مر گیا، بڑھاپے سے مرا ہوگا یا شاید بھوک کے مارے دنیا سے سدھار گیا ہوگا۔ بوڑھے نے اس مردہ کتے کو دم بھر ایسے دیکھا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو، جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ ازورکا واقعی مر گیا۔ پھر وہ آہستہ سے پرانے خدمت گزار اور دوست کے پاس دوزانو ہو گیا اور اپنے زرد گال کتے کے مردہ تھوتھن سے ملا دئے۔ دم بھر خاموشی چھائی رہی۔ ہم سب متاثر ہو گئے۔ آخر بےچارہ بوڑھا اٹھا۔ اس کا چہرہ قطعی پیلا پڑ گیا تھا اور وہ خود بےکلی سے کانپ رہا تھا۔

"اسے بھوسا بھروا کر رکھا جا سکتا ہے" رحم دل ملر نے کہنا

شروع کیا، اسے فکر تھی کہ بوڑھے کو کسی طرح دلاسا دیا جائے۔ ''آپ چاہیں تو اسے اچھی طرح بھوسا بھروا کر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ فیودر کارلووچ کری گر یہ کام بہت اچھا کرتے ہیں۔ بھوسا بھرنے میں فیودر کارلووچ کری گر کو بڑی مہارت حاصل ہے،، ملر نے بوڑھے کی چھڑی زمین سے اٹھا کر پکڑاتے ہوئے یہ بات پھر دھرائی۔

''ہاں، ہاں، میں بہت اچھی طرح یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں،، خود جناب کری گر نے آگے بڑھتے ہوئے بہت خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ لمبے قد اور اکھرے بدن کا شریف جرمن تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے اور سرخ تھے اور نوکیلی ناک پر عینک چڑھی ہوئی تھی۔

''فیودر کارلووچ کری گر ہر قسم کی عمدہ بھرائی کے نہایت ماہر کاری گر ہیں،، ملر نے اپنے خیال پر خوش ہو کر اس جملے کا اضافہ کیا۔

''جی ہاں، میں ہر قسم کی اعلیٰ درجے کی بھرائی کر سکتا ہوں،، جناب کری گر نے ملر کے خیال کی تصدیق کر دی۔ ''اور میں آپ کے کتے کا یہ کام تو مفت میں کر دوں گا،، کری گر نے بے غرض خدمت کے ذریعے اپنی بڑائی جتانے کی کوشش کرتے ہوئے اتنا اور کہہ دیا۔

''نہیں ایسا نہیں۔ ہم تم کو بھوسا بھرائی کے روپیہ دے دے گا!،، آدم ایوانیچ شولتس نے قریب قریب چیختے ہوئے کہا۔ وہ دگنا سرخ ہو گیا۔ اب جوش میں آکر فیاضی کا مظاہرہ کرنے کی اس کی باری تھی۔ اپنی سادہ‌دلی سے وہ سمجھ رہا تھا کہ اس سانحے کی ذمہ‌داری اسی پر ہے۔

بوڑھا خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آ رہا ہو، اس کا سارا بدن پہلے کی طرح اب بھی تھرتھرا رہا تھا۔

''صابور کرو! فسٹ کلاس برانڈی کا ایک جام پیتے جاؤ!،، ملر نے زور سے کہا۔ اس نے دیکھا کہ پراسرار مہمان دکان سے نکل جانے کی فکر میں ہے۔

برانڈی کا جام لایا گیا۔ بوڑھے نے غیرارادی طور پر جام ہاتھوں میں لے لیا لیکن اس کے ہاتھ کانپ گئے اور اس سے پہلے

2—1651

کہ وہ جام کو ہونٹوں تک لے جا سکے، آدھی شراب چھلک گئی۔ اس نے گھونٹ بھرے بغیر ہی جام کو تھالی میں رکھ دیا۔ پھر ایک عجیب طرح کی بے‌ربط مسکراہٹ کے ساتھ بوڑھا وہاں سے تیز تیز مگر ڈگمگاتی چال سے باہر نکل گیا اور ازورکا کو وہیں دکان کے فرش پر پڑا چھوڑ گیا۔ ہر شخص سکتے میں تھا اور چہ‌میگوئیاں سنائی دے رہی تھیں۔

''افسوس! ہا، کیا دردناک بات ہوئی ہے!،، جرمن گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

لیکن میں بوڑھے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ دکان سے چند قدم آگے بڑھ کر داہنے ہاتھ پر ایک سایہ‌دار گلی تھی تنگ و تاریک اور بڑی بڑی حویلیوں سے گھری ہوئی۔ کسی شے نے میرے کان میں پھونکا کہ بڑے میاں اسی طرف مڑے ہوں گے۔ موڑ سے دوسری عمارت ابھی زیر تعمیر تھی۔ اور اس پر پاڑ لگی ہوئی تھی۔ عمارت کے گرد جو پاڑ تھی وہ قریب قریب راستے کے بیچ تک بڑھی ہوئی تھی اور پاڑ کے چاروں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے پٹری بنا دی گئی تھی۔ پاڑ اور زیر ثعمیر عمارت سے جو ایک گھپ اندھیر کونہ سا نکل آیا تھا اس میں بوڑھا مجھ کو نظر آیا۔ وہ لکڑی کی پٹری کے کنارے بیٹھا تھا اور سر دونوں ہاتھوں سے تھامے تھا۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا رکھی تھیں۔ میں اس کے برابر جا بیٹھا۔

''سنئے میری بات،، میں نے کہا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ ''اب آپ ازورکا کا غم نہ کیجئے۔ چلئے میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔ صبر کیجئے۔ میں ابھی گاڑی بلائے لاتا ہوں۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟،،

بڑے میاں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کیا جائے۔ گلی میں راہ‌گیروں کا بھی پتہ نہ تھا۔ ایک دم بوڑھے نے میرا بازو تھامنے کی کوشش کی۔

''دم گھٹا جاتا ہے،، اس نے گھٹی گھٹی بھرائی آواز میں کہا جو بمشکل سنی جا سکتی تھی ''دم گھٹا جاتا ہے۔،،

''چلئے، آپ کو گھر لے چلوں!،، میں نے زور سے کہا۔ میں خود اٹھ کھڑا ہوا اور اسے زبردستی اٹھاتے ہوئے بولا ''آپ کو چائے پینی چاہئے، بستر پر آرام کرنا چاہئے... میں گاڑی لئے لیتا ہوں۔ ڈاکٹر بلا دوں گا... ایک ڈاکٹر سے میری جان پہچان ہے...،،

یاد نہیں کہ اور میں نے اس سے کیا کہا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر زمین پر ڈھے گیا۔ اور اسی گھٹی بھرائی آواز میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں اور نزدیک جھکا اور اس کے لفظوں پر کان لگا دئیے۔

''واسی‌لیفسکی جزیرے * میں...،، بوڑھے نے خرخراتی ہوئی آواز میں کہا ''چھٹی سڑک۔ چھہ... ٹی س... سٹر... سڑک...،،

وہ بالکل چپ ہو گیا۔

''تو کیا آپ واسی‌لیفسکی جزیرے میں رہتے ہیں؟ تب تو آپ ادھر نہیں مڑے۔ بائیں طرف مڑنا چاہئے تھا، داھنی طرف نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو ادھر لے چلتا ہوں...،،

بوڑھے نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں نے اس کا ھاتھ تھاما۔ لیکن وہ ایسے گرا جیسے مردے کا ھاتھ ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر گہری نظر ڈالی، اسے چھوکر دیکھا — وہ دنیا سے سدھار چکا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب خواب میں دیکھ رہا ہوں۔

اس حادثے نے مجھے بڑا پریشان کر دیا اور اسی اثنا میں میرا تپ و لرزہ بھی آپ سے آپ جاتا رہا۔ بڑے میاں کے مکان کا پتہ لگ چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ واسی‌لیفسکی جزیرے میں نہیں بلکہ یہیں اسی علاقے میں چند قدم پر رہتے تھے — کلوگن بلڈنگ کی پانچویں منزل پر ٹھیک چھت کے نیچے۔ بڈھے کا الگ ایک فلیٹ تھا جس میں چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی اور بڑا کشادہ سا نیچی چھت کا کمرہ۔ کمرے میں تین پتلی پتلی کھڑکیوں کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہاں اس نے سخت مفلسی کی زندگی گزاری تھی۔ فرنیچر میں ایک میز تھی، دو کرسیاں اور ایک بےحد پرانا صوفہ تھا جو پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا اور اس کے اندر کی بھرائی باہر کو ہر طرف نکل آئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ چیزیں بھی بوڑھے کی نہیں بلکہ مالک مکان کی تھیں۔ چولہے کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ ایک زمانہ سے اس میں آگ روشن نہیں کی گئی اور گھر بھر میں کہیں شمعوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اب میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں

---

*واسیلیفسکی جزیرہ— ان جزیروں میں ایک جزیرہ ہے جن پر پیٹرسبرگ (لینن گراد) پھیلا ہوا ہے۔ یہ شہر کا گنجان آباد علاقہ ہے۔ (ایڈیٹر)

تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے میاں ملر کی دکان اس لئے جاتے ہوں گے کہ اور کچھ نہیں تو ایک روشن کمرے میں بیٹھ کر تھوڑا بہت تاپ لیں۔ میز پر مٹی کا ایک خالی ڈونگا پڑا ہوا تھا اور اس کے پاس روٹی کا باسی ٹکڑا۔ بس۔ کہیں سے روپیہ نہیں نکلا۔ ایک کوپک تک نہ ملا۔ کپڑے کا ایک بھی ٹکڑا ایسا نہ تھا جس میں اس غریب کو لپیٹ کر دفن کر دیا جائے۔ کسی شخص نے اپنی قمیص نذر کر دی تاکہ وہ پہنا کر دفن کر دیا جائے۔ بات صاف تھی کہ اس طرح سے بالکل یکہ و تنہا بوڑھے نے زندگی بسر نہ کی ہوگی، اس کی دیکھ‌ریکھ کے لئے کوئی نہ کوئی تو وقتاً فوقتاً آتا ہی رہا ہوگا۔ میز کی دراز میں مرحوم کا پاسپورٹ پڑا ملا جسے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اگرچہ وہ روسی باشندہ تھا تاہم اس کی پیدائش غیرملکی تھی۔ اس کا نام تھا جریمی اسمتھ اور وہ میکانیکل انجنیر تھا۔ عمر ۷۸ سال پائی۔ میز پر دو کتابیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک خلاصہ جغرافیہ اور دوسری نئی بائبل (نیو ٹسٹامنٹ) کا روسی ترجمہ، جس کے حاشیے پر جابجا پنسل کے نشان اور ناخنوں کی خراش لگی تھی۔ یہ دونوں کتابیں میں نے اپنی تحویل میں لے لیں۔ مالک مکان اور دوسرے ھمسایوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں خاص کچھ معلوم نہ تھا۔ مکان میں بہت سے کرایہ دار رہتے تھے۔ قریب قریب سب کے سب یا تو کاری گر لوگ تھے یا جرمن عورتیں تھیں جو لوگوں کو کھانے، رہنے اور دیکھ بھال کی خدمات پیش کرتی تھیں۔ اس بلاک کے نگران سے، جو شریف خاندان کا تھا، پوچھا گیا تو وہ بھی اپنے سابق کرایہ‌دار کے بارے میں بہت کچھ نہ بتا سکا سوائے اس کے کہ اوپر کا فلیٹ ۶ روبل ماھوار کرائے پر اٹھایا گیا تھا اور مرحوم اس میں صرف ۴ مہینے سے رہتا تھا لیکن اس نے پچھلے دو مہینے سے ایک کوپک بھی ادا نہیں کیا تھا۔ اس لئے بوڑھے سے کہا گیا تھا کہ وہ مکان خالی کر دے۔ سوال کیا گیا کہ کیا کوئی شخص اس سے ملنے آتا تھا کبھی، مگر اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔ یہ کافی بڑی عمارت تھی۔ ایسی کشتی نوح میں آنے جانے والوں کا کیا پتہ لگ سکتا تھا۔ جو دربان اس عمارت میں پانچ سال سے ملازم تھا وہ بھی کوئی دو ھفتے پہلے اپنے آبائی گاؤں جا چکا تھا، وہی ایسا آدمی ہو سکتا تھا جو غالباً کچھ اتہ

پتہ دے سکتا۔ اب دربان کی جگہ اس کا بھتیجا کام کر رہا تھا۔ یہ نیا لڑکا تھا جو خود ابھی آدھے کرایہ‌داروں کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ ان سب تفتیشوں کا بالآخر نتیجہ کیا نکلا لیکن سب قصے کے بعد بڑے میاں کو قبر میں اتار دیا گیا۔ انہی دنوں میں یہ بھی ہوا کہ جہاں مجھے اور الجھیڑوں میں دخل دینا پڑا وہیں میں واسی‌لیفسکی جزیرے کی چھٹی سڑک پر پہنچا۔ جب میں وہاں پہنچ گیا تو اپنے اوپر ہنسے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ اس سڑک پر سوائے مکانوں کی معمولی قطار کے اور کیا مل سکتا تھا۔ اچھا تو، تعجب اس پر ہوتا تھا کہ بڑے میاں نے واسی‌لیفسکی جزیرے کی اس چھٹی سڑک کا پتہ کیوں بتایا مرنے سے پہلے۔ کیا وہ سرسام کی حالت میں تھے؟

میں نے جریمی اسمتھ کے اس خستہ‌حال مکان پر نظر ڈالی۔ مجھے یہ جگہ پسند آئی۔ میں نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا۔ اس مکان کی خاص بات یہ تھی کہ کمرہ بڑا تھا، اگرچہ اس کی چھت اس قدر نیچی تھی کہ پہلے تو ایسا لگا جیسے میرا سر اس سے ٹکرا جائے گا۔ لیکن جلد ہی اس سے مانوس ہو گیا۔ ٦ روبل مہینے کرائے پر بہرحال اس سے بہتر جگہ دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ جس خوبی پر میرا جی للچایا وہ تھی اس کی تنہائی۔ اب صرف اتنا کرنا تھا کہ جھاڑ پونچھ اور کام کاج کرنے والے کا انتظام کیا جائے۔ کسی ملازم کے بغیر میں قطعی نہیں رہ سکتا۔ اسی دوران گھر کے دربان نے وعدہ کر لیا کہ وہ دن میں ایک بار چکر لگا جایا کرے گا تاکہ ضرورت میں ہاتھ بٹا دے۔ اور پھر میں نے یہ بھی سوچا: کیا خبر، کوئی شخص بڑے میاں کی خیرخبر لینے آ ھی پہنچے۔ ایسے ہی بڑے میاں کی موت کو پانچ دن گزر گئے اور کوئی نہ آیا۔

دوسرا باب

اس زمانے میں، کوئی ایک سال ہوا میں کچھ رسالوں کے لئے کام کر رہا تھا، مضامین لکھتا تھا اور مجھے پکا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن کوئی اچھی سی، بڑی سی چیز لکھ لوں گا۔ ان دنوں میں

اپنے بڑے ناول کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن حاصل کیا ہوا کہ اب میں اسپتال میں پڑا ہوں اور بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ جلدی ہی میرا خاتمہ ہونےوالا ہے۔ جب خاتمہ بالکل قریب ہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یادداشتیں کیوں لکھوں؟

مجھے اپنی زندگی کا پچھلا سال ہر وقت بےاختیار یاد آتا رہتا ہے جو اتنی مصیبت سے کٹا ہے۔ جو کچھ گزرا ہے سب کا سب لکھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے یہ مشغلہ نہ مل گیا ہوتا تو میں کوفت سے مر گیا ہوتا۔ ماضی کے یہ سب تاثرات مجھے کبھی کبھی اتنے کچوکے دیتے ہیں کہ ہوک اٹھنے لگتی ہے اور شاق گزرتا ہے۔ قلم‌بند ہوتے ہیں تو ان میں سکون آجاتا ہے اور ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ان میں ہذیان کی شدت نہیں رہتی، خواب پریشان کا سا عالم نہیں رہ جاتا۔ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ محض لکھ دینے کی بڑی اہمیت ہے۔ لکھنا مجھے تسلی دے گا، طپش ٹھنڈی کر دے گا، مجھ میں لکھنے کی پرانی عادت پھر سے پیدا کر دے گا، میری یادوں کو اور بیمار خوابوں کو کام اور مصروفیت میں تبدیل کر دے گا۔ ہاں، اچھی سوجھی مجھ کو۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی کمپاؤنڈر کو وراثت میں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ جب سردیاں آئیں گی تو وہ میرے مسودوں کے کاغذات وہاں کھڑکیوں کے ڈبل چوکھٹوں پر چپکا دے گا*۔

مگر میں نے اپنی کہانی کو، پتہ نہیں کیوں، بیچ میں کہیں سے شروع کر دیا ہے۔ اگر ساری کہانی لکھنی ہو تو قاعدے میں اسے شروع سے لکھنا چاہئے۔ اچھا تو، پھر شروع سے ہی ابتدا کی جائے۔ اگرچہ میری خودنوشت سوانح بہت لمبی چوڑی نہ ہوگی۔

میرا جنم یہاں نہیں بلکہ بہت دوردراز کے ایک صوبے میں ہوا تھا۔ فرض کیا جانا چاہئے کہ میرے والدین بھلے لوگ تھے، لیکن بچپن میں مجھے یتیم اور لاوارث چھوڑ کر دنیا سے سدھار گئے اور میں نکولائی سرگیئچ اخمنیف کے گھر میں پلا بڑھا۔ یہ صاحب قریب کے علاقے کے معمولی سے زمیندار تھے جنہوں نے ترس کھا کر

* روس میں سردی کے موسم میں کھڑکیوں کی درازوں پر ہوا روکنے کے لئے کاغذ چپکا دئے جاتے ہیں۔ (مترجم)

مجھے اپنے سائے میں لے لیا۔ ان کے صرف ایک اولاد تھی — نتاشا نام کی لڑکی، مجھ سے تین سال چھوٹی۔ ہم دونوں بھائی بہن کی طرح پلتے رہے۔ ہائے، میرا بچپن! جب عمر کا ۲۰ واں سال ہو، اس وقت بچپن کی یاد کرنا، اس کے لئے تڑپنا اور وہ بھی جب ۲۵ سال کی عمر میں آدمی موت کے بستر پر تن تنہا پڑا ہو، بچپن ہی کی یاد کمال مسرت اور احسان‌مندی کے جذبے کے ساتھ کرنا — کیا واہیات بات ہے! اس زمانے میں آسمان پر سورج کس قدر روشن اور آجکل کے پیٹرسبرگ کے سورج سے کس قدر مختلف ہوا کرتا تھا اور ہمارے ننھے ننھے دل نشاط اور خوشی سے کیسے دھڑکا کرتے تھے۔ چاروں طرف سبزہ‌زار تھے، جنگل تھے، آجکل کی طرح بےجان پتھر کے مکان سر پر چڑھے نہیں آتے تھے۔ واسی‌لیفسکوئے تعلقے میں باغ اور پارک کیسے نفیس اور دل‌کش تھے۔ وہاں نکولائی سرگیئچ منتظم تھے۔ نتاشا اور میں، ہم دونوں باغ میں کودتے پھرتے تھے، اور باغ کے اس پار ایک بہت بڑا مرطوب جنگل تھا جہاں ایک بار ہم دونوں کھوگئے تھے... سنہرا لاجواب زمانہ! زندگی نے پہلے پہل اپنے رازوں اور رجھانے والی اداؤں سے ہم کو آشنا کیا تھا۔ اس سے آشنا ہونا کس قدر پرلطف تھا۔ ان دنوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر جھاڑی کے پیچھے، ہر درخت کے پیچھے کوئی انجانی ہستی چھپی بیٹھی ہے۔ افسانوں کی دنیا حقیقت کی دنیا میں گھلی ملی تھی۔ اور شام کو جب وادیوں کی گہرائیوں میں کہرا اتر آتا تھا اور ہمارے زبردست کھڈ کی پتھریلی پسلیوں سے چمٹی ہوئی جھاڑیوں کے سڑے تڑے اور بھورے پودوں کو گود میں بھر لیتا تھا، تو میں اور نتاشا — ہم دونوں — ہاتھ میں ہاتھ لئے کھڈ کے کگارے سے نیچے گہرائیوں میں دبے دبے تعجب کے ساتھ جھانکنے لگتے۔ دل دھڑکتا تھا کہ وہ دیکھو، کسی لمحے بھی کوئی نکل پڑے گا یا کھڈ کی گہرائیوں میں چھائی ہوئی دھند میں سے لپک کر آجائے گا، اور ہماری آیا نے جن پریوں کی کہانیاں سنائی تھیں وہ بالکل سچ ثابت ہوں گی۔ اس کے بعد بہت زمانے کی بات ہے کہ میں نے نتاشا کو یاد دلایا کہ ''بچوں کی کہانیاں،، نام کی ایک کتاب ہمیں ملی ہے تو ہم دونوں فوراً کیسے باغ کے تالاب کی طرف دوڑے دوڑے گئے اور وہاں میپل کے پرانے گھنے درخت کے نیچے اپنی خاص ہری بنچ پر جا بیٹھے اور بیٹھتے ہی

ہم نے ''الفانسو اور دلیندا،، پریوں کی کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ آج بھی میرا یہ حال ہے کہ وہ کہانی یاد آئے تو اس کے ساتھ دل میں ایک عجب سنسنی سی دوڑ جاتی ہے، اور ابھی ایک سال کی بات ہے کہ جب میں نتاشا کو اس کہانی کی پہلی سطر سنانے بیٹھا کہ ''الفانسو، اس کہانی کا ہیرو پرتگال کا باشندہ تھا۔ اس کے باپ کا نام تھا دون رامیرو ،، — وغیرہ تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دیکھنے میں میری یہ حرکت نہایت احمقانہ معلوم ہوئی ہوگی اور اسی لئے شاید نتاشا اس وقت کی میری جذباتی شدت پر عجب طرح سے مسکرا دی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ اس نے اپنی ہنسی ضبط کر لی اور خود بھی میری خاطر پرانے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ بات سے بات نکلتی چلی آئی اور خود اس پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ عجب خوشگوار شام تھی۔ ایک ایک چیز کا ہم نے ذکر کیا، دھرایا۔ پھر یاد تازہ ہوئی کہ جب میں صوبہ کے شہر ، بوڑدنگ اسکول کو بھیجا گیا تھا، تو نتاشا کس بری طرح تڑپی تھی۔ اور آخری بار جب میں واسی‌لیفسکوئے سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا ہوں تو کیا گزری تھی۔ اس وقت تک میں بوڑدنگ اسکول سے فارغ ہو چکا تھا اور یونی‌ورسٹی میں داخلہ لینے کے لئے مجھے پیٹرسبرگ بھیجا جا رہا تھا۔ اس وقت میری عمر تھی سترہ اور اس کا پندرھواں برس ہوگا۔ نتاشا کا بیان ہے کہ میں اس زمانے میں اس قدر بھدا اور لمبو تھا کہ جو دیکھتا وہی ہنس‌پڑتا۔ جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے تھے تو میں اسے ایک طرف کو لے گیا جیسے کوئی بہت ہی اہم بات کہنی ہے، لیکن زبان تالو کو چپک گئی اور منہ سے کچھ نہ نکلا۔ اسے اب تک یاد ہے کہ میں اس وقت سخت جذباتی ہلچل میں مبتلا تھا۔ ظاہر ہے ہماری گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے کیا کہنا ہے اور وہ شاید میری بات سمجھی نہ ہوتی۔ میں پھوٹ کر رو پڑا اور بغیر کچھ کہے سنے چل دیا۔ بس۔ اس کے بعد میری اور نتاشا کی ملاقات برسوں بعد ہوئی پیٹرسبرگ شہر میں۔ اس کو اب دو سال ہوئے ہیں۔ بوڑھے نکولائی سرگیئچ پیٹرسبرگ میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے اور میں نے انہی دنوں ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

تیسرا باب

نکولائی سرگیئیچ اخمنیف کا اعلیٰ خاندان سے تعلق تھا لیکن بہت عرصے سے یہ لوگ غریب ہو چکے تھے۔ تاہم باپ کے انتقال پر نکولائی سرگیئیچ کو اچھی خاصی جاگیر ورثے میں ملی جس پر کوئی ڈیڑھ سو کمیرے کام کرتے تھے۔ بیس برس کی عمر میں وہ خاص شاہی رسالے میں شامل ہو گئے۔ سب کام ٹھیک چلتا رہا۔ مگر فوج میں چھ برس کام کرنے کے بعد اتفاق کی بات کہ ایک رات تاش کی بازی میں انہوں نے اپنی ساری جاگیر گنوا دی۔ رات بھر فکر سے نیند نہ آئی۔ دوسری شام وہ پھر تاش کی میز پر پہنچے اور اب کے انہوں نے گھوڑا بھی داؤ پر لگا دیا۔ لے دے کے ایک گھوڑا ہی بچا تھا۔ پتہ جیت گیا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، یہاں تک کہ جوئے میں انہوں نے اپنا ایک گاؤں واپس جیت لیا۔ یہ چھوٹی سی بستی تھی اخمنیفکا نام کی، جس کی پچھلی مردم شماری میں صرف ۵۰ نفر کی آبادی تھی۔ بس اس کے بعد اخمنیف نے بازی سے ہاتھ روک لیا، اپنے کاغذات لپیٹے اور دوسرے دن نوکری سے استعفا دے دیا۔ ان کی رعایا میں سے سو کمیرے ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ دو مہینے بعد انہیں لفٹنٹ کے عہدے سے سبکدوشی کی سرکاری اجازت مل گئی اور وہ اپنے گاؤں چلے آئے۔ بازی ہارنے کا یہ واقعہ انہوں نے کبھی کسی کو عمر بھر نہیں سنایا۔ اور اگر کوئی کبھی اس کے بارے میں یاد دلا دیتا تو وہ اپنی شرافت اور خوش مزاجی کے باوجود اس سے لڑ ہی تو بیٹھتے۔ دیہات میں پہنچ کر وہ اپنی جاگیر کے انتظام میں پوری طرح مصروف ہوگئے اور جب ان کی عمر ۳۵ برس کی تھی تو انہوں نے ایک شریف خاندان کی غریب لڑکی آننا اندریئونا شومیلووا سے شادی کر لی۔ شادی پر بیوی کو کوئی جہیز نہ ملا تھا۔ لیکن انہیں ایک فرانسیسی تارک وطن مون رویش کے خاص بورڈنگ اسکول میں تعلیم ملی تھی۔ یہ ایک ایسا وصف تھا جس پر آننا اندریئونا ساری زندگی فخر کرتی رہیں۔ حالانکہ دنیا میں کوئی شخص بھی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ بھلا وہ تعلیم تھی کس مضمون کی۔ نکولائی سرگیئیچ بہت اچھے منتظم ثابت ہوئے۔ آس پاس کے زمینداروں

نے اپنی جاگیروں کا انتظام کرنا ان سے سیکھا۔ کچھ سال اس طرح گزر گئے کہ اچانک ایک بڑا تعلقہ دار پرنس پیوتر الیکساندرووچ والکوفسکی پیٹرسبرگ شہر سے پاس کے تعلقے واسی‌لیفسکوئے میں آیا۔ یہ تعلقہ ۹ سو کمیروں کا تھا۔ سارے گرد و نواح میں اس کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ یہ پرنس ابھی جوان تھا اگرچہ ابتدائی نوجوانی کے دن کبھی کے گزر چکے تھے۔ بڑے عہدے پر رہ چکا تھا۔ اس کا رسوخ بہت تھا۔ نقد رقم بھی کافی ملی تھی۔ صورت شکل کا بھی اچھا تھا۔ اور آخری بات یہ کہ پہلی بیوی مر چکی تھی۔ یہ تھی وہ بات جس کی وجہ سے آس پاس کے علاقے کی کنواریوں اور عورتوں کو اس سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ لوگوں میں بڑا چرچا تھا کہ گورنر نے، جو اس کا کوئی دور کا رشتہ‌دار ہوتا تھا، شہر میں پرنس کی آمد پر دھوم دھام کا استقبال کیا، اور جب وہ داخل ہوا تو اس کی آن‌بان دیکھ کر گورنر کے حلقے کی معزز خواتین اس پر فدا ہو گئیں وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ وہ پیٹرسبرگ شہر کی اشرافیہ کے ان نمائندوں میں سے تھا جو اول تو دیہاتی حلقوں میں اپنی صورت دکھاتے ہی نہیں، اور ایک بار آ جائیں تو غیرمعمولی سنسنی سی پھیلا دیتے ہیں۔ پرنس کی خوش‌خلقی، البتہ ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکی جن کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی یا جن کو وہ اپنے سے ذرا بھی کم تر سمجھتا تھا۔ اپنے پاس پڑوس والوں میں بھی عام طور پر اس نے میل جول بڑھانے کی کوشش نہ کی جس کی وجہ سے فوراً اس کے بےشمار دشمن پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہر آدمی کے کان کھڑے ہوگئے کہ پرنس کو نکولائی سرگیئیچ سے ملاقات کرنے کا خیال یکایک کیسے آگیا۔ یہ درست ہے کہ نکولائی سرگیئیچ اس کے سب سے پڑوس کے زمیندار تھے۔ اخمنیف کے گھرانے پر پرنس کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ میاں بیوی دونوں کو اس نے لبھا لیا۔ آننا اندریئونا تو خاص طور سے اس پر فدا ہو گئیں۔ تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ ان کا میل جول بےتکلفی کی حد کو پہنچ گیا۔ پرنس خود روزانہ ان کے گھر آتا اور ان کو بھی اپنی حویلی پر دعوت دیتا۔ وہ ان سے قصے کہانیاں، لطیفے، چھیڑ چھاڑ کی باتیں کیا کرتا، ان کا بدبخت پیانو بجایا کرتا اور گایا کرتا۔ اخمنیف میاں بیوی کی سمجھ میں یہ پہیلی نہ آتی تھی کہ پرنس جیسے شریف اور

باغ و بہار آدمی کے بارے میں لوگ بھلا یہ کیوں کہتے ہیں کہ وہ مغرور ہے، خودپسند ہے، سیدھے منہ بات نہیں کرتا، پاس پڑوس کے سب لوگ متفقہ طور پر اسے ایسا کیوں ٹھیراتے ہیں۔ یہ بات تو صاف تھی کہ پرنس کو نکولائی سرگیئچ اس قدر سادگی، صاف گوئی، کھرے پن، بےغرضی اور خوش‌دلی کی بنا پر بہت پسند تھے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ معاملہ سلجھ گیا۔ پرنس والکوفسکی اپنی جاگیر میں یہ ٹھان کر آیا تھا کہ اپنے تعلقے کے منیجر سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ اس کے تعلقے کا منیجر ایک آوارہ مزاج جرمن، زراعت کا ماہر تھا۔ اس میں خودپسندی بہت تھی۔ اس کے کھچڑی بالوں سے بزرگی ٹپکتی تھی، آنکھوں پر چشمہ لگا رہتا تھا اور ناک نوکیلی تھی۔ ان اوصاف کے باوجود اس نے پرنس کے تعلقے میں بےشرمی کے ساتھ لوٹ مچا رکھی تھی، اور بدترین بات یہ تھی کہ اس نے کئی کسانوں کی پٹائی کرکے مار ڈالا تھا۔ آخر اس جرمن ایوان کارلووچ کی حرکتیں پکڑی گئیں اور اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اسے بہت غصہ آیا۔ بگڑا، جرمن دیانت‌داری کی بہت دھائیاں دیں مگر ایک نہ چلی اور اسے کسی قدر ذلت کے ساتھ نکال دیا گیا۔ پرنس کو اب منیجر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس کی نظرانتخاب نکولائی سرگیئچ پر پڑی جو بذات خود عمدہ قسم کے منتظم تھے۔ اور ان کی دیانت‌داری میں کسی کو ذرا بھی شبہ نہ ہو سکتا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پرنس اس فکر میں تھا کہ نکولائی سرگیئچ خود اپنی خدمات اس غرض کے لئے پیش کر دیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بالاخر پرنس نے ایک روز نہایت دوستانہ نیازمندی کے ساتھ ان کے آگے یہ تجویز پیش کر دی۔ نکولائی سرگیئچ نے اول اول تو انکار ہی کیا۔ لیکن تنخواہ اتنی بڑی پیش کی گئی تھی کہ آننا اندریئونا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور پھر پرنس نے جو ان کے ساتھ اور دگنی شرافت اور خوش‌خلقی جتائی اس سے نکولائی سرگیئچ میں تاب انکار نہ رہی۔ پرنس کے دل کی مراد بر آئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا جا سکتا ہے کہ اس شخص میں آدمی کی اچھی پرکھ تھی۔ اخمنیف گھرانے سے مختصر ملاقات میں ہی اس نے ٹھونک بجا کر دیکھ لیا کہ کس مزاج کے آدمی سے واسطہ ہے اور یہ طے کر لیا کہ نکولائی سرگیئچ کو صرف شرافت، گرم‌جوشی اور خوش‌خلقی کے بیوہار سے ہی شیشے

میں اتارا جا سکتا ہے۔ اس آدمی کا دل جیتنا چاہئے۔ محض روپیہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ پرنس کو ضرورت تھی ایسے منیجر کی جس پر ہمیشہ آنکھیں بند کرکے اعتماد کیا جا سکے اور پھر واسی‌لیفسکوئے آنا نہ پڑے۔ بس اسے اتنا ہی چاہئے تھا۔ نکولائی سرگیئچ کو اس شخص نے ایسا لبھا لیا تھا کہ وہ واقعی بھولپن میں پرنس کی گہری دوستی کا اعتبار کرنے لگے تھے۔ نکولائی سرگیئچ ان شریف‌الطبع اور پرخلوص محبت کرنےوالوں میں تھے جو ہم روسیوں میں بہت دل‌کش شخصیت رکھتے ہیں خواہ لوگ ان کے خلاف جو بھی کہیں۔ اور ان لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ایک بار کسی سے محبت کرنے پر آجائیں (خدا جانے چند موقعوں پر ہی ایسا کیوں ہوتا ہے) تو اپنا تن من سب اس پر نثار کر دیتے ہیں اور اپنی اس جاں‌نثاری کو مضحکہ‌خیز حد تک پہنچا دیتے ہیں۔

سال گزرتے گئے۔ پرنس کی جاگیر خوب پھلی پھولی۔ تعلقہ‌دار اور اس کے منیجر کے باہمی تعلقات میں دونوں طرف ذرا بھی آنچ نہ آئی اور وہ حسب‌دستور برقرار رہے۔ لیکن ہاں بڑھے بھی نہیں۔ دونوں کے درمیان کاروباری خط و کتابت ہوتی رہی۔ اگرچہ پرنس نے اپنے منیجر کے کام میں کوئی دخل نہ دیا لیکن کبھی کبھی وہ مشورے بھیجا کرتا تھا جن کی عملی اور کاروباری صلاحیت پر نکولائی سرگیئچ کو حیرت ہوتی تھی۔ یہ بات صاف تھی کہ نہ صرف وہ روپے کے بےجا مصرف کو ناپسند کرتا تھا بلکہ روپیہ بنانا جانتا تھا۔ بہرحال پرنس کی واسی‌لیفسکوئے میں آمد کو پانچ برس گزرے ہوں گے کہ اس نے نکولائی سرگیئچ کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ اسی صوبے میں چار سو کمیروں کی ایک اور شاندار جاگیر خرید لیں۔ نکولائی سرگیئچ اس سے بہت خوش ہوئے۔ پرنس کی کامیابیوں کی خبریں، ترقی اور عہدے کی برتری کی اطلاعیں نکولائی سرگیئچ کے لئے اس قدر پیاری تھیں جیسے پرنس کوئی ان کا سگا بھائی ہو۔ ایک دن ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب پرنس نے ایک موقع پر ان کی ذات پر انتہائی اعتماد کا اظہار کیا۔ اب سنئے کہ وہ موقع کیا تھا... لیکن نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کے بیان سے پہلے پرنس والکوفسکی کی زندگی کے بارے میں چند تفصیلات بتاتا چلوں کیونکہ یہ ذات شریف میری اس کہانی کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔

چوتھا باب

یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ پرنس کی بیوی مر چکی تھی۔ اس نے ابتدائی نوجوانی میں ہی شادی کر لی تھی اور شادی روپے کی خاطر کی تھی۔ اس کے والدین ماسکو میں اپنی ساری دولت گنوا چکے تھے اور ان سے پرنس کو ورثے میں شاید ہی کچھ ملا ہو۔ واسی لیفسکوئے کی جاگیر بار بار رہن رکھی گئی اور پھر اس پر قرض بھی حیثیت سے زیادہ چڑھ گیا تھا۔ ۲۲ برس کی عمر میں پرنس کا حال یہ تھا کہ مجبوراً اسے ماسکو میں سرکاری ملازمت کرنی پڑی اور گرہ میں دام بالکل نہ تھے۔ وہ اپنی زندگی ایسے شروع کر رہا تھا جیسے بڑے بڑے گھرانے کے قلاش وارث کیا کرتے ہیں۔ شادی نے پرنس کو بچا لیا۔ ایک تاجر کی ڈھلتی عمر کی بیٹی سے اس نے شادی کر لی۔ اگرچہ تاجر نے دان جہیز کے معاملے میں اسے دھوکا دیا تاہم اتنا ضرور ہاتھ آیا کہ پرنس نے بیوی کے روپے سے اپنی رہن رکھی ہوئی جائداد چھڑا لی اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ تاجر کی بیٹی قریب قریب ان پڑھ تھی، شاید ہی دو چار لفظ جوڑ سکتی ہو، شکل صورت کی بھی بری تھی۔ مگر اس میں ایک خوشگوار خصوصیت تھی — یہ کہ وہ نیک دل اور بےزبان عورت تھی۔ اس خصوصیت سے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو سکتا تھا، وہ پرنس نے اٹھایا۔ شادی کے پہلے سال کے بعد اس نے بیوی کو اس کے باپ کے پاس ماسکو میں چھوڑ دیا، اور خود "...." صوبے میں اپنی ملازمت پر چلا گیا۔ اس عرصے میں اس سے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ اس نے پیٹرسبرگ میں اپنے ایک بااثر رشتہ دار کے ذریعے نہایت اہم عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کی روح بےقرار تھی کہ جیسے تیسے اونچے عہدوں پر پہنچے، آگے بڑھے، اپنا مستقبل بنائے، اور یہ اندازہ کر کے کہ موجودہ بیوی کے ساتھ نہ تو وہ ماسکو میں رہ سکتا ہے، نہ پیٹرسبرگ میں، اس نے فیصلہ کیا کہ جب تک حالات پلٹا نہ کھائیں وہ دور دور کے اضلاع میں قیام رکھے گا۔ کہا جاتا ہے کہ شادی کے پہلے سال میں ہی اس نے بیوی کے ساتھ جو بےرحمی کا برتاؤ کیا وہ اسے قبر میں اتار دینے کو کافی تھا۔ نکولائی سرگیئچ اس افواہ

پر بہت گرم ہوتے تھے اور پرنس کی طرف سے صفائی دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ پرنس جیسا شخص بدسلوکی تو کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ بہرحال کوئی سات برس بعد پرنس کی بیوی دنیا سے چل بسی اور سوگی خاوند فوراً پیٹرسبرگ آ پہنچا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس شخص نے پیٹرسبرگ میں ذرا سنسنی سی پھیلادی۔ دولت پاس تھی۔ صورت شکل اچھی تھی، جوانی بھی تھی، بہت سی جگمگاتی ہوئی خوبیاں تھیں۔ باتوں میں چٹخارہ تھا، ذوق ستھرا تھا، اور پھر ہمیشہ ہشاش بشاش رہتا تھا، یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ ان کے ہوتے وہ پیٹرسبرگ میں کوئی قسمت‌آزما نہیں بلکہ ایسا شخص سمجھا گیا جو صاحب حیثیت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پرنس میں واقعی کوئی ایسی چیز تھی جو دل لبھا لیتی تھی، لوگوں پر چھا جاتی تھی اور طاقتور تھی۔ عورتوں کے لئے یہ شخص بڑی جاذبیت رکھتا تھا۔ کسی حسینہ سے جو سوسائٹی میں کافی مقبول تھی اس کا معاملہ پھنس گیا اور اس کے متعلق طرح طرح کے چرچے ہونے لگے۔ حالانکہ احتیاط اور دوراندیشی کا مادہ اس کی فطرت میں تھا اور کنجوسی کی حد کو پہنچتا تھا، پھر بھی اس نے خوب روپیہ بہایا۔ خاص خاص لوگوں سے جوے میں بڑی رقمیں ہارا اور ماتھے پہ بل ڈالے بغیر کافی روپیہ دیتا رہا۔ لیکن وہ پیٹرسبرگ اس لئے نہیں آیا تھا کہ یہاں سیر تفریح کرے گا۔ وہ اس پر تلا ہوا تھا کہ اپنا کیریئر یا مستقبل بنائے گا اور بالاخر اپنی پوزیشن مضبوط کر لے گا۔ یہ مقصد اسے حاصل ہو گیا۔ اس کے ایک معزز رشتہ‌دار کاؤنٹ نائنسکی جو شاید اس حال میں اس پر توجہ بھی نہ کرتے اگر وہ کسی ملازمت کے امیدوار کی حیثیت سے ان کی خدمت میں گیا ہوتا، وہ سماج میں اس کی نمایاں حیثیت سے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اس پر خاص چشم عنایت رکھنے کے روادار بھی ہوئے اور خصوصیت سے پیش آنے لگے، یہاں تک کہ پرنس کے سات‌سالہ بچے کو بھی انہوں نے اپنے ہاں پرورش کے لئے رکھ لیا۔ یہ جو میں نے واسی‌لیفسکوئے میں پرنس کا آنا اور اخمنیف گھرانے سے اس کا گھل مل جانا بیان کیا ہے، یہ اسی زمانے کا قصہ ہے۔ بالاخر کاؤنٹ صاحب کے اثر و رسوخ سے اسے ایک نہایت اہم سفارت‌خانے میں عہدہ مل گیا اور وہ ملک سے باہر چلا گیا۔ اس کے بعد سے پرنس کے متعلق بری بری خبریں آنے لگیں۔ مثلاً یہ خبر پھیلی کہ بدیس میں اسے

کوئی بڑا ناگوار واقعہ پیش آیا لیکن حقیقت کا پتہ کسی کو نہ تھا۔ لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس نے اپنی جاگیر میں چار سو کمیروں کا علاقہ اور شامل کر لیا ہے۔ کئی سال بعد کہیں وہ بدیس سے لوٹا۔ اس وقت وہ بہت اعلی عہدے پر مامور تھا اور آتے ہی اسے پیٹرسبرگ میں ایک نہایت اونچی جگہ مل گئی۔ اخمنیفکا تعلقے میں یہ خبر گرم تھی کہ پرنس عنقریب دوسری شادی کرنے والا ہے اور دوسری شادی ایسی ہوگی جو اسے ایک دولت‌مند، معزز اور زبردست خاندان سے نتھی کر دے گی۔ ''خاص درباریوں میں جگہ بنا لی، سمجھو،، نکولائی سرگیئچ نے خوشی سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ میں اس زمانے میں پیٹرسبرگ میں ہی تھا اور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نکولائی سرگیئچ نے مجھے ایک خط لکھا تھا کہ جو افواہ پرنس کے بارے میں پھیلی ہے اس کی تصدیق کر کے لکھوں۔ انہوں نے میرے بارے میں پرنس کو بھی لکھا کہ وہ مجھ پر خاص عنایت کی نظر رکھیں لیکن اس نے اس خط کا کبھی کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ پرنس کے صاحب‌زادے، جنہوں نے پہلے کاؤنٹ صاحب کے گھرانے میں پرورش پائی تھی اور بعد میں کالج میں، وہ اب انیس برس کی عمر میں تعلیم پوری کر چکے ہیں۔ میں نے اخمنیف گھرانے کو اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ پرنس کو بیٹے سے بڑی ہی محبت ہے، ان کے لاڈ پیار نے لڑکے کو بگاڑ دیا ہے اور ابھی سے پرنس اس کے مستقبل کی زندگی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ سب خبریں مجھے ساتھ کے طالب‌علموں سے ملی تھیں جو پرنس کے فرزند ارجمند کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن نکولائی سرگیئچ کو پرنس والکوفسکی کا ایک خط ملا جس نے انہیں مخمصے میں ڈال دیا۔

پرنس، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اب تک صرف خشک قسم کے کاروباری خط لکھا کرتا تھا، اب اس نے نیکولائی سرگیئچ کو خاندانی معاملات کے بارے میں تفصیلی خط لکھ ڈالا۔ خط بھی ایسا، جو بہت بےتکلف اور دوستانہ تھا۔ خط میں اس نے اپنے بیٹے کی شکایت کی اور لکھا کہ صاحب‌زادے بگڑتے جا رہے ہیں، یہ دیکھ کر انہیں دلی رنج ہوتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ابھی چھوکرا ہے، اس کی بےراہ‌روی کو وزن تو نہ دینا چاہئے (یعنی اپنے بیٹے

کی طرف‌داری بھی مقصود تھی)، لیکن اس نے سوچ لیا ہے کہ بیٹے کو سزا ضرور دے گا اور ایسا سبق دے گا کہ وہ یاد رکھے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لئے شہر سے نکال کر گاؤں میں اخمنیف گھرانے کے چارج میں بھیج دیں۔ پرنس نے خط میں لکھا تھا کہ اسے ''مہربان، نیک‌دل، شریف نکولائی سرگیئچ پر اور خاص طور سے آنّا اندریئونا کی ذات پر بہت بھروسہ ہے،، اور ان دونوں میاں بیوی سے التجا کی تھی کہ لڑکا وہاں آئے تو اس منچلے کو وہ اپنے خاندان میں جگہ دیں، اس کے دماغ سے شہر کے چونچلے نکال دیں اور عقل سکھائیں۔ ہو سکے تو اس سے پیار کریں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں جو من موجی‌پن پیدا ہو گیا ہے، اسے دور کر کے ''وہ سخت اور محتاط قاعدے ضابطے اس میں پیدا کریں جو انسانی زندگی کے لئے نہایت لازم ہیں،،۔ بڑے میاں نکولائی سرگیئچ نے اس فرض کو بڑی سرگرمی سے اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ پرنس کے صاحب‌زادے آ پہنچے۔ اخمنیف خاندان نے ان کی بڑی آؤبھگت کی۔ نکولائی سرگیئچ کو تھوڑے دنوں میں اس لڑکے سے اتنا پیار ہو گیا جیسے خود اپنی اولاد نتاشا سے تھا۔ ایک عرصے بعد بھی جب نکولائی سرگیئچ اور پرنس میں قطع تعلق ہو گیا، تب بھی وہ اس لڑکے کو جس کا اصلی نام پرنس الکسئی پتروویچ تھا، پیار سے الیوشا ہی کہتے تھے۔ واقعی وہ بڑا دل‌کش نوجوان تھا ـــ خوش‌وضع، نازک‌اندام اور عورتوں کی طرح بات بات پر روٹھنے والا۔ مگر اسی کے ساتھ ہشاش بشاش اور بھولا بھالا۔ اس نے ایسی طبیعت پائی تھی جو ہر وقت نہایت شریفانہ جذبات قبول کرنے پر تیار ہو سکتی تھی۔ محبت کرنے والا دل، پاکیزہ اور شکرگزار۔ سارے گھر میں اس کی پوجا ہونے لگی۔ حالانکہ اس کی عمر ۱۹ کو پہنچ چکی تھی پھر بھی وہ بالکل بچہ تھا۔ یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ آخر وہ کونسا جرم ہوگا، باپ جس کی سزا دینا چاہتا تھا۔ حالانکہ کہا جاتا تھا کہ وہ بیٹے سے بہت محبت کرتا ہے۔ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ برخوردار کی زندگی پیٹرسبرگ میں بڑی ناکارہ اور بےلگام تھی۔ اس نے نوکری کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس سے باپ کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ نکولائی سرگیئچ نے بھی الیوشا سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ خود پرنس اپنے خط میں اس سوال سے کترا گئے ہیں۔

سننے میں آتا تھا کہ پرنس کے صاحب‌زادے نے کوئی ناقابل معافی شرارت کی تھی، کسی عورت سے قصہ چلا تھا، پھر کہیں پستول تان لی تھی، تاش کی بازی میں بہت بڑی رقم ہار گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس نے دوسروں کا روپیہ اڑا دیا۔ یہ بھی افواہ سننے میں آئی کہ پرنس نے کسی قصور کی بنا پر بیٹے کو اپنے سے جدا نہیں کیا تھا بلکہ اس میں پرنس کی اپنی غرض پوشیدہ تھی۔ نکولائی سرگیئچ نے ملامت کے ساتھ ان ساری افواہوں کو رد کر دیا۔ خاص طور پر اس کی وجہ یہ تھی کہ بیٹے کو اپنے باپ سے بڑا پیار تھا، بچپن اور لڑکپن میں جس باپ کے ساتھ رہنا نصیب نہ ہوا اس کا وہ اس قدر دلدادہ تھا۔ الیوشا اپنے باپ کا ذکر بڑی محبت سے، بڑی تعریفوں کے ساتھ کرتا تھا، اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ باپ کی شخصیت اس پر چھائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی الیوشا گپ شپ کرتا تھا اور ایک پرنسس کا ذکر بھی سناتا تھا کہ باپ بیٹے دونوں اس سے عشق لڑاتے تھے۔ خود اسی نے بتایا کہ آخرکار بیٹے کے ہاتھوں باپ کو مات اٹھانی پڑی اور باپ کو اس حرکت پر سخت طیش آیا۔ وہ ہمیشہ یہ قصہ مزے لے لے کر سنایا کرتا تھا، بچوں کی سی سادگی کے ساتھ اور خوب کھل کھل کر قہقہے لگایا کرتا تھا۔ لیکن نکولائی سرگیئچ فوراً اسے منع کر دیتے تھے۔ الیوشا کی زبانی اس خبر کی بھی تصدیق ہو گئی کہ پرنس شادی کرنےوالا ہے۔

الیوشا کو جلاوطنی میں قریب قریب ایک سال گزر چکا تھا۔ اس مدت میں وہ باپ کو ادب کے ساتھ شرافت اور سمجھداری کے خط لکھتا رہا تھا۔ اسے خوب واسی‌لیفسکوئے سے اتنا لگاؤ ہو چکا تھا کہ جب باپ موسم گرما میں (نکولائی سرگیئچ کو پہلے سے باقاعدہ اطلاع دے کر) یہاں آیا تو جلاوطن بیٹا خود اپنے باپ سے عرض کرنے لگا کہ اسے واسی‌لیفسکوئے میں ہی زیادہ سے زیادہ عرصے تک رہنے دیا جائے کیونکہ دیہات کی زندگی ہی اس کی اصلی تفریح ہے۔ الیوشا کے من میں جو کچھ سماتا تھا، اس کے جو کچھ فیصلے ہوا کرتے تھے، وہ سب کے سب اعتدال سے بڑھی ہوئی اعصابی کیفیت کا، گرم‌جوشی کا، اور ایسی غیرذمہ‌داری کا، جو اکثر بےخیالی اور لاپرواہی تک پہنچتی تھی، اور ہر قسم کے بیرونی اثرات کا فوراً شکار ہو جانےوالی طبیعت اور قوت‌ارادی کے بالکل

3—1651

لاپتہ ہونے کا نتیجہ ہوتے تھے۔ پرنس نے اس کی عرضداشت کو ایک طرح کے شک و شبہ سے سنا... ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ نکولائی سرگیئچ اپنے پرانے ''دوست،، کو بمشکل پہچان سکے۔ پرنس والکوفسکی اب بالکل بدل چکا تھا۔ ایک دم نکولائی سرگیئچ کے ساتھ اس کے رویے میں نکتہ‌چینی خاص طور سے بڑھ گئی۔ اور جب جاگیر کا حساب نکالا گیا اور حساب فہمی ہونے لگی تو پرنس کی طرف سے حرص، کنجوسی اور ایک ناگوار قسم کی بےاعتباری ظاہر ہوئی۔ اس رویے سے نیک‌دل اخمنیف کو بہت ٹھیس لگی۔ کافی دنوں تک تو انہیں یقین نہ آیا کہ وہ ٹھیک اندازہ لگا رہے ہیں کہ نہیں۔ چودہ برس پہلے جب پرنس پہلی بار اپنی جاگیر میں آیا تھا، اس وقت کے رویے میں اور اب کے طور طریق میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا تھا۔ اب کی بار پرنس نے آس پاس کے تعلقہ‌داروں سے، یعنی جو خاص خاص تھے، ان سے میل جول بڑھایا۔ وہ ایک بار بھی نکولائی سرگیئچ سے ملنے نہ آیا اور اس سے ماتحتوں کا سا سلوک کیا۔ اور بعد میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔ پرنس اور نکولائی سرگیئچ کے درمیان بغیر کسی سبب کے تیز و تند جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں طرف سے گرما گرم توہین‌آمیز لفظ سننے میں آئے۔ اخمنیف غصے کے مارے واسی‌لیفسکوئے سے چلے گئے۔ لیکن معاملہ یہیں ختم نہ ہوا۔ تمام پاس پڑوس میں نفرت انگیز افواہیں پھیل گئیں۔ کہا جانے لگا کہ نکولائی سرگیئچ نے نوجوان الیوشا کے طور طریق کو اچھی طرح بھانپ کر یہ چال چلی تھی کہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر اپنا الو سیدھا کرے۔ خبر گرم ہوئی کہ نکولائی سرگیئچ کی بیٹی نتاشا، جس کی عمر اب سترہ برس تھی، جال بچھا رہی تھی کہ ۲۰ برس کے اس نوجوان کو اپنی محبت میں مبتلا کر لے۔ اور والدین اگرچہ بظاہر انجان بنتے تھے لیکن انہوں نے خود یہ جال بنا تھا۔ اور یہ کہ چال‌باز اور ''بدچلن،، نتاشا اس نوجوان کو بالکل اپنی مٹھی میں لے چکی تھی، یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پاس پڑوس کے شریف، باعزت زمیندار گھرانوں سے جہاں بکثرت نوجوان لڑکیوں کا شباب پھوٹ رہا تھا، اس نوجوان کو دور دور رکھا گیا۔ آخر میں یہ باور کرایا جاتا تھا کہ نتاشا اور پرنس کے صاحب‌زادے نے آپس میں یہ عہدوپیمان کر لیا ہے کہ واسی‌لیفسکوئے سے بارہ کوس

دور گری گوریئیوہ گاؤں میں جاکر شادی رچالیں گے، جس کا مقصد بظاہر یہ دکھانا تھا کہ نتاشا کے والدین کو خبر نہ ہونے پائے لیکن اصل میں ان کو ذرا ذرا سی تفصیل تک معلوم تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی کو وہ زہرآلود مشوروں سے اور شہ دیا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ آس پاس کے مرد و زن میں اس معاملے کے متعلق جیسی جیسی افواہیں گھڑی گئی تھیں، وہ پوری کتاب میں نہیں سما سکتیں۔ مگر ان سب میں قابل غور بات تو یہ تھی کہ خود پرنس کو ان ساری افواہوں کا پکا یقین تھا۔ اور جب اسے اپنی جاگیر سے ایک گمنام خط اس سلسلے میں ملا تو وہ اسی غرض سے واسی‌لیفسکوئے میں آیا۔ شاید کوئی سوچے کہ جو شخص نکولائی سرگیئچ کو ذرا بھی جانتا ہو وہ ان کے خلاف اس طرح کے الزامات پر کیا یقین کرے گا، لیکن جیساکہ ہمیشہ ہوتا ہے، ہر آدمی جوش میں تھا۔ ہر شخص جو منہ میں آتا تھا، کہہ رہا تھا، اگرچہ کسی کو واقعے کی تحقیق نہ تھی لیکن جسے دیکھئے وہ سر ہلاتا اور نکولائی سرگیئچ کو ہی قصوروار ٹھیراتا تھا۔ نکولائی سرگیئچ اتنے خوددار آدمی تھے کہ انہوں نے افواہ‌بازوں کے سامنے اپنی بیٹی کی صفائی پیش کرنا بھی پسند نہ کیا اور بیوی تک کو سختی سے منع کر دیا کہ پڑوسیوں سے اس معاملے پر الجھا نہ جائے۔ نتاشا جو خود اتنے الزاموں کا شکار بنی تھی، اس تمام افواہ سے بےخبر تھی اور سال بھر تک بےخبر ہی رہی، نہایت احتیاط کے ساتھ اس سے تمام واقعہ چھپایا گیا اور وہ یوں ہی کھیلتی کودتی پھری جیسے بارہ برس کا بچہ۔

اسی عرصے میں جھگڑا اور بڑھ گیا۔ بڑھتا چلا گیا۔ شوشے چھوڑنےوالوں نے بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مخبروں اور گواہوں نے بڑھ بڑھ کے ہاتھ دکھائے اور بالاخر وہ پرنس کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ واسی‌لیفسکوئے میں جب تک نکولائی سرگیئچ کی منیجری قائم رہی، ایمان‌داری سے تو اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نکولائی سرگیئچ نے تین سال ہوئے جب جنگل بیچا تھا تو اس میں ۱۲ ہزار روبل کا خرد برد کیا تھا، اور اس کی ناقابل تردید شہادت عدالت کے سامنے لائی جا سکتی ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ معلوم ہے کہ نکولائی سرگیئچ نے پرنس سے اجازت حاصل کئے بغیر جنگل بیچا،

اپنی جگہ آپ فیصلہ کر لیا، بعد میں پرنس کو سمجھا دیا کہ جنگل بیچ دینا ضروری تھا اور جتنی رقم فروخت سے حاصل ہوئی تھی اس سے کہیں کم کھاتے میں درج کرا دی۔ یہ ساری باتیں، اس میں شک نہیں کہ تھیں تو گھڑی ہوئی اور بعد میں ثابت بھی ہو گیا لیکن اس وقت پرنس کو ان سب کا ذرہ ذرہ یقین آ گیا، اور اس نے گواہوں کی موجودگی میں نکولائی سرگیئچ کو چور کہا۔ اخمنیف اسے برداشت نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بہت سخت جنگ چھڑ گئی۔ فوراً ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ نکولائی سرگیئچ کے پاس سارے کاغذات موجود نہ تھے۔ نہ تو ان کی پشت پر زبردست لوگوں کا ہاتھ تھا اور نہ انہیں مقدمہ‌بازی کا تجربہ تھا۔ انہوں نے مقدمے میں پڑتے ہی محسوس کیا کہ ان کے پیروں کے نیچے زمین کمزور ہے۔ ان کی جائداد پر پابندی لگ گئی۔ جھنجھلاہٹ میں بےچارے بوڑھے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انہوں نے سب کچھ اس داؤ پر لگا کر فیصلہ کیا کہ پیٹرسبرگ پہنچ کر بذات خود اپنے مقدمے کی پیروی کریں اور جاگیر پر کسی تجربہ‌کار آدمی کو دیکھ بھال کے لئے لگا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پرنس کو خود بھی جلدی ہی احساس ہو گیا کہ اس نے نکولائی سرگیئچ کی بلاوجہ توہین کی ہے۔ لیکن توہین دونوں فریقوں کی طرف سے اتنی سخت ہوئی تھی کہ اب صلح صفائی کا کوئی امکان نہ رہ گیا تھا۔ اور آگ بگولا پرنس اس پر تلا ہوا تھا کہ پورا زور لگا کر قصہ پاک کرے یعنی اپنے حریف، سابق منیجر کو ٹکڑوں کا محتاج کر کے چھوڑے۔

پانچواں باب

غرض اس طرح اخمنیف گھرانا پیٹرسبرگ چلا آیا۔ اتنے لمبے زمانے کی جدائی کے بعد جو میری نتاشا سے ملاقات ہوئی اس کا ذکر یہاں نہ کروں گا۔ میں ان چار برسوں میں کبھی اسے بھلا نہ سکا تھا۔ اس کا خیال کن جذبات کے ساتھ آتا تھا یہ تو میں پوری طرح خود بھی نہ سمجھ پاتا تھا، مگر ہاں، جب ہم دوبارہ ملے تو فوراً یہ

خیال دماغ میں اترا کہ قسمت نے اسے میرا بنایا ہے۔ اس گھرانے کے پیٹرسبرگ آ جانے کے بعد شروع کے دنوں میں تو ایسا لگتا تھا کہ ان چار برسوں میں وہ ذرا بھی نہیں بڑھی، بالکل ویسی کی ویسی ہی چھوٹی سی بچی ہے جیسی جدا ہوتے وقت چھوڑ آیا تھا، لیکن ہر دن کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا اور یہ نئی تبدیلی ایسی تھی جس کی مجھے کچھ خبر ہی نہ تھی، جیسے مجھ سے جان بوجھ کر چھپائی گئی ہو، جیسے لڑکی کے پردے میں عورت مجھ سے دانستہ چھپی رہی ہو۔ اور ہر نئی دریافت پر کیسا لطف آتا تھا! بڑے میاں پیٹرسبرگ میں پہنچے تو اول اول چڑچڑے اور الجھے سے رہے۔ ان کے معاملات بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ وہ برہم رہتے تھے، آپے سے باہر ہو جاتے تھے، بات کی برداشت نہ تھی اور ہم سے بالکل بےخبر اپنے کاغذوں اور دستاویزوں میں الجھے رہتے تھے۔ آننا اندریئونا اول اول تو کسی گم‌شدہ کی طرح بدحواس ہو گئی تھیں۔ انہیں کسی شے کی سدھ بدھ نہ تھی۔ پیٹرسبرگ نے انہیں ہڑبڑا دیا تھا۔ خوف سے آہیں بھرا کرتی تھیں۔ انہیں جھرجھری سی آتی تھی۔ پرانے طرز کی زندگی کی یاد میں آنسو رواں ہوتے تھے، اخمنیفکا کی یادیں ستاتی تھیں، فکر رہتی تھی کہ نتاشا اب شادی کے قابل ہو گئی ہے لیکن کسی کو اس کی فکر نہیں۔ ہوتے ہوتے انہوں نے مجھ کو اپنا ہمدم و ہمراز بنایا کیونکہ اور کوئی ان کی سننے والا یہاں نہ تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ ان کے آنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی میں نے اپنا پہلا ناول لکھ کر ختم کیا تھا، جس ناول سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اور نوآموز ہونے کی وجہ سے مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ ناول لکھ تو لیا، دوں کسے؟ میں نے اخمنیف گھرانے میں کسی سے بھی اس کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ وہ اسی پر مجھ سے بگڑتے رہے کہ میں ایک بیکار قسم کی زندگی گزار رہا ہوں، نہ تو ملازمت کی ہے اور نہ کسی اچھی نوکری کی تلاش میں ہوں۔ بڑے میاں نکولائی سرگیئچ بھی مجھ پر بہت خفا ہوئے، انہوں نے ڈانٹ بھی پلائی۔ البتہ اس خفگی میں پدرانہ شفقت تھی۔ اور مجھے ان لوگوں سے یہ کہتے ہوئے واقعی شرم سی آتی کہ آجکل میں کس دھندے میں لگا ہوا ہوں۔ بھلا میں ان سے کیسے صاف صاف کہہ دیتا کہ صاحب! میرا ارادہ نوکری کرنے کا بالکل نہیں

ہے، میں تو بس لکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ عارضی طور پر تو انہیں ٹالتا رہا، دھوکے میں رکھتا رہا، کہہ دیا کہ نوکری ملی نہیں۔ لیکن نوکری کے لئے جان‌توڑ کوشش کر رہا ہوں۔ بڑے میاں کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ اس کی تفصیل پوچھنے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز نتاشا جو ہماری یہ گفتگو سن چکی تھی، مجھے چپکے سے ایک طرف لے گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگی کہ اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ اس نے مجھ سے سوال کئے اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ دراصل میں کر کیا رہا ہوں۔ اور جب میں نے اس پر بھی راز کھولنے سے انکار کر دیا تو اس نے مجھ سے قسم کھلوائی کہ اپنی زندگی ایک فالتو مجہول آوارہ‌گرد کی طرح ضائع نہ کروں گا۔ اور حالانکہ میں نے اس کے سامنے اقرار نہ کیا کہ میں کس کام میں لگا ہوا ہوں تاہم مجھے یاد ہے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ تبصرہ‌نگاروں سے اور قدردانوں سے بعد میں جو بہت کچھ داد مجھے ملی ہے اپنے کام کی، اس سب کا اپنی محنت اور اپنے پہلے ناول کے بارے میں نتاشا کے لبوں سے تعریف کے ایک لفظ سے تبادلہ کرلوں۔

بالآخر میرا ناول * شائع ہو گیا۔ اشاعت سے پہلے ہی ادبی دنیا میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ ''ب'' نے جو میرا مسودہ دیکھا تو وہ بچے کی طرح خوشی سے کھل گئے تھے۔ نہیں، میں اگر کبھی خوش ہوا ہوں تو اس وقت نہیں، جب کامیابی کا نشہ مجھے پہلے پہل چڑھا تھا، بلکہ اس سے بہت پہلے، جب کہ ابھی خود نہ تو میں نے اپنا مسودہ پڑھا تھا اور نہ کسی کو پڑھنے دیا تھا — اصل میں مسرت ان لمبی راتوں میں ہوئی جب امنگیں زور پر تھیں، اپنے خوابوں میں مگن تھا اور اپنے کام سے ہماہمی کی محبت پا رہا تھا۔ جب میں خود اپنے تخیل کے پلاٹ میں سمویا ہوا تھا، اور وہ کردار، جنہیں خود میں نے جنم دیا تھا، وہ مجھے ایسے لگتے تھے جیسے وہ میرے ہی کنبے کے لوگ ہوں۔ جیسے

* اشارہ ہے دستوئیفسکی کے پہلے ناول ''بےچارے لوگ'' کی طرف۔ اور یہ کہ نقاد زمانہ بلینسکی (۱۸۱۱ء تا ۱۸۴۸ء) نے اسی کا بڑا خیرمقدم کیا تھا۔ یہاں ''ب'' سے مراد بلینسکی ہی ہو سکتے ہیں۔ (مترجم)

وہ سچ مچ کے آدمی ہوں۔ مجھے ان سے پیار تھا۔ میں ان کے دکھ سکھ کا شریک تھا اور کبھی کبھی تو واقعی اپنے سادہ‌دل ہیرو پر مجھے رونا آ گیا۔ اور میں نے سچ‌مچ کے آنسو بہائے۔ بیان نہیں کر سکتا کہ بڑے بوڑھے میری کامیابی سے کس درجہ خوش ہوئے حالانکہ انہیں شروع شروع میں سخت حیرت ہوئی تھی۔ دیکھنے میں ان کو یہ بات ایسی عجیب معلوم ہوئی کہ بالکل ششدر ہوکر رہ گئے مثلاً آننا اندریئونا کو تو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نیا ادیب جس کی سب طرف سے تعریف ہو رہی ہے، یہی لڑکا ہے، وانیا جس نے یہ کیا، وہ کیا — وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس پر دیر تک سر ہلاتی رہیں۔ بڑے میاں نکولائی سرگیئچ نے ایک عرصے تک تو اس پر کان ہی نہیں دھرے، لیکن پہلی بھنک پڑی تو جیسے گھبرا گئے۔ انہیں اندیشہ ہو گیا۔ کہنے لگے کہ دیکھو! تمہارا مستقبل خاک میں مل گیا۔ کیا ہے۔ مصنف لوگ عام طور سے بےہنگم کردار کے ہوتے ہیں۔ لیکن جو تازہ اطلاعیں برابر چلی آ رہی تھیں، اخباروں میں جو تبصرے نکل رہے تھے، اور آخر میں ان لوگوں کے منہ سے کچھ تعریفی الفاظ سن کر، جنہیں وہ اپنے دل میں بڑی جگہ دیتے تھے، بڑے میاں اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ میرے پاس ایک دم بہت سا روپیہ آ گیا ہے، اور سنا کہ لکھنےوالے کو ادبی کام سے اتنی کچھ آمدنی ہو سکتی ہے تو ان کے شکوک و شبہات جاتے رہے۔ شک دور ہوتے ہی تیزی سے اس کی جگہ پرجوش یقین نے لے لی، میری کامیابی پر وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگے اور دوسری انتہا پر جا پہنچے اور میرے مستقبل کے بارے میں بےتحاشا امیدیں اور چکاچوندھ کرنےوالے خواب دیکھنے لگے۔ آئے دن میرے بارے میں نئے امکانات اور نئے پلان انہیں سوجھنے لگے۔ کیا رہ گیا ہوگا جو انہوں نے اپنے منصوبوں میں میرے لئے نہ سوچا ہو! بلکہ اور تو اور وہ میرا خاص طرح کا احترام کرنے لگے جو پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ تاہم، اتنا اب بھی مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی ان کے دل میں شک گزرتا تھا اور اچانک انہیں گڑبڑا دیتا تھا — اکثر ایسی حالتوں میں جب کہ وہ خوش‌وخرم خوابوں کے محل بنا رہے ہوں۔

”ادیب، شاعر! بھلا کیا عجیب سی بات ہے!.. بھلا یہ شاعر لوگ کب دنیا میں آگے نکلے ہیں، کسی اونچی جگہ پر؟ ایسے ہی

الٹو فالتو لوگ کاغذ خراب کرنےوالے۔ ان سے امید رکھنا بےسود ہے!،،

مجھے نظر پڑا کہ اس قسم کے شکوک اور الجھاوے کے سوال ان کے دماغ میں شام ہوتے وقت آیا کرتے تھے (بھلا مجھے ان باتوں کی اور اس پرمسرت زمانے کی کتنی تفصیلیں یاد ہیں!)۔ شام ہوتے ہی میرے بزرگ ہمدرد ہمیشہ غیرمعمولی طور پر مضطرب ہو جایا کرتے تھے اور شکوک اور بےاعتباری میں مبتلا پائے جاتے تھے۔ نتاشا اور میں، ہم دونوں اب اس بات کو اچھی طرح جان چکے تھے اور اس وقت سے پہلے ہی اس کے متعلق ہنسی مذاق شروع کر دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے انہیں خوش رکھنے کی کوشش میں ایسی کہانیاں سنائیں کہ دیکھئے، سماروکوف* کو جنرل کا عہدہ عطا ہو گیا تھا، درژاوین** ادیب تھا لیکن اسے نسوار کی صندوقچی انعام میں ملی تھی جس میں اشرفیاں بھری تھیں، اور خود ملکہ ایکاتیرینا لومونوسوف*** سے ملنے گئی تھیں، میں نے پوشکن اور گوگول کے واقعات بھی بیان کئے۔

”میرے بھائی، یہ سب مجھے معلوم ہے۔ جانتا ہوں،، وہ جواب دیا کرتے اگرچہ غالباً انہوں نے یہ واقعات پہلی بار ہی سنے ہوں گے۔

”ہوں! سنو، وانیا، خیر مجھے اس کی تو خوشی ہے کہ یہ جو تمہاری کاوش ہے، کم سے کم شعر شاعری میں نہیں ہے۔ شاعری تو بکواس ہے، میرے بھائی۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ بوڑھا آدمی ہوں، میری بات مانو۔ میں تو ہر حال میں تمہارا ہی بھلا چاہتا ہوں۔ یہ محض خرافات ہے، فضول وقت برباد کرنا۔ شاعری کیا، الفاظ کی کود پھاند ہے۔ بس۔ تمہارے ایسے کتنے نوجوانوں کو یہی شاعری پاگل‌خانے پہنچاتی ہے... مان لو، کہ چلو، بھئی، پوشکن تھا، بڑا آدمی تھا۔ لیکن آگے کیا، شعربازی سوائے

---

* سمارو کوف، الیکساندر پیترووچ (۱۷۱۸ء تا ۱۷۷۷ء) — ایک ممتاز درباری شاعر اور ڈرامہ‌نگار تھا۔ (ایڈیٹر)

** درژاوین، گاوریل رومانووچ (۱۷۴۳ء تا ۱۸۱۶ء) — اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا روسی شاعر۔ (ایڈیٹر)

*** لومونوسوف، میخائیل وسیلیوچ (۱۷۱۱ء تا ۱۷۶۵ء) — اٹھارویں صدی کا نمایاں سائنس‌داں اور اہل قلم۔ (ایڈیٹر)

بکواس کے اور ہے کیا چیز؟ صرف وقتی شے۔ میں نے بذاتِ‌خود تو کم ہی ان کی شاعری پڑھی ہے۔ اچھا۔ نثر کا معاملہ اس سے الگ ہے! نثرنگار سکھا سکتا ہے۔ مادروطن کی محبت پیدا کر سکتا ہے اپنی تحریر سے۔ یا عام طور پر نیکی کی تبلیغ کر سکتا ہے... ہاں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا، کیسے کہوں میرے بھائی — مگر خیر، تم سمجھے تو ہوگے میرا مطلب۔ میں دل سے کہتا ہوں۔ اچھا تو — چلو۔ پڑھو۔ پڑھو تم،، ایک اندازِشفقت کے ساتھ انہوں نے بات پوری کی جب کہ میں آخر میں اپنی کتاب لے آیا تھا، ہم سب چائے سے نمٹ کر گول میز گھیرے بیٹھے تھے۔ ’’پڑھو، سناؤ، تم نے کیا گھسیٹا ہے۔ دیکھوں۔ تمہارے بارے میں شور مچا رکھا ہے لوگوں نے۔ دیکھوں تو — ذرا سنوں تو —،،

میں نے کتاب کھولی اور پڑھنے کو تیار ہوا۔ میرا ناول اسی دن چھاپہ‌خانے سے آیا تھا اور ایک جلد اٹھاکر میں دوڑا کہ ان لوگوں کو اپنی کاوش پڑھ کر سناؤں۔

مجھے کتنا رنج تھا، میں کس درجہ افسردہ تھا کہ اب سے پہلے، جب مسودہ ہاتھ میں تھا اسی وقت میں نے انہیں کچھ کیوں نہ سنا دیا۔ نتاشا تو رنج سے رو پڑی اور مجھ پر خوب غصے ہوئی کہ یہ کیا حرکت ہے، جب دوسرے لوگ پڑھ چکیں گے، تب کہیں میری باری آئے گی... بہرحال اب ہم لوگ میز کے گرد جمع تھے۔ بڑے میاں نے خاص قسم کی سنجیدگی اور تنقید کے تیور اختیار کر لئے۔ وہ میری تحریر کو بہت ہی سختی کے ساتھ ٹھونک بجاکر ’’اپنا اطمینان کر لینا،، چاہتے تھے۔ بڑی بی بھی کچھ معمول سے زیادہ گمبھیر ہو گئی تھیں۔ عجب نہیں کہ انہوں نے اسی دن، اسی موقعے کے لئے یہ خاص ٹوپا اوڑھ رکھا ہو۔ بہت دن پہلے ہی ان کی نظر میں یہ بات آ چکی تھی کہ میں ان کی پیاری نتاشا کو بےپناہ محبت سے دیکھتا ہوں، اس سے بات کرتے میرا سانس پھولتا اور آنکھیں بھنچ جاتی ہیں اور نتاشا بھی اب مجھ پر نظر ڈالتے وقت پہلے کے مقابلے میں ذرا تمتما جاتی ہے۔ اچھا، تو اب وہ وقت آ گیا تھا۔ کامیابی کے لمحے میں، سنہری امیدوں اور سب سے بڑھ کے بھرپور خوشیوں کے لمحے میں وہ وقت آیا تھا۔ سب کچھ ایک ساتھ لئے آ پہنچا تھا۔ بڑی بی کو یہ بھی محسوس ہو چلا تھا کہ بڑے میاں ادھر میری تعریف حد سے بڑھ کے کرنے لگے ہیں اور اپنی

بیٹی کو اور مجھے خاص معنی‌خیز نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ اچانک وہ اس بات سے گھبرا گئیں — آخر میں کوئی رئیس زادہ نہ تھا، بڑا حاکم نہ تھا، کسی ریاست کا تعلقہ‌دار نہ تھا اور نہ کوئی جنرل — نوجوان اور خوبصورت، جس کے سینے پر عہدوں کی زرتار پٹی لگی ہو! آننا اندریئونا کو آدھی ادھوری آرزو کرنا پسند نہ تھا۔

’’اس شخص کی تعریف کی جاتی ہے،، انہوں نے میرے بارے میں سوچا۔ ’’مگر کس لئے؟ پتہ نہیں آخر کیوں؟ مصنف ہے، شاعر ہے... بھلا ادیب ودیب ہونا کیا بات ہوئی؟،،

چھٹا باب

میں نے ایک ہی نشست میں سارا ناول پڑھ کر سنا دیا۔ چائے پینے کے فوراً بعد شروع کیا تھا، رات کے دو بجے تک جاری رہا۔ بڑے میاں نے اول تو ناک‌بھوں چڑھائی۔ انہیں گمان تھا کہ کوئی بڑی شاندار چیز ہوگی، کوئی ایسی بات جسے شاید وہ خود بھی نہ سمجھ پائیں۔ لیکن ہو بہت اعلیٰ ارفع۔ اور اس کے بجائے سننے کو کیا ملا — نہایت روزمرہ قسم کی سادہ چیزیں، یعنی ایسی جو خود انہی کو زندگی میں پیش آتی تھیں۔ یہ بھی نہ ہوتا، کم از کم اتنا تو ہوتا کہ ناول کا ہیرو ہی کوئی بڑا آدمی یا دلچسپ شخصیت کا مالک ہوتا یا تاریخی شخصیت کا آدمی، جیسے روسلاولیف یا یوری میلوسلافسکی*۔ مگر وہ بھی نہیں۔ اس کے بجائے جس ہیرو کا ذکر تھا اسے ایک معمولی دبا کچلا بلکہ سادہ‌لوح کلرک بتایا گیا جس کی وردی کے بٹن تک غائب تھے۔ اور پھر یہ ساری باتیں اس قدر معمولی، روزمرہ کی زبان میں لکھی ہوئی تھیں جیسی ہم خود بولتے رہتے ہیں۔ عجیب بات! بڑی بی نے نکولائی سرگیئچ کے چہرے کو حیران حیران نظروں سے دیکھا اور ایسے منہ بنایا جیسے روٹھ گئی ہوں — ’’کیا واقعی یہ خرافات اس قابل تھی کہ

* یہ دونوں نام اسی نام کے ناولوں سے لئے گئے ہیں جو مصنف زاگوسکن (۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۲ء) کی یادگار ہیں۔ (ایڈیٹر)

اسے چھاپا جاتا اور سنا جاتا، اور اوپر سے اس کام کا روپیہ بھی ملتا ہے،، یہ جملہ گویا ان کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ نتاشا پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ ایسی منہمک تھی سننے میں کہ میرے چہرے سے اس کی نظر نہ ہٹتی تھی اور میرے ہونٹوں کی حرکت دیکھ رہی تھی کہ کیسے میں لفظوں کو ادا کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ خود بھی اپنے نازک لبوں کو حرکت دیتی جاتی تھی۔ کیا سمجھتے ہیں آپ، کیا ہوا؟ ابھی میں ناول کا آدھا حصہ بھی ختم نہ کر پایا تھا کہ ان تینوں کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ آننا اندریئونا سچ مچ رو رہی تھیں اور انہیں میرے ہیرو پر رہ رہ کر ترس آ رہا تھا اور ان کے بار بار کے ہائے وائے کرکے چونکنے سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ وہ حددرجہ سادگی سے بےقرار ہیں کہ میرے ہیرو کی مصیبت میں کسی طرح کام آئیں۔ بڑے میاں نے تو اونچے خوابوں اور خیالوں سے ہی ہاتھ دھو لئے، یہ گمان ہی چھوڑ دیا کہ کوئی اونچے پائے کی چیز سامنے آئے گی۔ وہ بولے: ”پہلے ہی نظر میں لگتا ہے کہ اتنا بڑا تیر نہیں مارا۔ یوں ہی معمولی سی ادنا درجے کی کہانی ہے۔ بس اتنا ہے کہ دل دھڑکا دیتی ہے۔ اس سے آدمی محسوس کرنے لگتا ہے اور دیکھنے لگتا ہے کہ اس کے اردگرد کیا بیت رہی ہے۔ اور یہ احساس ہوتا ہے کہ سب سے دبا کچلا، بہت ہی نیچے درجے کا آدمی بھی آدمی ہے، اور میرا بھائی ہے۔،،

نتاشا ناول سنتی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور میز کے نیچے چوری چوری میرا ہاتھ دبا رہی تھی۔ ناول پڑھا جا چکا۔ نتاشا اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے گال تمتمائے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو اب بھی لرز رہے تھے۔ اچانک اس نے میرا ہاتھ تھاما، اسے چوما اور فوراً کمرے سے غائب ہو گئی۔ ماں باپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

”ہونہہ، دیکھو تو اسے کیا لطف آیا ہے!،، بڑے میاں نے بیٹی کی حرکت پر حیرت‌زدہ ہوکر کہا۔ ”خیر، کوئی حرج نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ اچھا ہے، اچھا ہے۔ شریفانہ جذبہ ہے، اچھی نیک طینت لڑکی ہے...،، وہ منہ ہی منہ میں بدبداتے رہے۔ اور ایک اچٹتی نظر بیوی پر ڈالی، جیسے نتاشا کی اس حرکت کو معقول قرار دے رہے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں مجھے بھی حق بجانب بتا رہے ہوں۔

آننا اندریئونا کا حال یہ تھا کہ اگرچہ وہ بھی جب ناول پڑھا جا رہا تھا، کافی متاثر اور بےقرار تھیں تاہم اس وقت ایسی لگ رہی تھیں جیسے کہنا چاہتی ہوں کہ ”بھئی، ٹھیک ہے، مقدونیہ کا سکندر اعظم ہوگا ہیرو۔ لیکن میز کرسی کیوں توڑے ڈالتے ہو؟،، * وغیرہ۔

نتاشا فوراً ہی واپس آئی — خوب ہشاش بشاش۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے چپکے سے میرے چٹکی بھری۔ بڑے میاں اس کوشش میں تھے کہ میرے ناول کے ”سخت بےرحم،، تنقیدنگار کا فرض انجام دیں لیکن وہ ایسے مزے میں آئے کہ خود بھی بہہ گئے اور اپنا فرض انجام نہ دے سکے۔

”اچھا تو بھئی وانیا، بہت اچھا! بہت خوب! تم نے بہت جی خوش کیا! امید سے زیادہ جی خوش کر دیا! یہ کوئی بہت اونچی، کوئی عظیم‌الشان چیز نہیں ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے۔ اب میں تمہیں بتاؤں کہ میرے پاس ایک کتاب پڑی ہے ’ماسکو کی آزادی،،**۔ تم جانتے ہو کہ وہ کتاب ماسکو میں ہی لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کو پڑھو تو پہلی ہی سطر سے تمہیں یہ لگے گا جیسے کتاب کا مصنف، کہنا چاہئے کہ شکرے کی طرح پر تول رہا ہے... لیکن تمہاری کتاب میں یہ بات نہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں سمجھنا آسان بھی ہے، سادہ بھی ہے۔ یہی تو اچھی بات لگی کہ سب سمجھ میں آتا ہے۔ یہ قصہ ہم سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود مجھی پر گزرا ہو۔ اونچی اڑان بھرنے کا حاصل بھی کیا آخر؟ تم لکھتے اور تم خود اسے نہ سمجھتے۔ بہرحال میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو ذرا طرز بیان کو اور بہتر بناتا۔ میں اس کی تعریف کر رہا ہوں۔ آپ جو جی چاہئے کہہ لیجئے مگر یہ تو ہے کہ ہائے کی چیز نہیں ہے۔ ہاں البتہ۔ لیکن اب کیا، دیر ہو چکی۔ اب تو کتاب چھپ بھی گئی۔ جب تک اس کا دوسرا ایڈیشن تیار نہ کیا جائے، تب تک۔ خیر تو، میرے بھائی۔ میرا

---

* گوگول کے ڈرامے ”انسپکٹر جنرل،، کی طرف اشارہ ہے۔ (ایڈیٹر)

** ”۱۶۱۲ء میں ماسکو کی آزادی،، — گلوخاریف کا فرضی تاریخی، مہم‌جویانہ واقعات پر مبنی ناول (۱۸۳۰ء)۔ (ایڈیٹر)

خیال ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن نکلے گا اور پھر تمہیں روپیہ ملے گا! ہونہہ!''

''اور کیا، واقعی آپ کو اس کی اتنی بڑی رقم وصول ہوئی؟''، آننا اندریئونا نے کہا۔ ''ایوان پترووچ، میں تو آپ کو دیکھ رہی ہوں، مجھے تو یقین نہیں آتا۔ خدا بھلا کرے، لوگ بھی اس زمانے میں کن کن چیزوں پر روپیہ دینے لگے ہیں!''

''تم جانتے ہو وانیا، بڑے میاں نے زیادہ جوش میں آتے ہوئے کہا ''ہے تو یہ بھی ایک کام ہی، نہ سہی ملازمت۔ بڑے بڑوں کی نظروں سے گزرے گی یہ کتاب۔ تم مجھے بتا رہے تھے کہ گوگول کو سالانہ رقم ملتی ہے اور اسے ملک سے باہر بھی بھیجا گیا۔ کیا عجب جو تم بھی اس درجے کو پہنچو۔ یا ابھی[1] اس میں وقت لگے گا؟ کیا تمہیں ابھی اور کچھ نہ کچھ لکھنا ہوگا؟ ایسا ہے تو لکھو اور۔ اور جتنی جلدی ہو سکے لکھو۔ بس اتنی سی کامیابی پر تکیہ کئے مت بیٹھنا۔ اور رکاوٹ بھی کیا ہے اس میں؟''

انہوں نے باتیں ایسے فیصلہ کن انداز میں کہیں کہ مجھے اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ بیچ میں ٹوک دوں اور ان کی خیال آرائیوں کو ٹھنڈا کر دوں۔

''اور پھر کیا خبر — تمہیں بھی، مثال کے طور پر نسوار کی ویسی اشرفیوں والی صندوقچی عطا ہو جائے۔ انعام و عطا کے کیا ٹھکانے ہیں۔ وہ تمہاری بھی حوصلہ افزائی کرنا چاہیں گے اور کل کی کسے خبر! ہو سکتا ہے دربار میں ہی تمہاری طلبی ہو جائے''، انہوں نے یہ جملہ معنی خیز انداز سے بائیں آنکھ بھینچتے ہوئے دبی آواز سے کہا۔ ''ہے نا؟ کیا دربار میں طلبی کو ابھی بہت وقت درکار ہے؟''

''جی ہاں — دربار ہی تو رکھا ہے''، آننا اندریئونا نے ایسے کہا جیسے کسی نے انہیں ناراض کر دیا ہو۔

''بس ذرا دیر بعد آپ مجھے فوجی جنرل کے عہدے پر پہنچا دیں گے؟''، میں نے دل کھول کر ہنستے ہوئے کہا۔

بڑے میاں بھی اس پر ہنس پڑے۔ وہ بہت ہی مزے میں تھے۔

''اعلیٰ حضرت! کچھ نوش نہ فرمائیں گے کیا؟''، نتاشا نے چھیڑتے ہوئے زور سے کہا۔ اس درمیان میں اس نے ہم لوگوں کے لئے رات کے کھانے کی تیاری کر لی تھی۔

وہ قہقہہ سا کر ہنس پڑی اور دوڑ کر باپ کے پاس گئی اور بڑے میاں کو گرم بازوؤں میں بھینچ کر بولی ''میرے اچھے، بہت اچھے پاپا!''

بڑے میاں پگھل گئے۔

''اچھا، اچھا۔ بس بہت ہوا۔ میں تو سادگی، سادہ دلی سے بات کرتا ہوں جنرل ہو یا نہ ہو، بلا سے، لیکن کھانے کو تو چلنا چاہئے۔ تو، تو بھی بڑی جذباتی لڑکی ہے!''، انہوں نے اپنی چہیتی بیٹی نتاشا کے گال تھپتھپا کر، جیسا کہ وہ ہر مناسب موقع پر کیا کرتے تھے، یہ جملہ کہا ''میں نے تو بھئی سیدھی سیدھی دل کی بات کہہ دی تھی، وانیا، چلو جنرل نہ سہی (جنرل کی بات تو بہت دور کی ہے) مگر پھر بھی ایک نامور آدمی تو ٹھیرے — یعنی مصنف!''

''پاپا، آجکل مصنف نہیں کہتے، ادیب کا لفظ بولتے ہیں!''

''اچھا مصنف نہیں بولا جاتا؟ چلو، مجھے پتہ نہیں تھا۔ خیر، وہ ادیب ہی سہی، لیکن جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ تمہیں Kammerherr تو بنا نہیں دیں گے اس بات پر کہ ناول لکھا ہے۔ اس کا خواب دیکھنا بھی فضول ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ لوگوں میں تمہاری ایک حیثیت بن جائے گی۔ اتاشی ہوجاؤ گے، کچھ اور ہوجاؤ گے، باہر کے ملکوں میں بھیج سکتے ہیں۔ جیسے صحت بہتر کرنے کو اٹلی بھیج دیں، یا اس لئے کہ اپنی تعلیم کو مکمل کرو۔ روپے پیسے سے تمہاری مدد کی جائے گی۔ البتہ تمہیں اپنا کام بھی بخوبی انجام دینا ہوگا، عزت آبرو کے ساتھ۔ کام ہی، اصلی کام وہ چیز ہے جس سے تمہیں روپیہ بھی خوب ملے اور عزت بھی نصیب ہو۔ کسی کی سرپرستی سے یا کسی اور چیز سے یہ باتیں نصیب نہیں ہوا کرتیں...''

''پھر تم اکڑ مت جانا۔ سمجھے، ایوان پترووچ!''، آننا اندریئونا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جلدی سے آپ ان کے ایک ستارہ تو جڑوا ہی دیجئے پاپا۔ بھلا صرف اتاشی ہونے میں کیا دھرا ہے؟''، یہ کہتے کہتے اس نے پھر میرے بازو میں چٹکی بھری۔

''یہ لڑکی ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہے''، بڑے میاں نے نتاشا کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت نتاشا کے گال دمک

رہے تھے اور آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ ''میرا خیال ہے کہ میرے بچو، میں ذرا حقیقت سے دور نکل جاتا ہوں، مگر تم جانو کہ ہمیشہ سے ایسا ہی آدمی ہوں... اور تمہیں خبر ہے وانیا کہ تمہیں دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے۔ پوچھو کیوں — تو یہ کہ تم بالکل یوں ہی سے ہو...''

''ہائے — اللہ، تو پاپا ایسے نہ ہوتے تو اور کیسے ہوتے؟''

''ارے نہیں، بھئی، یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ بس یہ ہے کہ وانیا، تمہاری صورت شکل تو... میرا مطلب ہے کہ بس ایسی ہی ہے... یعنی مطلب یہ کہ بھئی — کچھ شاعرانہ صورت نہیں لگتی دیکھنے میں۔ تم تو جانتے ہو، کہتے ہیں نا کہ شاعر لوگ صورت سے پیلے پڑے ہوئے۔ اور لمبے لمبے بال والے... آنکھوں میں، وہ کیا کہتے ہیں کہ ویسی آنکھیں... شاعر لوگوں کی... جیسے گوئیٹے تھے، یا کوئی اور... تم تو جانتے ہو بھئی، یہ میں نے ''ایدونا'' * میں پڑھا تھا سب... کہیں میں نے پھر کوئی غلط بات تو نہیں کہہ دی؟ دیکھو اس شریر کی طرف۔ مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہے۔ میرے بچو، میں کوئی عالم فاضل آدمی تو ہوں نہیں۔ اتنا ہے کہ محسوس کر سکتا ہوں۔ خیر — تو صورت شکل ہو، نہ ہو۔ اس سے کوئی آفت تھوڑئی آ رہی ہے۔ تمہاری صورت شکل میرے خیال میں تو اچھی خاصی ہے۔ بلکہ مجھے تو پسند ہے... میں اصل میں یہ بات نہیں کہنا چاہ رہا تھا۔ دراصل کہنے کی بات یہ تھی کہ بھئی، ایمان‌دار رہو، وانیا، بس، ایمان‌داری برتو، اصل چیز یہی ہے۔ ایمان‌داری کی زندگی بسر کرو۔ اس سے منہ مت موڑو۔ تمہارے سامنے کھلا راستہ پڑا ہے۔ اپنا کام کرو ایمان‌داری سے۔ یہی بات مجھے کہنی تھی۔ بس، صرف اتنا ہی کہنا تھا مجھے تو!''

خوب وقت تھا! ہر شام، سارا فالتو وقت میں ان لوگوں کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ بڑے میاں کو میں ادبی دنیا کی اور ادیبوں کی خبریں سنایا کرتا اور نہ جانے کیوں، انہوں نے بھی ان لوگوں سے گہری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ ''ب'' کے تنقیدی مضامین

* ''ایدونا''، ایک رومانوی ناول۔ مصنف پالیوائی (۱۷۹۶ء تا ۱۸۴۶ء)۔ (ایڈیٹر)

پڑھنے لگے، جن کے بارے میں میں بہت باتیں کیا کرتا تھا، اگرچہ ان کے تنقیدی مضامین مشکل سے ہی سمجھ پاتے ہوں گے لیکن تعریف بڑے زور شور سے کیا کرتے تھے اور ان کے دشمنوں پر جو رسالہ ''سیویرنی تروتن''* میں لکھا کرتے تھے، بڑے میاں بہت بگڑتے تھے۔

بڑی بی مجھ پر اور نتاشا پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ لیکن پھر بھی ہر ایک شے ان کی نظر میں نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا لفظ ہمارے درمیان کہا سنا جا چکا تھا، اور آخر میں نتاشا نے سر جھکا کر ادھ کھلے لبوں سے بہت دھیمی آواز میں جو ''ہاں'' کہا تھا وہ بھی میں سن چکا تھا۔ بڑے بوڑھوں کو بھی اس کی خبر لگ چکی تھی۔ انہوں نے اس پر سوچ بچار کیا، دماغ لڑایا۔ آننا اندریئونا نے دیر تک سر ہلایا۔ انہیں یہ بات عجیب لگی، وحشت‌ناک معلوم ہوئی۔ میری بات کا انہیں یقین نہ تھا۔

وہ بولیں ''ہاں، اچھا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ اگر آپ کو کامیابی نصیب ہو تو۔ اور اگر ناکامی ہوئی تو کیا ہوگا؟ اچھا ہوتا کہ آپ کہیں نوکری کر لیتے!''

''تو بھئی وانیا، مجھے یہ بات کہنی تھی''، بڑے میاں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا ''دیکھو، مجھے سب معلوم ہے، میں خود دیکھ چکا ہوں اور میں مانتا ہوں کہ اس کی مجھے خوشی ہوئی کہ تم اور نتاشا، یعنی کہ... میرا مطلب سمجھے تم! لیکن وانیا، دیکھو۔ برادر، تم دونوں کم عمر ہو، اور آننا اندریئونا ٹھیک کہتی ہیں۔ ابھی ٹھیرنا چاہئے۔ ٹھیک ہے کہ تم لیاقت رکھتے ہو، بلکہ شاید بہت اچھی لیاقت کے آدمی ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں کہ جینیس یا بےمثل ذہانت کے پتلے ہو جیسے کہ تمہارے بارے میں شروع میں شور مچایا گیا، بس ذہانت ہے۔ (میں نے آج ہی وہ مضمون 'سیویرنی تروتن' میں پڑھا تمہارے بارے میں۔ ان لوگوں نے تو بڑی دھاندلی کی ہے تمہارے ساتھ لیکن

* ۱۸۲۵ء سے ۱۸۶۴ء تک پیٹرسبرگ میں ایک رجعت‌پرست اخبار ''سیویرنیا پچیلا'' (''شمالی شہد کی مکھی'') نکلتا تھا، دستوئیفسکی نے یہاں اس رسالے کو طنزاً ''سیویرنی تروتن'' (''شمالی مفت‌خور'') کا نام دیا ہے۔ (ایڈیٹر)

خیر، وہ پرچہ ہے کس شمار میں۔) ہاں، تو تم جانو وانیا، ذہانت کوئی چیز تو ہے نہیں، جیسے بینک میں رقم ہوتی ہے۔ اور تم دونوں ہی غریب ہو۔ ہمیں ذرا صبر سے کام لینا چاہئے۔ سال، ڈیڑھ سال، سال بھر ہی سہی۔ اگر تمہارا کام ٹھیک سے چل جاتا ہے تب تو خیر، اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤگے، اور نتاشا تمہاری ہی ہوگی، اور اگر تم دیکھو کہ ٹھیک نہیں رہا تو خود ہی فیصلہ کر لو۔ تم آدمی ایمان‌دار ہو... سوچ لینا...،،

چنانچہ اس بات کو ہم نے یہیں چھوڑا۔ پھر سال بھر بعد کیا گزری اس کا بیان آگے آتا ہے۔

ہاں تو ٹھیک ایک سال بعد کی بات ہے۔ ستمبر کا ایک صاف روشن دن تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ میں اپنے ان بوڑھے مہربانوں کے پاس اس حال میں پہنچا کہ بیمار تھا، دل میں بےچینی تھی۔ پہنچتے ہی کرسی پر گر پڑا۔ ان لوگوں نے میری صورت دیکھی تو گھبرا گئے۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور دل تکلیف سے پسا جا رہا تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہونے کے لئے مجھے دس بار کوشش کرنی پڑی تب کہیں دروازے میں قدم رکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں اپنا مستقبل بنانے میں ناکام رہا تھا، یہ بھی وجہ نہ تھی کہ اس عرصے میں نہ تو شہرت ملی تھی اور نہ روپیہ ہاتھ لگا تھا، اور یہ بھی نہیں کہ مجھے اتاشی کا عہدہ میسر نہ آیا تھا اور صحت بہتر کرنے کے لئے اٹلی نہ بھیجا گیا تھا، بلکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ یہ ایک برس دس برس کے برابر گزرا تھا۔ اور بس کیا، میری نتاشا نے بھی اس ایک برس کو ایسے کاٹا تھا جیسے ایک نہیں دس برس ہوں۔ ہمارے درمیان دوری بےپناہ ہو گئی تھی... مجھے یاد ہے کہ میں اندر گیا تو بڑے میاں کے سامنے بیٹھتے ہوئے منہ سے کچھ نہ بول سکا اور بےحس انگلیوں سے اپنے ہیٹ کے کنارے کھرچتا اینٹھتا رہا جو پہلے سے ہی مڑے تڑے تھے۔ میں بیٹھا، نہ جانے کیوں، نتاشا کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ میرا لباس خستہ تھا اور جسم پر فٹ نہ آتا تھا۔ میں دبلا ہو گیا تھا، چہرہ پیلا پڑگیا تھا اور گال پچک گئے تھے۔ اس کے باوجود حلیے میں شاعروں سے مشابہت نہ ہوئی تھی اور نہ آنکھوں میں وہ وقار پیدا ہوا تھا جس کے بارے میں شریف نکولائی سرگیئچ کو سال بھر پہلے اس قدر خیال تھا۔ بڑی بی نے دلی رنج اور

انتہائی اضطراب کے ساتھ میری صورت دیکھی اور جی ہی جی میں سوچا:

''یہ جناب کی حالت ہے اور ہونے چلے تھے نتاشا کے دولھا۔ خدا کی پناہ!،،

''کیوں ایوان پترووچ، تھوڑی سی چائے پئیں گے؟،، (میز پر سماوار سنسنا رہا تھا)۔ ''کہئے کیا حال‌چال ہیں؟،، بڑی بی نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ ہے نا؟،، انہوں نے ایسی دردمند آواز میں سوال کیا کہ اب تک وہ آواز میرے کانوں میں بسی ہے۔

میری آنکھوں میں ان کی صورت ایسی پھر رہی ہے جیسے یہ بھی کل کی بات ہو۔ وہ مجھ سے بات کرتی جا رہی تھیں، مگر آنکھوں سے ایک اور ہی فکر برس رہی تھی۔ وہی فکر جس کے بادل بڑے میاں کے چہرے پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ادھیڑبن میں لگے ہوئے تھے اور چائے کی پیالی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پرنس والکوفسکی سے جو ان کا مقدمہ چل رہا تھا اس سے وہ فی‌الحال بہت پریشان تھے اور اس کے آثار بھی بگڑتے نظر آ رہے تھے۔ اس مستقل پریشانی کے علاوہ کچھ اور نئی فکریں بھی سر آ پڑی تھیں جنھوں نے نکولائی سرگیئچ کو بیماری تک پہنچا دیا تھا۔

چھوٹا پرنس جس کی بدولت وہ سارا جھگڑا ہوا تھا جو مقدمہ‌بازی تک پہنچا، اسے ایک بار کوئی پانچ مہینے پہلے اخمنیف گھرانے کے یہاں جانے کا موقع مل گیا۔ بڑے میاں تو پہلے ہی پیارے الیوشا کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے اور قریب قریب روزانہ ہی اسے یاد کیا کرتے تھے، انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آنا اندریئونا کو واسی‌لیفسکوئے کی یاد آ گئی اور ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ الیوشا اکثر و بیشتر وہاں آنے جانے لگا اور اپنے باپ کی اطلاع کے بغیر۔ نکولائی سرگیئچ نے اپنی نیک‌نیتی، بےتکلفی اور راست‌بازی کے مارے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی آمدورفت کے بارے میں احتیاط برتیں۔ ان میں غیرت کا مادہ اس قدر تھا کہ یہ بھی نہ سوچا: جب پرنس کو پتہ چلے گا کہ بیٹا یوں اس گھرانے میں پھر آنے جانے لگا ہے، تو وہ کیا کہے گا۔ انہوں نے اپنے دل کو سارے فکر و تردد سے پاک کر لیا۔ لیکن بڑے میاں کو یہ

خبر نہ تھی کہ ان میں خود اتنی سکت ہے بھی یا نہیں کہ اور زیادہ توہینوں کا سامنا کر سکیں۔ اب یہ حال ہو گیا کہ چھوٹے پرنس روز روز اخمنیف گھرانے میں پہنچنے لگے۔ نکولائی سرگیئچ اور ان کی بیوی دونوں اس کی آمد پر خوش ہوتے۔ اور وہ بھی ان کے ہاں پوری پوری شام بلکہ رات گئے تک ٹھیرنے لگا۔ جو ہونا تھا وہی ہوا، باپ کو اس کی رتی رتی خبر مل گئی۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ بڑا دلشکن تھا۔ پرنس نے نکولائی سرگیئچ کو ایک خط لکھا جس میں سخت توہین‌آمیز الفاظ استعمال کئے گئے تھے اور وہی پہلے کا الزام دھرایا تھا۔ اسی کے ساتھ فوراً بیٹے کو اخمنیف کے ہاں جانے سے منع کر دیا۔ یہ واقعہ اس روز سے کوئی دو ہفتے پہلے ہو چکا تھا جب میں اس حال میں وہاں پہنچا ہوں۔ نکولائی سرگیئچ بہت دلشکستہ تھے۔ کیا ان کی پیاری نتاشا، ایسی شریف معصوم لڑکی، اسی بےہودہ الزام میں، اس گندگی میں پھر سے آلودہ کی جائےگی؟ اس لڑکی کی تذلیل وہی شخص کر رہا تھا جو باپ کی تذلیل کر چکا تھا۔ کیا یہ سب حرکتیں ایسی ہیں جن سے یوں ہی درگزر کیا جائے، انتقام نہ لیا جائے؟ پہلے چند روز میں فکروں نے انہیں اداس کرکے بستر پر ہی ڈال دیا تھا۔ یہ سب مجھے معلوم تھا۔ سارا قصہ مجھ تک پوری تفصیل کے ساتھ پہنچ چکا تھا اگرچہ تین ہفتے سے میں خود گھر پر بیمار اور مردہ پڑا تھا اور ان لوگوں سے ملنے تک نہ آ سکا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا... مگر نہیں، صرف میرا قیاس تھا۔ مجھے خبر تھی، لیکن دل کو یقین نہ آتا تھا کہ ان پریشانیوں کے علاوہ کوئی اور بات بھی ہے جو ان لوگوں کی اور سب سے زیادہ جان ضیق میں کئے ہوئے ہے۔ اور میں دل مسوستے ہوئے، انہیں بری طرح دیکھ رہا تھا۔ ہاں، میں اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میرا قیاس درست تو نہیں ہے! یقین کرتے ہوئے جی ڈرتا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس مہلک اندیشے کو دماغ سے نکال پھینکوں، اس جانہار لمحے کو دور کر دوں۔ اور نکلا یہ کہ میں اسی کے لئے یہاں پہنچا تھا۔ جیسے اس شام کوئی چیز مجھے یہاں کھینچ کر لائی تھی۔

''میں کہتا ہوں وانیا،، بڑے میاں نکولائی سرگیئچ ایک دم چونک کر بولے ''کہیں تم بیمار تو نہیں رہے؟ اتنے عرصے سے ادھر آئے کیوں نہیں؟ مجھے تم سے معافی مانگنی ہے۔ ایک مدت سے میں خود سوچ رہا تھا کہ تم سے جا کر ملوں۔ لیکن کیا کیا جائے... کچھ ایسی صورت رہی کہ...،، وہ پھر ادھیڑبن میں مبتلا ہو گئے۔

''جی ہاں، میری طبیعت ٹھیک نہیں رہی۔،،

''ہونھ۔ تو طبیعت ٹھیک نہیں،، انہوں نے پانچ منٹ بعد دم لےکر پھر دھرایا ''تو خیریت نہیں رہی۔ دیکھو، میں نے تم سے بات کی تھی اور اس وقت آگاہ کیا تھا لیکن تم میری سنتے نہیں۔ ہونھ! تو وانیا، بھئی، بات یہ ہے کہ سرسوتی کی مورتی چڑھاوے کے بغیر ہی طاق پر دھری رہی ہے۔ اور ایسے ہی دھری رہےگی۔ یہ ہے قصہ۔،،

ہاں تو بڑے میاں موڈ میں نہیں تھے۔ اگر انہیں خود اپنے دل کا زخم نہ بھرنا پڑتا تو ان کے لب پر سرسوتی کی بھوکی مورتی کا ذکر تک نہ آتا۔ میں نے توجہ سے ان کی صورت دیکھی۔ چہرہ پیلا پڑا تھا۔ آنکھیں اجڑی اجڑی تھیں اور ان میں بشکل سوال، کوئی خیال تھا جس کے سلجھانے کی تاب بڑے میاں میں نہ تھی۔ وہ اکھڑے اکھڑے سے تھے اور خلاف معمول نکتہ‌چینی پر آمادہ۔ بیوی بےچینی سے ان کی صورت بار بار دیکھتی تھیں اور سر ہلا دیتی تھیں۔ جب وہ ایک بار مڑے تو آننا اندریئونا نے مجھے آنکھ سے ان کی جانب معنی‌خیز اشارہ کیا۔

''کہیے، نتالیا نکولائیونا کیسی ہیں۔ گھر پر ہیں نا وہ؟،، میں نے فکرمند خاتون سے سوال کیا۔

''ہاں، میرے عزیز ، وہ گھر پر ہی موجود ہے۔ گھر ہی پر ہے،، انہوں نے ایسے جواب دیا جیسے میرے سوال سے کچھ الجھن میں پڑ گئی ہوں۔ ''وہ آپ سے ملنے آتی ہی ہوگی۔ آپ نے بھی کمال کیا۔ بھلا، تین ہفتے بعد آئے ہیں۔ وہ تو بالکل ایسی ہو گئی ہے کہ... اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، بیمار ہے کہ تندرست ہے۔ خدا ہی اس پر اپنا رحم کرے۔،، یہ کہا اور اپنے شوہر کی طرف دبی نظر سے تکنے لگیں۔

''کیوں کیا ہے؟ اسے تو کچھ نہیں ہوا،، نکولائی سرگیئچ

نے فوراً بےصبری اور بےنیازی سے جھٹکا دے کر کہا ''وہ تو اچھی خاصی ہے۔ لڑکی اب بڑی ہونے لگی ہے۔ بچپن چھوٹتا جا رہا ہے۔ اور کیا۔ کون جانے، ان لڑکیوں کے من میں کیا سمائی رہتی ہے؟''

''نہیں، نہیں، من میں سمائے سے کیا واسطہ!'' آننا اندریئونا نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

بڑے میاں منہ سے کچھ نہ بولے اور انگلیوں کی پوریوں سے میز پر طبلہ بجانے لگے۔

''خدا خیر کرے، کہیں ان کے درمیان کچھ گڑبڑ تو نہیں ہو گئی ہے؟'' بدحواسی میں مجھے خیال آیا۔

''اور سنائیے، آپ ادیب لوگوں کے کیا حال‌چال ہیں؟'' انہوں نے نئے سرے سے سوال کیا۔ ''کیا اب بھی 'ب' صاحب اپنی تنقیدیں لکھتے ہیں؟''

''ہاں، لکھتے تو ہیں'' میں نے جواب دیا۔

''افوہ، وانیا، وانیا!'' انہوں نے ہاتھ ہلا کر بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ ''بھلا، اب تنقیدوں سے ہوتا کیا ہے!''

اتنے میں دروازہ کھلا اور نتاشا اندر داخل ہوئی۔

ساتواں باب

وہ اپنی ٹوپی ہاتھوں میں لئے ہوئے تھی، جو اس نے آتے ہی پیانو پر ڈال دی۔ پھر وہ میرے نزدیک آئی اور زبان سے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کے لب ذرا حرکت میں آئے، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو، سلام دعا کرنا چاہتی ہو۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔

ہمیں ملے ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ میں اسے حیرت اور خوف سے تک رہا تھا۔ ان تین ہفتوں میں وہ کس قدر بدل گئی تھی! غم نے میرا دل جکڑ لیا جب میں نے اندازہ کیا کہ اس کا چہرہ کیسا پیلا پڑ گیا تھا، گال کیسے پچک گئے تھے، ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور آنکھیں لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے

سائے میں یوں چمک رہی تھیں جیسے بخار یا کسی سخت جذباتی عزم سے تپ رہی ہوں۔

لیکن، میرے پروردگار، یہ لڑکی اس جانہار دن کس قدر خوب‌صورت لگ رہی تھی۔ میں نے نہ اس سے پہلے کبھی اسے ایسا حسین پایا تھا، نہ اس کے بعد۔ بھلا کیا یہ وہی لڑکی تھی، وہی نتاشا جو صرف سال بھر پہلے میرا ناول سنتے وقت یوں میرا منہ تک رہی تھی اور میرے ساتھ ساتھ ہونٹوں کو جنبش دیتی جا رہی تھی۔ جو اس روز رات کے کھانے پر اپنے باپ سے اور مجھ سے یوں مزے لے لے کر اور بےفکری کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی رہی تھی اور قہقہے لگاتی رہی تھی؟ کیا یہ وہی نتاشا تھی جس نے اس دن وہاں کمرے میں سر جھکا کر جب اس کے گال تمتمائے ہوئے تھے، مجھ سے کہا تھا ''ہاں''۔

اتنے میں گرجاگھر کے گھنٹوں کی بھاری گھن گھن سنائی دی جو لوگوں کو شام کی عبادت کے لئے پکار رہی تھی۔ نتاشا چونک پڑی۔ بڑی بی نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا۔

''نتاشا، تم گرجاگھر جانےوالی تھیں نا۔ تو جاؤ۔ گرجا کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ عبادت شروع ہونےوالی ہے۔ جاؤ۔ عبادت کر آؤ۔ اور پھر گرجا دور بھی تو نہیں ہے۔ تازہ ہوا بھی کھا لوگی ساتھ ہی۔ بند کمرے میں کیوں بیٹھی رہو؟ دیکھو تو کیسی پیلی پڑ گئی ہو تم — جیسے کوئی جن بھوت سوار ہو۔''

''شاید... میں جاؤں‌گی نہیں آج...'' نتاشا نے رک رک کر دبی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی سرگوشی کرتا ہو۔ ''میری طبیعت... طبیعت اچھی نہیں ہے میری...'' اس نے یہ جملہ کہا اور کاغذ کی طرح سفید پڑ گئی۔

''اچھا ہوتا کہ تم چلی ہی جاتیں، نتاشا۔ تم تو خود جانے کو تیار تھیں اور اسی لئے اپنی ٹوپی لے کر آئی تھیں۔ خدا سے دعا کرو۔ نتاشا، دعا کرو کہ خداوند پاک تمہیں تندرستی عطا کرے،'' آننا اندریئونا نے اپنی بیٹی کو ایک بار پھر آمادہ کرنا چاہا۔ وہ اسے ایسی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے اس سے ڈر رہی ہوں۔

''ہاں، ہاں۔ چلی جاؤ۔ ذرا دو قدم چل لوگی''، بڑے میاں نے لقمہ دیا۔ اور انہوں نے بھی بیٹی کو فکرمند نظروں سے دیکھا

”تمھاری ماں ٹھیک کہتی ہیں - ہو آؤ - وانیا تمھیں پہنچا آئے گا -“

مجھے ایسا لگا کہ تلخ مسکراہٹ نتاشا کے لبوں پر دوڑ گئی -

وہ پیانو کے پاس گئی، ٹوپی اٹھائی اور سر پر رکھ لی - اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے - اس کی تمام حرکتوں میں بے اختیاری پائی جاتی تھی، جیسے سب کچھ بے ارادہ سرزد ہو رہا ہو - ماں باپ دونوں غور سے اسے دیکھ رہے تھے -

”خدا حافظ“، اس نے یوں کہا کہ بمشکل سنا گیا -

ماں بولی ”کیوں، میری پیاری، خدا حافظ کیوں؟ کیا فاصلہ بہت ہے؟ بس ذرا ہوا کھانے ہی جانا ہے نا - ذرا دیکھو تو سہی، تم کتنی پیلی پڑ گئی ہو - اف، میں بھول گئی (سب کچھ بھول جاتی ہوں) - میں نے تمھارے لئے تعویذ بنا کے رکھا ہے - اس میں دعائیں سی دی ہیں، میری بچی - کیئف* کی ایک راہبہ نے مجھے پچھلے سال بتائی تھی، بڑی اچھی دعا ہے - ابھی ابھی میں نے وہ دعا اس میں سی دی ہے - اسے گلے میں ڈال لو نتاشا - خداوند پاک تمھیں تندرستی عطا کرے گا - ہمارے پاس تو لے دے کے تمھارا ہی دم ہے -“

ماں نے فوراً کام کاج کی دراز سے نتاشا کی سنہری صلیب نکالی - صلیب کی مالا میں ہی وہ تعویذ ٹنگا ہوا تھا جو نتاشا کی ماں نے بیٹی کے لئے ابھی ابھی تیار کیا تھا -

بیٹی کے گلے میں تعویذ ڈالتے ہوئے اور اس پر اشارے سے صلیب بناتے ہوئے ماں نے کہا ”پہنو، خدا تمھیں صحت دے - ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ ہر رات سونے سے پہلے میں تم پر دعائیں دم کیا کرتی تھی اور تم بھی میرے ساتھ دعا کے الفاظ دھرایا کرتی تھیں اور ایک اب ہے، تم وہ پہلے کی سی نہیں رہیں - خدا تمھاری روح کو چین نہیں دیتا - ہائے، نتاشا، نتاشا، ماں کی دعائیں بھی تمھارے کام نہیں آتی ہیں -“

بوڑھی عورت رونے لگی -

نتاشا نے کچھ کہے سنے بغیر ماں کا ہاتھ چوما اور دروازے

---

* کیئف - یوکرین کا سب سے بڑا شہر (آج کل یوکرینی سوویت سوشلسٹ ریپبلک کا دارالحکومت) - کیئف میں عیسائیوں کی کئی مقدس خانقاہیں واقع تھیں - (ایڈیٹر)

کی طرف ایک قدم بڑھ گئی - لیکن وہ فوراً ہی مڑی اور باپ کے پاس پہنچی - اس کا سانس گویا پھول رہا تھا -

”پاپا آپ بھی دعا دیجئے - اپنی بیٹی کو دعا دیجئے...“ یہ لفظ اس نے ہانپتے ہوئے کہے اور باپ کے سامنے دوزانو ہو گئی -

ہم سب نتاشا کے اس خلاف معمول اور رسمی رکھ رکھاؤ پر عجب طرح جزبز ہو رہے تھے - کئی لمحے تو باپ بھی اسے کھوئے کھوئے دیکھتے رہے -

”نتاشا، میری بچی، میری پیاری بیٹی، میرے ننھے سے فرشتے، یہ سب کیا ہے؟“ آخر وہ رو پڑے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے - ”تمھیں کس بات کا دکھ ہے - دن رات تم کیوں روتی دھوتی رہتی ہو؟ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں - رات رات بھر میری آنکھ نہیں لگتی - جاگتا ہوں اور تمھارے دروازے پر میرے کان لگے رہتے ہیں - مجھے سب کچھ بتا دو، نتاشا - مجھ بوڑھے سے سب کچھ کہہ ڈالو - اور ہم...“

وہ بات پوری نہ کر سکے - انہوں نے بیٹی کو پکڑ کر زمین سے اٹھا لیا اور دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا - نتاشا بے اختیار باپ کے سینے سے چمٹ گئی اور ان کے شانے پر سر رکھ دیا -

”کچھ نہیں، کوئی بات نہیں... بس... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے“، وہ یہی الفاظ دھراتی رہی اور اس کی آواز گھٹے ہوئے آنسوؤں سے بھرا رہی تھی -

”خدا تجھ پر اپنا سایہ رکھے بیٹی، تیرے حق میں میری دعا ہے - میری پیاری بچی، میری عزیز بچی“، باپ نے دعا دی - ”خداوندعالم تجھے روحانی سکون بخشے ہمیشہ کے لئے - تجھے تمام برائیوں سے پاک رکھے - میری جان، خدا سے دعا کر کہ میری دعا اس کے باب اجابت تک پہنچے -“

”اور بیٹی، میری دعائیے برکت بھی تیرے ساتھ ہے - میری دعائیں تیرے ساتھ رہیں“، ماں نے اپنے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا -

”خدا حافظ!“، نتاشا نے سرگوشی کی سی آواز میں کہا -

دروازے پر وہ دم بھر کو پھر اٹکی - مڑ کر ایک نظر اور ماں باپ پر ڈالی - کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی - اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی - میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے -

آٹھواں باب

وہ بالکل خاموش، سر جھکائے، تیز تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ لیکن جب وہ گلی سے نکل کر دریا کنارے کے کھڑنجے پر آ گئی تو اس نے رفتار دھیمی کردی اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

”دم گھٹا جاتا ہے،“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا ”میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ دم گھٹ رہا ہے۔“

”نتاشا واپس چلو!“ میں خوف سے چیخ پڑا۔

”لیکن وانیا، کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ میں ہمیشہ کے لئے نکل آئی ہوں۔ ان کو سدا کے لئے چھوڑ چکی ہوں۔ اب کبھی واپس نہیں جاؤں گی،“ وہ بولی اور میری طرف ناقابل بیان غم سے دیکھا۔

میرا دل ڈوب گیا۔ اس روز شام کو جب میں ان لوگوں کے گھر جا رہا تھا تبھی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ ہوگا۔ بلکہ شاید اس دن سے بہت پہلے آج کے واقعے کی تصویر میری آنکھوں کے آگے پھر چکی تھی دھندلی دھندلی۔ پھر بھی نتاشا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ مجھ پر بجلی بن کے گرے۔

ہم دونوں دریا کنارے کی پٹری پر دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے چلتے رہے۔ مجھ سے بولا نہ جاتا تھا۔ میں سوچے جا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اس صورت‌حال کو ذہن‌نشین کروں۔ اسی فکر میں گم تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ یہ بات اس قدر نامعقول، اس درجہ ناممکن معلوم ہوتی تھی کہ بس۔

”کیا تم مجھے قصوروار سمجھتے ہو وانیا؟“ آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”نہیں لیکن... مگر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے — ایسا تو ہو نہیں سکتا!“ میں نے جواب دیا، خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہہ کیا رہا ہوں۔

”ہاں، وانیا، اب تو یوں ہی ہے۔ میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہوں اور نہیں جانتی کہ ان پر کیا گزرے گی۔ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ خود مجھ پر کیا بیتے گی۔“

”تو کیا تم اس کے پاس جا رہی ہو، نتاشا؟“

”ہاں،“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن یہ بالکل ناممکن ہے!“ میں چیخ پڑا۔ ”تمہاری عقل میں نہیں آتا کہ یہ ناممکن ہے۔ میری بچاری نتاشا، یہ دیوانہ‌پن ہے۔ تم اپنے والدین کو مار ڈالوگی اور خود کو بھی خاک میں ملا دوگی۔ سمجھ رہی ہو اس بات کو تم؟“

”میں جانتی ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ کچھ بن نہیں پڑتی،“ وہ بولی اور اس کے الفاظ میں ایسا درد تھا جیسے وہ سولی پر چڑھنے جا رہی ہو۔

”لوٹ چلو، لوٹ چلو۔ ابھی وقت ہے،“ میں نے اس سے التجا کی۔ اور جتنا مجھے یہ اندازہ ہوتا گیا کہ میری التجا لاحاصل ہے اور اس وقت کہنا سننا بالکل فضول ہے اتنے ہی زور شور سے، اس قدر جوش و خروش سے، شدت سے میں نے اس پر زور ڈالنا چاہا۔ ”نتاشا، سمجھتی ہو، تم اپنے باپ کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہو؟ تمہیں ذرا بھی اس کا خیال ہے؟ سوچا تم نے؟ تمہیں خبر ہے کہ اس کا باپ تمہارے باپ کا دشمن ہے۔ پرنس نے تمہارے باپ کی ذلت کی، ان پر روپیہ غبن کرنے کا الزام لگایا، انہیں چور، بے ایمان کہا۔ تم جانتی ہو کہ ان میں مقدمہ‌بازی ہو رہی ہے؟ کیوں؟ چلو، یہ تو بہت معمولی باتیں ہیں۔ مگر کیا تمہیں معلوم ہے نتاشا (یا خدا، تمہیں تو سب کچھ معلوم ہوگا ہی!) تمہیں خبر ہے کہ پرنس نے تمہارے ماں باپ پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ دونوں اس زمانے میں جب الیوشا تمہارے ساتھ دیہات میں ٹھیرا ہوا تھا، تمہارے اور اس کے درمیان محبت کروانے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ ذرا دم بھر کو سوچو، خیال تو کرو کہ اس الزام کی بدولت تمہارے باپ کو کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دو برسوں میں ان کے بال کیوں سفید ہو گئے۔ ذرا ان کی طرف دیکھو تو۔ اور اصل بات تو یہ ہے — مگر میرے پروردگار، تم سے کہوں کیا — تم تو خود جانتی ہو، نتاشا، میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ تم سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوکر والدین پر کیا گزرے گی۔ کیوں، تم ہی تو ان کی ساری پونجی ہو۔ تم ہی تو لے دے کے رہ گئی ہو ان کے بڑھاپے کا آسرا۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی زبان سے نہ کہوں گا، تم خود

اچھی طرح جانتی ہو۔ ذرا یاد کرو کہ تمھارے پاپا کو یہ خیال ہے کہ بے وجہ تمھاری بدنامی کی گئی ہے، ان بددماغوں نے تمھارے خلاف بلاوجہ الزام لگائے ہیں اور اس کا بدلہ نہیں لیا گیا۔ اور اب خاص انہی دنوں پھر آگ بھڑک اٹھی ہے۔ وہی پرانی دشمنی پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ الیوشا کا تمھارے گھر میں آنا جانا ہوا۔ پرنس نے پھر تمھارے پاپا کی تذلیل کی۔ بڑے میاں کے تن بدن میں اس نئی بےہودگی پر آگ لگی ہوئی ہے اور اب اوپر سے یہ سب ہوگا تو سوچ لو کہ سارے الزام جو لگائے جا چکے ہیں، سچ ہو جائیں گے۔ ہر شخص جسے یہ قصہ معلوم ہے پرنس کی ہی تائید کرے گا اور تم کو اور تمھارے باپ کو قصوروار گردانے گا۔ تو پھر کیا ہوگا، ان کا؟ ان پر کیا بیتے گی؟ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے وہ۔ شرمندگی، ذلت، رسوائی اور کس کے ہاتھوں؟ تمھارے ہاتھوں، خود اپنی چہیتی بیٹی کے ہاتھوں۔ اور تمھاری ماں کا کیا حشر ہوگا؟ وہ تمھارے بوڑھے باپ کے بعد جی نہیں سکتی ہیں۔ نتاشا! نتاشا یہ کیا کر رہی ہو؟ لوٹ چلو! ہوش میں آؤ!،،

وہ چپ رہی۔ بالآخر اس نے مجھ پر گویا ایک ملامت بھری نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں کیسا درد بھرا تھا، دل کے ٹکڑے کر دینے والا! اس قدر دکھ تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ اس کے زخمی دل سے پہلے ہی لہو ٹپک رہا تھا اور میرے الفاظ نے اس پر نمک پاشی کی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا فیصلہ خود اسے کتنا مہنگا پڑا ہے اور میں اوپر سے اپنے فضول اور بعد از وقت الفاظ بھونک بھونک کر دکھی کر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ میں سمجھ گیا لیکن اس پر بھی باز نہ آیا اور بولتا ہی چلا گیا:

''ہاں — ذرا دیکھو، تم نے ابھی ابھی تو اپنی امی سے کہا تھا کہ شاید تم گھر سے باہر ہی نہ جاؤ... گرجا گھر کو۔ یہی مطلب تھا نا تمھارا کہ گھر میں رہوگی — یہی نا کہ تم نے ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کیا تھا؟،،

وہ اس کے جواب میں تلخی سے مسکرائی۔ بھلا میں نے اس سے سوال ہی کیوں کیا؟ خود سمجھ لیتا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ مگر میں بھی اپنے حواس میں نہیں تھا۔

''تو کیا تم اس سے اس قدر بےپناہ محبت میں گرفتار ہو

گئی ہو؟،، میں چیخ کر بولا۔ اور ڈوبتے ہوئے دل سے اسے دیکھا۔ میری سمجھ میں مشکل سے آ رہا تھا کہ اس سے پوچھ کیا رہا ہوں۔

''وانیا، میں تمھیں کیا بتاؤں؟ تم جانو، اس نے مجھ سے آنے کو کہا اور میں یہاں موجود ہوں۔ اس کا انتظار کر رہی ہوں،، نتاشا نے اسی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بات کا جواب دیا۔

''مگر سنو تو سہی۔ سنو،، میں پھر اس سے التجا کرنے لگا۔ تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ابھی اس کا چارہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے طریقے سے انتظام کیا جا سکتا ہے۔ بالکل دوسری قسم کی تدبیر ہو سکتی ہے۔ تمھیں گھر چھوڑ کر نکل جانے کی ضرورت نہیں۔ نتاشا! میں بتاؤں کیا کرنا چاہئے۔ تمھاری خاطر یہ ذمہ خود میں اپنے سر لیتا ہوں کہ تمھاری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور سب ٹھیک ہو جائے، سب کچھ۔ صرف اتنی عرض ہے کہ گھر نہ چھوڑو... میں تمھارے خط پہنچایا کروں گا۔ کیوں نہیں! تم جو اس وقت کر رہی ہو اس سے وہ بہتر رہے گا بہرحال۔ میں اس کی سبیل کر دوں گا۔ تم دونوں مزے میں رہوگے۔ دیکھ لینا۔ اور پھر تم بربادی سے بھی بچ جاؤگی نتاشا، یہ جو تم خود کو برباد کرنے پر تلی ہو... اس طرح سے خود کو خاک میں ملا لوگی — جانتی ہو تم؟ مان جاؤ نتاشا — سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کام ٹھکانے سے چلیں گے۔ جتنا تمھارا جی چاہے تم دونوں ایک دوسرے سے جی بھر کے محبت کرو۔ اور جب تم دونوں کے باپ جھگڑے سے نمٹ جائیں (ایک نہ ایک دن تو بہرحال یہ قضیہ نمٹنا ہی ہے) — تو پھر...،،

''بس وانیا — بس کرو،، اس نے بیچ میں ٹوک کر مجھے چپ کر دیا، اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر آنسوؤں کی زبانی مسکرانے لگی۔ ''پیارے اچھے وانیا، تم بہت اچھے، بہت شریف آدمی ہو۔ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتے! میں نے ہی تمھیں پہلے دغا دی اور پھر بھی تم مجھے بالکل معاف کئے ہوئے ہو۔ تمھیں میری خوشی کے سوا اور کسی بات کا خیال ہی نہیں۔ تم ہمارے خط تک لانے لے جانے کو تیار ہو...،،

وہ رونے لگی۔

''مجھے علم ہے کہ تم مجھ سے کس قدر محبت کرتے تھے، وانیا، اور آج بھی مجھے چاہتے ہو۔ اور کبھی اس عرصے میں

تم نے ایک حرف ملامت زبان سے نہ نکالا۔ اور ایک میں ہوں... اف پروردگار! میں تمہارے آگے کس درجہ قصوروار ہوں۔ یاد ہے تمہیں وانیا، وہ وقت یاد ہے جو ہم نے تم نے ساتھ گزارا؟ اچھا ہوتا کہ میں اس سے کبھی ملی ہی نہ ہوتی، اس سے جان پہچان ہی نہ ہوتی۔ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارتی، پیارے، میرے اچھے وانیا، بس تمہارا ساتھ ہوتا۔ نہیں — نہیں۔ میں تمہارے قابل ہی نہیں ہوں۔ دیکھو تو میں کیسی ہوں کہ بھلے دنوں کی یاد تمہارے ذہن میں تازہ کر رہی ہوں اور وہ بھی ایسے کڑے وقت جب تم خود بھی کچھ کم پریشان نہیں ہو۔ یہ کیا کیا کہ تین ہفتے سے ہمارے یہاں نہیں آئے — قسم کھاکے کہتی ہوں وانیا، کہ ایک بار مجھے خیال تک نہ آیا اس بات کا کہ تم مجھ سے نفرت کروگے یا مجھ پر لعنت ملامت کروگے۔ مجھے خبر تھی کہ تم دور دور کیوں رہے ہو۔ تم ہمارے بیچ میں رکاوٹ بن کر اور جیتی‌جاگتی ملامت بن کر نہیں آنا چاہتے تھے۔ اور اگر ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھتے تو کیا تمہارے لئے یہ کچھ کم دکھ کی بات ہوتی؟ مگر میں، وانیا، تمہارا کیسا بےچینی سے انتظار کرتی رہی۔ کیسی راہ دیکھتی رہی۔ وانیا، سنو۔ اگرچہ میں الیوشا سے ایسی دیوانہ‌وار محبت کرتی ہوں لیکن اس کے باوجود شاید تمہارا پیار ایک دوست کی حیثیت سے میرے دل میں اور بڑھ گیا ہے۔ میں جانتی ہوں، خوب سمجھتی ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی اجیرن ہو جائےگی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے دل کی ضرورت ہے۔ تمہاری سنہری روح کی ضرورت ہے۔ ہائے وانیا — کیسا تلخ، کیسا کٹھن وقت آ رہا ہے!"

اشکوں کا طوفان اس کی آنکھوں سے امنڈ پڑا۔ واقعی اس پر بہت کڑی گزر رہی تھی۔

"ہائے، مجھے تم سے ملنے کی کس قدر بےتابی تھی وانیا!" وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولتی گئی۔ "تم کیسے دبلے ہو گئے ہو۔ کیسے بیمار نظر آتے ہو۔ پیلے پڑ گئے۔ کیا واقعی تم بیمار تھے وانیا؟ میں نے تمہاری مزاج پرسی تک نہ کی۔ خود اپنی ہی باتیں کرتی رہی۔ اخباروالوں سے کیسی ہٹ رہی ہے؟ کچھ اپنے نئے ناول کے بارے میں بتاؤ۔ ٹھیک چل رہا ہے نا؟"

"نتاشا، کیا اس وقت ہمیں اپنی اور اس ناول کی باتوں کی پڑی ہے؟ جیسے میرے معاملات کی کوئی حیثیت ہو۔ ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائےگا۔ مجھے تم یہ بتاؤ نتاشا کہ کیا خود اس نے تم سے تقاضا کیا کہ اس سے ملنے جاؤ؟"

"نہیں۔ اسی نے نہیں بلکہ زیادہ‌تر میں نے خود۔ اس نے کہا تو ضرور تھا کہ میں ملنے کے لئے نکلوں مگر میں خود بھی... تم جانو پیارے کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں‌گی: ایک اور لڑکی ہے جس سے الیوشا کی نسبت کی جا رہی ہے۔ لڑکی اونچے گھرانے کی ہے۔ مالدار ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے رشتہ‌داری بتائی جاتی ہے۔ الیوشا کے باپ کی ضد ہے کہ بیٹا اس سے شادی کرلے۔ اور باپ کو تو تم جانتے ہو — وہ ایک ہی چال‌باز آدمی ہے۔ اس نے سارے جتن کرلئے ہیں۔ اب یہ ایک ایسا موقع غنیمت ہے جو دس برس میں بھی کبھی نصیب نہ ہوگا... رشتہ‌داریاں، روپیہ پیسہ... پھر یہ بھی بتاتے ہیں کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے، تعلیم‌یافتہ بھی ہے، نیک‌دل بھی ہے — یعنی اس میں ہر قسم کا گن موجود ہے۔ الیوشا پہلے ہی سے اس کی طرف کھنچا ہوا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ باپ کو فکر ہے کہ بیٹے کا معاملہ طے کردے تاکہ اس کے بعد خود شادی رچا سکے۔ چنانچہ وہ ہم دونوں کے تعلقات کا خاتمہ کرنے پر اتر آیا ہے۔ مجھ سے اور الیوشا پر جو میرا اثر ہے اس سے وہ ڈرتا ہے..."

"تو کیا تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پرنس کو تم دونوں کی محبت کا پتہ ہے؟" حیرت سے میں نے اس کی بات کاٹی۔ "اسے تو صرف اس بات کا شبہ ہی شبہ تھا اور وہ بھی کچھ یوں ہی سا۔"

"نہیں، اسے سب معلوم ہے۔ تمام باتیں معلوم ہیں۔"

"کیسے — اسے کس نے بتا دیا؟"

"الیوشا نے، کچھ دن گزرے، باپ کو سب کچھ بتا دیا۔ خود مجھ سے الیوشا کہہ‌چکا ہے کہ اس نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"خدا کی پناہ — یعنی یہ ہو کیا رہا ہے۔ الیوشا نے باپ سے سب کچھ کہہ دیا اور وہ بھی ایسے وقت!"

"وانیا، اسے الزام نہ دو" نتاشا بول پڑی "اس پر جملہ نہ کسو۔ دوسروں کی طرح الیوشا پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ انصاف

سے کام لو۔ وہ مجھ جیسا، تم جیسا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو بالکل بچہ ہے۔ اس کی پال‌پوس ایسی ہی ہوئی ہے۔ کیا وہ خود اندازہ کرسکتا ہے کہ کیا کر رہا ہے؟ اس کے ذہن پر پہلا نقش، پہلا آدمی جس سے وہ ملے اس کا اثر الیوشا کو منٹ بھر پہلے کے عہدوپیمان سے پھیر دے گا۔ اس میں کردار کی مضبوطی نہیں ہے۔ وہ قسم کھاکر کہے گا کہ آپ کے ساتھ سچا رہے گا لیکن اسی روز وہ اسی صداقت اور ایمان‌داری کے ساتھ، اسی خلوص کے ساتھ کسی اور کا ہو رہے گا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ خود آپ کے پاس پہنچے گا اور سب کچھ بتا دے گا۔ وہ کوئی بڑی بری حرکت کر سکتا ہے لیکن پھر بھی اس کو ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ اس پر صرف ترس کھایا جا سکتا ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے کہ ایثار بھی کر سکتا ہے۔ اور کیسا ایثار، کتنی بڑی قربانی! لیکن یہ قربانی اگلے ذہنی اثر تک تو رہے گی اور اس کے بعد ذہن سے بالکل نکل جائے گی۔ تو یوں سمجھو کہ اگر میں مستقل اس کے پاس نہ رہوں تو وہ مجھے بھی بھلا بیٹھے گا۔ وہ اسی قسم کا آدمی ہے۔،،

”ہائے نتاشا، ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ درست نہ ہو، صرف سنی سنائی بات نکلے، بھلا ایسا لڑکا، اتنا کم‌عمر اور اس کی شادی ہو جائے گی؟،،

”اس کے باپ کی اپنی کچھ مصلحتیں ہیں خاص۔ میں تم سے کہتی تو ہوں۔،،

”مگر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایسی خوبصورت ہے اور وہ بھی اس کی طرف کھنچا ہوا ہے؟،،

”بھئی اس نے خود ہی مجھے بتایا ہے۔،،

”کیا معنی، اس نے خود بتا دیا کہ وہ دوسری عورت سے پیار کر سکتا ہے اور پھر تم سے ایسی قربانی طلب کرنے چلا ہے؟،،

”نہیں وانیا، نہیں، تم اسے بالکل نہیں سمجھتے ہو۔ تمہارا اس سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا۔ اسے پرکھنے سے پہلے اور زیادہ سمجھنا ہوگا۔ دنیا میں اس کے دل سے بڑھ کر سچا اور پاکیزہ دل ہو نہیں سکتا۔ کیوں؟ کیا یہ اچھا ہوتا کہ وہ جھوٹ بول دیتا؟ مکر جاتا؟ اور دوسری لڑکی کی طرف کھنچنے کو کیا ہوا۔ اگر وہ ہفتہ بھر مجھ سے نہ ملے تو وہ مجھے بالکل بھلا بیٹھے گا

اور اسی کا ہو رہے گا لیکن بعد میں جب مجھ سے پھر آنکھیں چار ہوں گی تو پھر میرے قدموں پر آ رہے گا۔ نہیں، یہ اچھا ہی ہے کہ مجھے اس بات کی خبر ہے اور مجھ سے راز نہیں رکھا گیا۔ ورنہ شک‌وشبہ مجھے مار ہی ڈالتا۔ ہاں، وانیا، میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اگر ہمیشہ، ہر لمحے اس کے دم کے ساتھ نہ رہوں تو وہ ایسا آدمی ہے کہ میری محبت اس کے دل سے نکل ہی جائے گی، وہ مجھے بھول جائے گا اور چھوڑ دے گا۔ وہ ایسا شخص ہے کہ کوئی عورت بھی اسے لبھا سکتی ہے۔ اور پھر میں کیا کروں گی؟ تب تو میں مرہی جاؤں گی — بالکل مر جاؤں گی۔ میری اب جان ہی نکل جائے تو خوش ہوں۔ لیکن اس کے بغیر، اس کے بغیر جینا کیسا؟ یہ تو موت سے بھی بدتر ہوگا۔ اس سے بڑھ کے اور کوئی غم مجھے نہیں ہو سکتا۔ ہائے وانیا، وانیا! آخر کوئی بات تو ہے کہ میں نے اس کی خاطر اپنے باپ کو چھوڑ دیا، اپنی ماں کو چھوڑ دیا۔ اب کچھ کہو سنو نہیں، جو فیصلہ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو اسے ہر وقت، ہر لمحے میرے پاس ہونا چاہئے۔ میں واپس نہیں جا سکتی۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ میں نے خود کو تباہ کر لیا اور دوسروں کو بھی تباہ کرنے پر تلی ہوں... ہائے وانیا!،، وہ اچانک چیخ پڑی اور سارے بدن سے تھرتھر کانپنے لگی۔ ”کیا ہو جو وہ سچ مچ میری محبت سے ہاتھ اٹھا چکا ہو! ہائے کیا ہو اگر وہ بات سچ نکلے جو تم نے ابھی اس کے بارے میں کہی ہے،، (میں نے تو کچھ بھی نہ کہا تھا) ”کہ وہ مجھے صرف دھوکا دے رہا ہے، کہ وہ صرف ظاہر میں سچا اور کھرا ہے ورنہ اندر سے تو جھوٹا اور خودپسند ہے۔ میں تو یہاں کھڑی اس کی طرف سے صفائی دے رہی ہوں تمہارے سامنے، اور کون جانے جو وہ عین اسی وقت کسی اور عورت کے ساتھ بیٹھا جی ہی جی میں ہنس رہا ہو... اور میں، میں بھی کیا نیچ عورت ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل آئی اور سڑک پر اس کے انتظار میں چلی جا رہی ہوں... ہائے وانیا!،،

اس کے دل سے ایسی الم‌ناک آہ نکلی کہ میری ساری روح غم سے تھرا گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ نتاشا کو اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہا ہے۔ صرف ایک اندھی انتہائی پاگل‌پن کا حسد تھا جس نے نتاشا کو اس دیوانہ‌وار فیصلے پر پہنچا دیا

تھا۔ لیکن اب میری باری تھی۔ میرے سینے میں بھی رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور میں پھٹ ہی تو پڑا۔ مجھ سے اور ضبط نہ ہو سکا، یہ ناپاک جذبہ مجھے بہا لے گیا۔

’’نتاشا، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خود تم نے ابھی ابھی جو اس کے بارے میں کہا ہے، وہ رائے رکھتے ہوئے بھی تم اس سے محبت کرتی ہو۔ تمہارے دل میں اس کی عزت نہیں، بلکہ اس کی محبت کا یقین تک نہیں تمہیں اور اس پر بھی آنکھیں بند کئے اس کے پاس چلی جا رہی ہو اور اس کی خاطر ہر ایک کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ آخر اس کے کیا معنی؟ وہ تمہیں ایسی مصیبت میں ڈالے گا کہ عمر بھر بھگتوگی اور خود اسے بھی تم عذاب میں مبتلا کروگی۔ تم اس سے بہت محبت کرتی ہو۔ بہت زیادہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسی محبت ہے!،،

’’ہاں، ہاں میں اس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہوں،، اس نے جواب دیا اور وہ دکھ کے مارے پیلی پڑ گئی۔ ’’وانیا، میں نے تم سے کبھی ایسی محبت نہ کی۔ ہاں، مجھے خبر ہے کہ حواس کھو بیٹھی ہوں۔ اور میں جو اسے پیار کرتی ہوں یہ بالکل خبط ہے۔ جس طرح سے میں اسے چاہتی ہوں وہ اچھی بات نہیں ہے... مگر، سنو وانیا، مجھے پہلے سے اندازہ تھا بلکہ سب سے زیادہ مسرت بھرے لمحوں میں بھی میں نے یہی سوچا کہ وہ مجھے سوائے دکھ کے کچھ نہ دے گا۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے، بتاؤ کہ اس کی ذات سے جو دکھ اور ستم بھی ہوگا وہ مجھے اب راحت اور کرم ہی لگتا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں جو اس کی طرف چلی ہوں تو خوشی حاصل کرنے کے لئے چلی ہوں؟ کیا تمہیں گمان ہے کہ مجھے پہلے سے پتہ نہیں کہ کیا پیش آنے والا ہے اور اس کے ہاتھوں مجھے کیا ملے گا؟ یوں تو خیر، اس نے بڑے دعوے محبت کے کر رکھے ہیں اور طرح طرح کے وعدے بھی کئے ہیں۔ مگر مجھ سے پوچھو تو مجھے ایک کا بھی اعتبار نہیں۔ اس کے وعدوں کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ اور نہ تھی۔ اگرچہ میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ بلکہ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ خود میں نے، میں نے ہی اس سے کہہ دیا کہ کسی طرح بھی اسے پابند نہیں

کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ یہی رویہ ٹھیک بھی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی خود کو پابند کرنا پسند نہیں کرتا اور میں تو بالکل نہیں چاہوں گی۔ اس کے باوجود اس کی کنیز ہو جاؤں، بندۂ بے دام بن جاؤں تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں خوشی سے سب کچھ سہہ لوں گی، سب کچھ، صرف اس شرط پر کہ وہ میرے دم کے ساتھ ہو۔ اور میں اسے دیکھتی رہوں۔ بلکہ اگر وہ دوسری عورت سے بھی محبت کئے جائے تو میں نہ روکوں گی، البتہ یہ کہ میں بھی اس کے نزدیک رہوں۔ کیا یہ ذلیل بات نہیں ہے؟ وانیا؟،، اس نے پوچھا اور ایک دم مجھے جلتی اور سوجی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ لمحے بھر کو ایسا لگا جیسے اس پر سرسامی کیفیت طاری ہے۔

’’اس طرح کی ترنگیں ضرور ذلیل ہیں، ہیں نا؟ تو پھر کیا؟ میں خود کہتی ہوں کہ ہاں یہ گری ہوئی بات ہے۔ تاہم اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دے تو میں زمین کے آخری سرے تک اس کے پیچھے دوڑوں گی۔ اگر وہ مجھے جھڑک دے گا، مجھے دھتکار دے گا تب بھی باز نہ آؤں گی۔ اور ایک تم ہو کہ مجھے گھر واپس چلنے پر راضی کرنے کی کوشش میں ہو۔ مگر اس کا حاصل کیا؟ اگر میں اس وقت مان بھی جاؤں تو کل پھر نکل کھڑی ہوں گی۔ وہ مجھ سے آنے کے لئے کہے گا اور میں آ جاؤں گی۔ وہ مجھے پکارے گا، سیٹی بجائے گا، بس ایسے ہی جیسے کسی کتے کے لئے بجائی جاتی ہے اور میں دوڑی دوڑی اس کے پاس پہنچ جاؤں گی... کیا عذاب ہے! وہ مجھ پر جو چاہے ستم ڈھائے میں اس سے بھاگنے والی نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ستم اس کا ڈھایا ہوا ہے۔ ہائے یہ ایسی بات ہے کہ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی، وانیا!،،

’’اور اس لڑکی کے ماں باپ کا کیا ہوگا؟،، میں نے جی میں سوچا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل ہی بھول گئی ہے۔

’’اس پر بھی وہ تم سے شادی تو نہیں کرنے والا، نتاشا؟،،

’’اوہ، اس نے شادی کا وعدہ تو ضرور کیا ہے۔ سب کچھ وعدہ کر رکھا ہے۔ اور اسی لئے مجھے بلایا ہے کہ ہم کل چپکے سے شادی کر لیں گے بستی سے باہر جا کر۔ ہاں البتہ اسے خود نہیں معلوم کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اسے یہ بھی پتہ نہ ہو کہ شادی کا انتظام کیسے کیا جاتا ہے اور وہ خود شوہر کیسا رہے گا۔ واقعی یہ بات نہایت مہمل ہے۔ اور

اگر وہ مجھ سے شادی کرلے تو مصیبت میں پڑجائے گا اور مجھ پر لعنت ملامت شروع کردے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ دن آئے جب وہ مجھ پر کسی بات کی وجہ سے ملامت کرے۔ میں تو اس کی خاطر سب کچھ تج دوں گی۔ وہ چاہے میرے لئے کچھ کرے نہ کرے! بھلا اگر شادی سے اس کی خوشیاں چھن جاتی ہوں تو چھینی ہی کیوں جائیں؟،،

،،نہیں، یہ حرکت صرف پاگل پن کی ہے نتاشا، تو کیا تم سیدھی اسی وقت اس سے ملنے جا رہی ہو؟،،

،،نہیں، اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے یہاں لینے آئے گا — ہم دونوں نے یہی طے کیا تھا...،،

اور اس نے دور انتظار بھری نظر سے دیکھا مگر کسی کا پتہ نہ تھا۔

،،ابھی تک اس کا پتہ نہیں ہے اور تم ہو کہ پہلے ہی آ پہنچیں!،، میں چیخ کر تحقیر سے بولا۔ نتاشا ایسے لڑکھڑا گئی جیسے کوئی ضرب پڑی ہو۔ اس کا چہرہ شدت کرب سے اینٹھ گیا۔

،،ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل آئے ہی نہیں،، اس نے کڑوی مسکراہٹ سے کہا۔ ،،پرسوں اس نے مجھے لکھا تھا کہ اگر میں آنے کا وعدہ نہیں کروں گی تو وہ اپنے منصوبے سے پھرنے پر آمادہ ہو جائے گا — منصوبہ کیا کہ یہاں سے نکل کر وہ مجھ سے شادی کرلے۔ اور اس کا باپ اسے ہونے والی دولھن سے ملانے لے جائے گا۔ اس نے یہ بات ایسی سادگی سے، ایسی بےساختگی سے لکھ دی تھی گویا کوئی بات ہی نہیں ہے... کیا ہو، وانیا، اگر وہ واقعی اس لڑکی سے ملنے چلا گیا ہو؟،،

میں نے کچھ جواب نہ دیا، اس نے میرا ہاتھ زور سے جھنجوڑا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

،،وہ اسی لڑکی کے پاس ہوگا،، نتاشا نے سینے سے یہ بات بمشکل لبوں تک پہنچائی۔ ،،اس نے سوچا ہوگا کہ میں آؤں گی ہی نہیں اور پھر وہ اس لڑکی کے پاس چل دے گا اور کہنے کو ہو جائے گا کہ یہ خود میری ہی خطا ہے۔ اور وہ تو پہلے ہی جتا چکا تھا کہ نہیں آؤں گی تو وہ چل دے گا۔ نہیں آئی تو وہ چل دیا۔ وہ مجھ سے اکتا چکا ہے اور رکھائی برتنے لگا ہے۔ ہائے، میرے پروردگار! میں پاگل ہو گئی ہوں۔ یہ کیا ہے۔ اس نے ابھی

پچھلی بار مجھ سے کہا کہ وہ اکتا چکا ہے مجھ سے۔ تو پھر مجھے اب انتظار کس کا ہے؟،،

،،لو — وہ رہا!،، میں زور سے چیخا۔ کچھ دور دریا کے کنارے پٹری پر اتفاق سے وہ مجھے نظر آ گیا۔

نتاشا چونک پڑی، ہانپنے لگی۔ اپنی طرف بڑھتے ہوئے الیوشا کی جانب وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی اور ایک دم میرا ہاتھ چھوڑ کر اس کی طرف لپکی۔ اس نے بھی اپنے قدم تیز کردئے اور لمحے بھر بعد وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔ سڑک پر شاید ہی ہمارے علاوہ کوئی اور موجود ہو۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو خوب چوما، ہنسے۔ نتاشا ہنسی بھی، روئی بھی ساتھ ساتھ۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں بےاندازہ جدائی کے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ نتاشا کے پیلے رخساروں پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر بےخودی کی کیفیت طاری تھی۔ الیوشا کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ فوراً میری طرف بڑھا۔

نواں باب

میں نے اس بار الیوشا کو نظر بھر کے دیکھا اگرچہ اس لمحے سے پہلے بھی میں کئی بار اس کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا کہ شاید ان آنکھوں کی جھلک ان اسباب کا کچھ پتہ دے سکے جنھوں نے مجھے حیرت‌زدہ کر دیا ہے۔ شاید یہاں سے راز مل سکے کہ اس لڑکے نے نتاشا پر کیا جادو کیا اور اسے دیوانہ‌وار محبت میں مبتلا کر دیا، ایسی محبت جس نے نتاشا کو اس کے اولین فرائض بھلا دینے پر اور بےنیازی کے ساتھ ان سب چیزوں کی قربانی دینے پر مجبور کر دیا جو اب تک اسے اس قدر عزیز تھیں۔ صاحب‌زادے نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر تپاک سے دبائے۔ اس کی نظر ایسی شریفانہ اور روشن تھی کہ سیدھی میرے دل میں اتر گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکے کے بارے میں جو میرے کلیے ہیں ان میں غلطی ہو سکتی ہے صرف ایک وجہ سے کہ وہ

میرا رقیب ہے۔ ہاں، واقعی، مجھے وہ پسند نہیں تھا اور میں یہ مانتا ہوں کہ میں کبھی اسے پسند کرنے پر مائل نہ ہو سکتا تھا اور میں اس معاملے میں اکیلا آدمی ہوں گا ان تمام لوگوں میں جو اسے جانتے ہیں۔ اس کے اندر جو خصوصیات تھیں ان میں سے کئی مجھے ناپسند تھیں اور اس ناپسندیدگی پر مجھے قابو نہ تھا۔ مثلاً یہی اس کی وضع قطع کی دل کشی اور ممکن ہے یہ بات خاص طور سے مجھے اس لئے بھی ناپسند رہی ہو کہ وضع قطع حد سے زیادہ تھی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس سلسلے میں بھی میری پرکھ تعصب سے پاک نہ تھی۔ وہ دراز قد، چھریرے بدن کا اور خوش‌وضع نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ ستوان تھا اور ہمیشہ چمپئی رہتا تھا۔ بالوں کا رنگ اجلا، آنکھیں بڑی بڑی، نرم و نازک، خواب آلود اور نیلی، جن میں بار بار لڑکپن کی سی بےاختیار بشاشت جھلک اٹھتی تھی۔ تنگ اور نفیس تراش کے دہانے میں بھرے بھرے سرخی مائل ہونٹ ہمیشہ ایک گمبھیرپن کا لہریا لئے رہتے تھے، جس کی بدولت مسکراہٹ میں ایک عجیب سی اچانک قسم کی رجھانےوالی دل کشی پیدا ہو جاتی تھی اور مسکراہٹ ان لبوں پر ایک دم نمودار ہوتی تو ایسی معصوم اور بےتکلف ہوتی کہ چاہے آپ کسی موڈ میں ہوں لیکن بےاختیار جی چاہے کہ فوراً جواب میں ایسی ہی مسکراہٹ پیش کر دیں۔ لباس میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ اہتمام نہ کرتا تھا بلکہ ہمیشہ خوش‌وضعی ملحوظ رکھتا تھا۔ اور صاف دیکھنے سے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ لباس کی اس نفاست میں تکلف نہیں برتا گیا بلکہ یہ خداداد چیز ہے۔ درست ہے کہ اس نوجوان میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ یعنی کچھ ایسی عادتیں جو دوسروں کو کھل جاتی ہیں اور اوپر کی اشرافیہ کی خصوصیات ہیں مثلاً من‌موجی‌پن، خودپسندی اور مہذب ڈھٹائی۔ لیکن وہ بذات خود اس قدر صاف گو اور سادہ دل تھا کہ ان کمزوریوں پر سب سے پہلے خود ہی اپنے آپ کو الزام دیتا اور ان کا اعتراف کرکے ہنس دیا کرتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ نوجوان کبھی اشارتاً بھی جھوٹ نہ بول سکتا تھا۔ اور اگر کبھی جھوٹی بات اس کے منہ سے نکل جاتی تو اسے شبہ بھی نہ گزرتا کہ غلط بات کہی گئی ہے۔ اور تو اور اس کی خودپسندی بھی ایک طرح سے اس میں کشش کا باعث بن گئی تھی شاید اس

لئے کہ وہ چھپی ہوئی نہیں بلکہ کھلی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ وہ نرم و نازک، دوسروں پر اعتماد کر لینے والا اور رقیق‌القلب نوجوان تھا۔ قوت‌ارادی تو اس میں تھی ہی نہیں۔ اسے دھوکا دینا یا دکھ پہنچانا ایسا ہی جرم یا بےرحمی ہوتی جیسے کسی بچے کو دھوکا دینا یا دکھ پہنچانا۔ اپنی عمر کے باوجود وہ اس قدر بھولا تھا کہ اصل زندگی کی اسے خبر ہی نہ تھی۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ عمر عزیز کے چالیس سال گزار کر بھی وہ اسی قدر بھولا رہتا۔ اس قسم کے لوگوں کو کہنا چاہئے کہ ساری عمر ہی عنفوان شباب کا کچاپن مقدر ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی انسان ہو جو اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ وہ خود ہی آپ کے پہلو میں بچے کی طرح مچل جاتا۔ نتاشا نے سچ کہا تھا — اگر کوئی مجبوری ہی آ پڑتی اور کسی اثر سے مجبور ہوکر کوئی بری حرکت کر بیٹھتا، تو کر سکتا تھا لیکن بعد میں جب اسے اپنی غلطی کے نتیجے کا احساس ہوتا تو وہ پچھتاوے میں جان دے دیتا۔ نتاشا نے فطری طور پر یہ بھانپ لیا تھا کہ وہ اسے اپنے قابو میں کر لےگی اور جیسے چاہےگی چلائےگی اور وہ اس کا شکار ہو جائےگا۔ نتاشا نے پہلے سے ہی اس لطف کا اندازہ کر لیا تھا جو ٹوٹ کر محبت کرنے میں آتا ہے اور سمجھ لیا تھا کہ جسے پیار کیا جائے اسے صرف محبت سے ستانے میں کیا مزا آئےگا، اور یہی وجہ رہی ہوگی جو نتاشا نے پہلے خود کو اس پر قربان کر دینے میں اتنی جلدی کی۔ لیکن الیوشا کی آنکھوں میں بھی محبت موج‌زن تھی۔ اور وہ نتاشا کو پیار کے نشے میں چور آنکھوں سے تک رہا تھا۔ نتاشا نے مجھے فتح‌مند نظر سے دیکھا۔ اس لمحے وہ اور سب کچھ بھول گئی — اپنے والدین، ان سے جدائی، اپنے شکوک... وہ اس وقت خوش تھی۔

”وانیا!“، وہ زور سے چلائی ”میں نے ان کے ساتھ ناانصافی کی، میں ان کے قابل نہیں ہوں۔ الیوشا، میں سمجھی تم آؤگے ہی نہیں۔ میری بدگمانی معاف کر دو، وانیا! میں اس کا کفارہ ادا کر دوں‌گی!“، اس نے کہا اور الیوشا کو بےپناہ محبت کی نظر سے دیکھا۔ اس نے مسکرا کر نتاشا کا ہاتھ چوم لیا اور اس کا ہاتھ تھامے تھامے وہ میری طرف مڑا اور بولا:

''مجھے الزام نہ دیجئے گا۔ میں بہت دنوں سے آپ سے بغل گیر ہونے کا آرزومند تھا۔ یہ مجھے آپ کے بارے میں اتنا کچھ بتا چکی ہیں۔ اب تک ہماری شاید ہی ملاقات ہوئی ہو اور اسی لئے ہم ابھی تک دوست نہیں بن سکے۔ خیر، اب ہمیں دوست بن جانا چاہئے۔ اور... اور یہ کہ ہمیں معاف کردیجئے،، اس نے اتنا کہا، کہتے وقت چہرے پر ذرا ہلکی سی سرخی دوڑ گئی اور آواز میں دھیماپن تھا لیکن ساتھ ہی ایسی دل کش مسکراہٹ بھی تھی کہ میں پورے دل سے اس کے لفظوں پر فدا ہو گیا۔

''ہاں، ہاں، الیوشا،، نتاشا بیچ میں بول پڑی ''یہ تو ہمارے ہیں۔ ہمارے بھائی کی طرح ہیں۔ ہمیں پہلے ہی معاف کر چکے ہیں۔ اور ان کے بغیر ہمیں خوشی نصیب نہیں ہو سکتی۔ میں تو تمہیں سب کچھ بتا ہی چکی ہوں۔ افوہ، ہم کس قدر بےرحم لوگ ہیں، الیوشا! لیکن ہم ساتھ رہیں گے۔ تینوں ایک‌ساتھ... وانیا!،، وہ بولے چلی گئی اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''اب، وانیا تم ان کے پاس گھر واپس چلے جاؤ۔ تم نے کندن سی روح پائی ہے۔ اور اگر میرے والدین مجھے معاف نہ کریں تب بھی جب انہیں معلوم ہوگا کہ تم مجھے معاف کر چکے ہو تو میرے معاملے میں نرم پڑ جائیں گے شاید۔ انہیں سب کچھ بتا دینا۔ رتی رتی بتا دینا۔ خود اپنے لفظوں میں، اپنے دل سے، مناسب لفظ اختیار کرنا۔ میری طرف سے بولنا۔ مجھے بچا لینا۔ تم جو سمجھے ہو وہ اسباب انہیں سمجھا دینا۔ تم جانتے ہو وانیا کہ مجھ میں ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوتی اگر تم آج میرے ساتھ نہ ہوتے۔ تم میری نجات ہو۔ تمہیں دیکھتے ہی فوراً میری آس بندھ گئی کیونکہ میں نے سوچا کہ تم انہیں بتا سکتے ہو، تم سمجھا سکتے ہو اور تمہارے سمجھانے سے اس واقعے کا پہلا دھچکا سہنا ان کے لئے آسان ہو جائے گا۔ ہائے میرے پروردگار، میرے خدا!.. میری طرف سے وانیا ان سے کہہ دینا کہ مجھے معلوم ہے اب مجھ کو کبھی معاف نہ کیا جائے گا۔ اگر ماں باپ نے معاف کر بھی دیا تو خدا معاف نہ کرے گا۔ لیکن اگر انہوں نے مجھے عاق کردیا تو میرے منہ سے ہمیشہ ان کے لئے دعا ہی نکلے گی۔ جب تک جیوں گی خدا سے ان کے لئے دعائیں کرتی رہوں گی۔ میرا دل ان کے ساتھ ہے۔ ہائے، ہم سب خوش وخرم کیوں نہیں رہ سکتے۔ کیوں ہے

ایسا، ایسا کیوں ہے؟ میرے خدا، میں نے آخر یہ کیا کردیا!،، ایک دم وہ چیخ پڑی۔ ایسے، جیسے ہوش میں آ رہی ہو۔ اس کا سارا بدن خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور اس نے ہتھیلیوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ الیوشا نے اس کے گرد بازو پھیلا دیا اور کچھ کہے سنے بغیر اسے لپٹا لیا۔ اس کے بعد کئی منٹ تک سناٹا رہا۔

''اور آپ اس سے ایسی قربانی طلب کر سکے؟،، میں نے اسے ملامت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے الزام نہ دیجئے،، اس نے وہی لفظ دہرایا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ساری مصیبت، جتنی بھی کڑی ہے، صرف دم بھر کی ہے۔ مجھے اس بات کا پکا یقین ہے۔ ہمیں ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہمت اور دلیری سے کام لیں اور اس لمحے کو سہہ جائیں۔ خود نتاشا بھی مجھ سے یہی بات کہہ چکی ہے۔ یہ خاندانی اکڑ، یہ خواہ‌مخواہ کے جھگڑے، یہ احمقانہ عدالتی کارروائیاں! یہی سبب ہیں ساری مصیبت کا، آپ تو جانتے ہیں۔ لیکن... (میں اس پر کافی غور کر چکا ہوں، آپ کو یقین دلاتا ہوں) ان سب کا قصہ پاک ہوجائے گا۔ ہم سب پھر گلے مل جائیں گے۔ اور پھر ہم سب خوش و خرم ہوں گے، یہاں تک کہ بڑے بوڑھے بھی ہم کو دیکھتے ہوئے خود اپنے تعلقات سدھار لیں گے۔ کسے خبر، شاید ہم دونوں کی شادی ہی وہ چیز ہو جو بڑے بوڑھوں کو صلح صفائی کے راستے پر لگانے کی ابتدا بن جائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا ہوکے رہے گا۔ کہیے آپ کا کیا خیال ہے؟،،

''آپ نے کہا کہ شادی، تو شادی کب ہونے والی ہے؟،، میں نے نتاشا کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کل، ورنہ پرسوں۔ زیادہ سے زیادہ پرسوں — یقیناً۔ دیکھئے، میں خود اس کے بارے میں صاف نہیں ہوں۔ اور آپ سے سچ بات کہوں، میں نے ابھی تک کوئی انتظام بھی نہیں کیا۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید نتاشا آج نہ آئے گی۔ پھر اس کے علاوہ میرے والد کا اصرار تھا کہ آج ان کے ساتھ اپنی ہونےوالی دلہن سے ملنے جاؤں (آپ جانتے ہیں، وہ میرے لئے دلہن طے کر رہے ہیں۔ نتاشا نے آپ کو بتایا ہوگا لیکن میں خود نہیں چاہتا)۔ تو چنانچہ میں شادی کا کوئی اہتمام نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن بہرحال پرسوں تک ہماری شادی ہو ہی جائے گی۔ میرا تو خیال یہی ہے۔ اور نہیں معلوم اس کے

علاوہ اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔ کل ہم پسکوف روڈ پر ایک جگہ روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں میرا اسکول کا ایک ساتھی ہے۔ بہت ہی عمدہ آدمی۔ یہ جگہ بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ اس سے ضرور ملیں گے۔ وہاں گاؤں میں ایک پادری بھی رہتا ہے۔ اگرچہ مجھے ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم کہ وہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔ مجھے پہلے سے اس کا پتہ چلا لینا چاہئے تھا لیکن اس کا وقت ہی نہیں ملا۔ خیر یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں واقعی۔ اہم بات جو ہے وہ یہ کہ اصل چیز کو مدنظر رکھا جائے۔ آس پاس کے کسی نہ کسی گاؤں سے پادری کو بلوایا ہی جا سکتا ہے۔ ہے نا؟ کیا رائے ہے؟ وہاں قریب میں اور گاؤں بھی ہوں گے ضرور۔ افسوس کی بات ہے کہ میں ان لوگوں کو دو سطر کا پرزہ بھی نہیں لکھ سکا۔ مجھے پہلے سے اطلاع بھیج دینی چاہئے تھی کہ ہم لوگ آرہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا دوست ہی گھر پر موجود نہ ہو... مگر ان چھوٹی چھوٹی فکروں میں کیوں پڑا جائے۔ اگر ہمارا فیصلہ اٹل اور ارادہ مضبوط ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کہئے، ہے نہ یہ بات؟ اور اس عرصے میں کل تک یا پرسوں تک نتاشا یہاں میرے ساتھ رہے گی۔ میں نے الگ سے ایک مکان لے لیا ہے جہاں ہم واپسی پر ساتھ رہیں گے۔ اب میں اپنے والد کے گھر واپس نہ جاؤں گا۔ کیا جانا ہے۔ آپ آئیں گے اور وہاں ہم سے ملیں گے۔ میں نے اس مکان کو اتنا عمدہ بنایا ہے کہ بس۔ میرے اسکول کے یار دوست بھی وہیں ملنے آیا کریں گے۔ شام کی دعوتوں کا انتظام رہے گا...''

میں حیرت اور سراسیمگی سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ نتاشا کی آنکھیں رحم طلب انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ذرا نرمی برتو اور الیوشا کے بارے میں سختی سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔ اس نے خود الیوشا کی گفتگو ذرا زہرخند کے ساتھ سنی مگر ساتھ ساتھ وہ اس نوجوان کو ایسے پیار سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی پیارے ہنستے کھیلتے بچے کو دیکھتا ہے۔ اور اس کی فضول مگر پیاری بڑبڑ سنے جا رہی تھی۔ میں نے نتاشا کو ملامت بھری نظر سے دیکھا۔ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

''لیکن آپ کے والد بزرگوار؟ کیا آپ کو پکا یقین ہے کہ وہ آپ کو معاف کر دیں گے؟''

''کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ اور کیا کر سکتے ہیں؟'' اس نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہوگا یہ کہ اول تو وہ مجھے برا بھلا کہیں گے عاق کردیں گے۔ دراصل مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ اسی قسم کے آدمی ہیں۔ اور پھر میرے ساتھ سختی بھی بہت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی بھی کر ڈالیں۔ یعنی یوں کہنا چاہئے کہ پدرانہ اختیارات سے کام لیں گے۔ مگر آپ جانئے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ وہ مجھ سے محبت بھی بے حد کرتے ہیں۔ خفا ہوں گے تو تھوڑے عرصے کے لئے ہی ہوں گے، پھر درگزر کریں گے۔ پھر کیا ہوگا۔ سب کو صبر آجائے گا۔ اور پھر سب خوش ہو جائیں گے۔ خود نتاشا کے ابا بھی۔''

''اچھا، آپ نے یہ بھی سوچا کہ اگر آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو معاف نہ کیا تو کیا ہوگا؟''

''معاف تو یقیناً کریں گے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اتنی جلدی ایسا نہ ہو۔ تو پھر کیا کیا جاتا ہے۔ میں ان پر ثابت کردوں گا کہ دیکھئے، مجھ میں بھی کیرکٹر ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے برا بھلا کہتے ہیں کہ مجھ میں کیرکٹر نہیں۔ ارادے اور دماغ کا کمزور ہوں۔ اب وہ دیکھ لیں گے کہ آیا میں دماغ کا کمزور ہوں، یا نہیں۔ شادی‌شدہ ہو جانا کوئی مذاق تھوڑئی ہے۔ ہے نا... اب میں کوئی لڑکا ہی تھوڑا رہوں گا... مطلب یہ کہ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی ہو جاؤں گا یعنی جیسے اور شادی‌شدہ لوگ ہوتے ہیں۔ خود کام کروں گا اور رہوں گا۔ نتاشا کہتی ہے کہ جیسے ہم لوگ رہتے ہیں ایسے دوسروں کی کمائی پر بسر کرنے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ آدمی اپنی کمائی پر بسر کرے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ نتاشا کیا اچھی اچھی باتیں مجھے بتاتی ہے۔ مجھے تو کبھی اپنے آپ سے ان کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ میری پال پوس دوسری طرح سے ہوئی ہے۔ تعلیم مختلف قسم کی ملی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے اور خود میں بھی جانتا ہوں کہ ذرا من‌موجی آدمی ہوں اور بمشکل کسی کام کے لایق ہوں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ پرسوں مجھے کیا اعلی درجے کا خیال آیا۔ میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں اگرچہ یہ وقت نہیں ہے اس کے بیان کرنے کا۔ لیکن نتاشا کے بھی کان میں پڑنا چاہئے اور آپ بھی اس پر اپنا مشورہ دے سکیں گے۔ دیکھئے کہ میں کہانیاں لکھا کروں گا۔ اور رسالوں کے ہاتھ بیچ

دیا کروں گا۔ جیسے آپ کرتے ہیں۔ ایڈیٹروں کے معاملے میں آپ میری مدد کر دیں گے۔ کریں گے نا؟ آپ کا مجھے بڑا آسرا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ میں رات بھر لیٹا ہوا ایک ناول کا خاکہ سوچتا رہا۔ بالکل تجربے کے طور پر۔ اور آپ جانتے ہیں اس خاکے سے خاصی اچھی پیاری سی چیز نکل سکتی ہے۔ میں نے مضمون سکریب * کے ایک طربیے سے لیا ہے... خیر، تو میں اس کے بارے میں پھر بتاؤں گا۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ لوگ اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔ آپ کو لکھنے کا روپیہ ملتا ہے — ہے نا؟''

میں مسکراہٹ ضبط نہ کر سکا۔

''آپ تو مسکرا رہے ہیں'' وہ جواب میں مسکراتے ہوئے بولا ''لیکن میں کہتا ہوں'' اس نے ناقابل یقین سادگی سے کہا ''یہ مت سمجھئے کہ میں اس قدر بدھو ہوں جیسا نظر آتا ہوں۔ واقعی میری قوت مشاہدہ بےانتہا تیز ہے۔ آپ خود دیکھ لیں گے۔ تو پھر کوشش کیوں نہ کر دیکھوں؟ ممکن ہے کچھ بات بن جائے۔ مگر اتنا کہنے کی جرأت کروں گا کہ آپ ہی صحیح ہیں۔ دراصل مجھے اصلی زندگی کا پتہ نہیں ہے۔ نتاشا بھی یہی کہتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہر شخص یہی کہتا ہے۔ میں کیسا ادیب بنوں گا بھلا؟ آپ ہنس لیجئے۔ مگر اتنا کیجئے کہ میری غلطی پر ٹوک دیجئے۔ نتاشا کی خاطر یہ تکلیف کیجئے۔ آخر اس سے آپ محبت تو کرتے ہیں۔ میں آپ سے سچ سچ ایمانداری کی بات کہوں — میں نتاشا کے قابل نہیں ہوں۔ میں خود یہ محسوس کرتا ہوں۔ اس سے مجھے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اور نہ جانے کیا بات ہے جو وہ مجھے دل سے چاہنے لگی۔ اور میں نتاشا کے لئے جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں گا! درحقیقت اس منٹ تک میرے دل میں کسی قسم کا خوف و خطر نہ تھا لیکن اب میں گھبرایا ہوا ہوں۔ یہ ہم کر کیا رہے ہیں! توبہ توبہ! بھلا یہ ممکن ہے کہ کسی آدمی کو کوئی فرض سونپا جائے اور اس میں اپنا فرض ادا کرنے کا نہ کافی دماغ ہو نہ ہمت؟ کم از کم آپ تو ہماری مدد کیجئے۔ آپ ہمارے دوست ہیں۔ لے دے کے آپ ہمارے ایک ہی دوست رہ گئے ہیں۔

* سکریب، ایژین (۱۷۹۱ء تا ۱۸۶۱ء) — فرانسیسی ڈرامہ نویس۔ (ایڈیٹر)

تو میں اکیلا کیا سمجھوں؟ معاف کیجئے گا کہ میں آپ کا اس قدر آسرا لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نہایت شریف انسان اور مجھ سے کہیں بہتر آدمی ہیں۔ لیکن میں بہتر بنوں گا اور یقین مانئے کہ خود کو آپ دونوں کے قابل بناؤں گا''

اتنا کہہ کر اس نے پھر میرا ہاتھ دبایا۔ اس کی شاداب آنکھوں میں گرمی اور خلوص قلب کی کیفیت تھی۔ اس نے میری طرف ہاتھ کس اعتماد کے ساتھ بڑھایا تھا اور اسے میری دوستی پر کتنا بھروسہ تھا۔

''نتاشا بہتر بننے میں میری مدد کرے گی'' وہ بولے چلا گیا۔ ''لیکن آپ دل میں زیادہ اندیشے نہ لائیے۔ ہمارے بارے میں زیادہ پریشانی نہ اٹھائیے۔ تمام باتوں کے باوجود مجھے بڑی امیدیں ہیں۔ اور مالی اعتبار سے ہم بالکل مزے میں کام چلا لیں گے۔ اگر میرا ناول کامیاب نہ بھی ہو تو — اور آپ سے صاف کہہ دوں کہ آج ہی صبح مجھے یہ خیال آیا کہ ناول لکھنے کی بات محض ہوائی ہے اور میں نے اس کا ذکر آپ سے اس لئے کیا کہ ذرا آپ کی رائے معلوم ہو جائے گی — ہاں تو اس صورت میں اگر حالات بد سے بدتر بھی ہو جائیں تو میں موسیقی کی تعلیم دے سکتا ہوں۔ آپ کو شاید پتہ نہ ہوگا کہ میں موسیقی کے مضمون میں تیز رہا ہوں۔ اس طرح کے کام کی روزی سے مجھے شرم تھوڑی آئے گی۔ اس سلسلے میں میرے خیالات کافی روشن اور ترقی یافتہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس بہت سی چھوٹی چھوٹی قیمتی چیزیں موجود ہیں۔ جیسے سنگار میز کا سامان ہے۔ بھلا ان کی ہمیں کیا ضرورت؟ میں ان سب کو بیچ ڈالوں گا اور آپ جانئے تھوڑے عرصے انہی پر گزر بسر ہو سکتی ہے۔ اور پھر بھی اگر فرض کیجئے حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے تو میں کسی محکمے میں نوکری کر لوں گا۔ ابا جان کو بھی اس کی خوشی ہوگی۔ وہ خود ہمیشہ تقاضا کرتے رہے کہ میں نوکری کر لوں۔ مگر میں ہی یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ میری تندرستی ٹھیک نہیں۔ (بہرحال میرا نام کسی نہ کسی نوکری کی امیدواری پر چڑھایا جا چکا ہے۔) اور اب جو ابا جان دیکھیں گے کہ شادی سے مجھے فائدہ ہوا، اس سے میری تندرستی بنی اور میں نے نوکری کر لی تو وہ بہت خوش ہوں گے اور میری غلطی معاف کر دیں گے۔''

"لیکن الکسئی پتروِوچ! یہ بھی آپ نے سوچا کہ اب آپ کے والد اور نتاشا کے والد میں کیسی بری ٹھنے گی؟ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ نتاشا کے گھر میں آج شام کیسا کہرام مچا ہوگا۔"

اور میں نے نتاشا کی طرف اشارہ کیا جس کا حال میرے لفظ سن کر یہ ہو گیا تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میں نے اس وقت بےدردی سے کام لیا۔

"ہاں، ہاں۔ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ واقعی ہیبت‌ناک بات ہے"، وہ بولا "میں اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں اور بہت دکھی ہو چکا ہوں... مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ آپ صحیح کہتے ہیں۔ کاش نتاشا کے والدین ہمیں معاف کرسکتے۔ اور مجھے ان سے کس قدر محبت ہے، کاش آپ کو اس کا اندازہ ہوتا! وہ میرے لئے بالکل ماں باپ کی طرح ہیں مگر ان کی شفقت کا یہ بدلہ انہیں دے رہا ہوں۔ اف، یہ جھگڑے، یہ مقدمہ‌بازیاں! آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ سب باتیں ہمارے لئے کس قدر رنجیدہ ہیں۔ اور یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں کس بات پر؟ ہم سب ایک دوسرے کو اس قدر چاہتے ہیں پھر بھی وہ ہیں کہ جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں صلح صفائی ہو جائے اور بس قصہ قضیہ ختم۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا... واقعی یہی کرتا میں تو۔ آپ جو کہتے ہیں اس سے مجھے خوف آتا ہے۔ نتاشا، یہ کس قدر خوف‌ناک بات ہے جو ہم کر رہے ہیں، میں اور تم دونوں! میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا... تم نے خود اس پر اصرار کیا... لیکن سنئے، ایوان پتروِوچ، کیا خیال ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اس سب میں ہماری بہتری پوشیدہ ہو، ہے نا؟ ہمارے بزرگ آخر میں میل ملاپ کر لیں گے۔ نہیں کریں گے کیا؟ ہم اس صلح صفائی میں خود ہاتھ بٹائیں گے۔ بس یہی ہے۔ اس میں کیا شک۔ یہ ان کے بس کی بات نہ ہوگی کہ ہم دونوں کی محبت کے مقابل ٹھیر سکیں... اچھا، وہ ہمیں عاق کر دیں۔ اس کے باوجود ہم ان سے محبت ہی کریں گے اور آخر وہ مان لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ جانتے نہیں کہ میرے ابا جان کبھی کبھی کس قدر نرم دل ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کو گھور کر دیکھیں — یہ ان کا طریقہ ہے۔ لیکن ویسے وہ نہایت معقول شخص ہیں۔ کاش آپ کو خبر ہوتی کہ آج وہ کس نرمی اور شفقت کے ساتھ مجھ سے باتیں کرتے رہے، مجھے سناتے رہے۔ اور آج ہی کے

دن میں ان کی مرضی کے خلاف چل رہا ہوں۔ اس سے مجھے بڑا رنج ہوتا ہے۔ یہ کیسے کیسے احمقانہ واہمے ہیں! بالکل پاگل‌پن! کیا ہو جاتا، اگر وہ نتاشا کو نظر بھر کے دیکھ لیتے ایک بار اور صرف آدھ گھنٹے اس کے پاس رہے ہوتے تو وہ دم کے دم میں ہر بات کے لئے تیار ہو جاتے"، یہ کہتے ہوئے الیوشا نے نتاشا کو محبت بھری جوشیلی نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے ہزاروں بار یہ سوچ سوچ کر لطف آیا ہے کہ"، وہ بدبداتا چلا گیا "اگر میرے ابا جان نتاشا سے مل لئے ہوتے، اس سے واقف ہو جاتے تو وہ اس سے کس قدر محبت کرنے لگتے، نتاشا ہر ایک کو محو حیرت کرسکتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے کبھی ایسی لڑکی زندگی میں نہ دیکھی ہوگی۔ میرے ابا کو تو یہ یقین دلا دیا گیا ہے کہ نتاشا پکی چال‌باز ہے۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ نتاشا کی عزت‌آبرو سے دھبہ مٹاؤں اور میں یہ کر کے رہوں گا۔ آہ، نتاشا، سب تم سے پیار کریں گے۔ سب تمہیں چاہیں گے۔ بھلا کون ہے جو تم سے محبت نہ کرے گا"، اس نے مزا لے کر کہا۔ "اگرچہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں تاہم تم مجھ سے محبت ضرور کرنا، نتاشا، رہا میرا معاملہ تو... تم خود جانتی ہو۔ اور اپنی خوشی کے لئے ہمیں اور کیا چاہئے! مجھے تو یقین ہے کہ آج کی شام ضروربالضرور سبھوں کو مسرت، راحت اور امن چین بخشے گی۔ آج کی شام مبارک ہو! کیوں، ٹھیک ہے نا، نتاشا؟ مگر بات کیا ہے؟ خدایا، آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

نتاشا پر موت کی سی زردی پھیلی تھی۔ جتنی دیر الیوشا بک بک کرتا رہا وہ اس کا منہ تکتی رہی۔ لیکن اس کی آنکھیں ڈوبتی چلی گئیں اور ایک جگہ گڑ گئیں۔ اور اس کے چہرے سے لہو کی سرخی غائب ہوتی گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ اپنے خیالوں میں غرق ہو گئی اور اس نے آخر میں الیوشا کی بات بھی نہیں سنی۔ الیوشا نے جو ایک دم اسے چونک کر پکارا اس سے غالباً وہ ہوش میں آئی، چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا اور ایک دم تیزی سے میری طرف بڑھی۔ بہت پھرتی سے اور ایسے جیسے الیوشا سے چھپانے کی فکر ہو، اس نے جیب سے ایک خط نکالا اور مجھے دے دیا۔ یہ والدین کے نام خط تھا جو نتاشا نے ایک دن پہلے لکھا ہوگا۔ خط دیتے وقت اس نے مجھ سے اس طرح نظر چار کی گویا وہ نگاہ ہٹا ہی

نہیں سکتی۔ آنکھوں میں انتہاہ اداسی تھی۔ میں ان آنکھوں کی وہ ہیبت ناک کیفیت کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں خود بھی سہم کر رہ گیا۔ خیال گزرا کہ اب اسے احساس ہوا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے اس میں کیا خطرے درپیش ہیں۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لب ہلائے اور ایک دم نڈھال ہو کر رہ گئی۔ میں نے اسے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ الیوشا خطرے سے سہم کر پیلا پڑ گیا۔ اس نے نتاشا کی کنپٹی سہلائی، ہاتھوں کو چوما، لبوں کو بوسہ دیا۔ دو منٹ میں اسے ہوش آیا۔ الیوشا جس گھوڑے گاڑی میں آیا تھا وہ دور نہیں کھڑی تھی، الیوشا نے گاڑی بلا لی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد نتاشا نے بےاختیار بڑے زور سے میرے ہاتھ پکڑ لئے، اور ایک گرم گرم آنسو میری انگلیوں پر ٹپک پڑا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ میں ذرا فاصلے پر کھڑا ہوا گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس لمحے میری تمام مسرت خاک میں مل گئی اور میری زندگی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے بڑے درد سے اسے محسوس کیا... اور مری ہوئی چال سے اخمنیف گھرانے کی طرف واپس چلا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جاؤں تو ان سے کہوں گا کیا اور کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں گا۔ میرے سارے خیالات ٹھنڈے پڑ گئے اور قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی معلوم ہوئی...

. . . .

بس اتنی ہے میری مسرت کی کہانی اور یہ ہے میری محبت کا خاتمہ اور اس کا انجام۔ اب میں کہانی کو وہیں سے لیتا ہوں جہاں میں نے اسے چھوڑ اتھا۔

دسواں باب

اسمتھ کی موت کے کوئی پانچ دن بعد میں اس کے فلیٹ میں اٹھ آیا۔ اس روز تمام دن میں بری طرح غم زدہ رہا۔ موسم سرد تھا اور مطلع ابر آلود۔ برف برابر پڑ رہی تھی اور بیچ بیچ میں بارش ہونے لگتی تھی۔ صرف شام ہوتے ذرا دیر کو دھوپ نکلی اور ایک بھٹکی ہوئی کرن میرے کمرے میں بھی جھانکی، شاید تجسس کے

مارے۔ مجھے اس وقت تک افسوس ہونے لگا تھا کہ یہاں اس مکان میں کیوں اٹھ آیا۔ اگرچہ کمرہ بڑا تھا لیکن چھت اس قدر نیچی تھی، دھوئیں وغیرہ کی کالک بھری تھی، اس پر سیلن اور بو۔ اور پھر جو کچھ فرنیچر میرے پاس تھا اس کے باوجود بھی کمرہ ویران معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس وقت یہ خیال آیا کہ جو کچھ صحت رہ گئی ہے وہ بھی اس مکان میں برباد ہو کر رہے گی۔ ہوا بھی یہی۔

اس روز دن کا اول وقت میں اپنے کاغذات میں، ان کو چھانٹنے، ٹھیک کرنے میں لگا رہا۔ کوئی تھیلا موجود نہ تھا اس لئے مجبوراً میں نے تکیہ کے غلاف سے کام لیا۔ چنانچہ سارے کاغذات اوپر تلے ہو گئے۔ کاغذوں کی ترتیب سے نسٹ کر میں لکھنے بیٹھا۔ ان دنوں میں اپنے بڑے ناول پر کام کر رہا تھا۔ لیکن فی الحال اس پر جم کر بیٹھ نہ سکا کیونکہ دماغ دوسری چیزوں سے اٹا ہوا تھا...

قلم میں نے پٹک دیا اور کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی اور دل پر اداسی چھاتی جا رہی تھی۔ دل کو بٹھا دینے والے بہت سے خیالات مجھ پر مسلط ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ آخر پیٹرسبرگ میں ہی میرا خاتمہ ہونا ہے۔ بہار قریب تھی۔ پھر خیال آیا کہ اس خول سے نکل کر اگر مجھے دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہو گئی، اگر میں کھیتوں اور جنگلوں کی تازہ ہوا میں سانس لے سکا تو یقیناً پھر سے مجھ میں جان پڑ جائے گی۔ بہت دن ہو گئے تھے ان چیزوں کو دیکھے ہوئے!.. مجھے یاد ہے کہ یہ خیال بھی میرے دماغ میں آیا تھا کہ کیا اچھا ہو جو کسی معجزے سے، کرامات یا جادو سے میں وہ سب کچھ بھول جاؤں جو پچھلے چند برسوں میں مجھ پر بیتی ہے۔ قطعی سب کچھ ذہن سے محو ہو جائے اور میں پھر نئی توانائی کے ساتھ کام شروع کر سکوں۔ ان دنوں میں اکثر کسی ایسے واقعے کے خواب دیکھا کرتا تھا اور نیا جنم لینے کی امید باندھا کرتا تھا۔ ”شاید اچھا رہے گا کہ میں کسی دماغی ہسپتال میں بھرتی ہو جاؤں یا کچھ اور“، میں نے بالآخر یوں سوچا ”کہ کھوپڑی میں میرا دماغ خوب جھنجھوڑ دیا جائے اور اسے نئے سرے سے ٹھیک کر دیا جائے“، چنانچہ ابھی مجھے جینے کی بڑی تمنا تھی اور زندگی پر یقین باقی تھا۔ لیکن یاد ہے کہ جب میں یہ سوچ رہا تھا تو ہنسی آ گئی۔ ”اچھا تو پاگل خانے سے نکل کر پھر کیا کروں گا؟ پھر ناول لکھوں گا؟..“

اس طرح سے میں مراقبے میں بیٹھا رہا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ رات ہو چلی تھی۔ اس رات مجھے نتاشا کے ہاں جانا تھا۔ ایک دن پہلے اس کا پرزہ آیا تھا جس میں مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ ضرور ملنے آؤں۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ صورتحال ایسی تھی کہ مجھے اس کمرے سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگنے کی فکر تھی چاہے اس کے لئے بارش اور کیچڑ میں کیوں نہ نکلنا پڑے۔

جتنا اندھیرا ہوتا گیا یہ کمرہ بھی اتنا ہی پھیلتا، بڑا ہوتا چلا گیا جیسے دیواریں پیچھے کو ہٹ رہی ہوں۔ اچانک مجھے وہم گزرا کہ ہر رات اب میں مرحوم اسمتھ کو اس کمرے کے ایک ایک کونے میں دیکھا کروں گا۔ وہ وہاں بیٹھا مجھے گھورے گا ٹھیک ایسے جیسے اس شام وہ آدم ایوانچ کو مٹھائی فروش کی دکان میں گھور رہا تھا اور اس کا کتا ازورکا اس کے پیروں میں پڑا ہوگا۔ عین اسی لمحے ایسا ایک تجربہ ہوا جس کا دماغ پر گہرا اثر پڑا۔

بہرحال مجھے ایک اعتراف کرنا ہے۔ اب یا تو یہ میرے اعصاب میں گڑبڑ ہو جانے کا نتیجہ ہے، یا نئے مکان میں ذہن پر جو نئے تاثرات قائم ہوئے تھے ان کا، یا ابھی جو افسردگی کی کیفیت تھی اس کا اثر ہوگا۔ لیکن جیسے ہی تاریکی گہری ہونے لگی، میں ایسی حالت میں ڈوبتا چلا گیا جو آجکل بیماری کے دنوں میں رات کے وقت مجھ پر اکثر طاری ہو جاتی ہے، اور جسے میں کہتا ہوں کہ یہ میرا پراسرار خوف ہے۔ یہ بڑی دل بٹھا دینے والی اور مسوس ڈالنے والی حالت ہوتی ہے خوف کی، اور خوف کسی ایسی چیز کا، جسے میں خود نہیں جانتا کن لفظوں سے تعبیر کروں — کوئی ایسی چیز جو ادراک کی تمام منزلوں سے پرے ہے، اور چیزوں کی قدرتی ترتیب سے ماورا ہے۔ جو معلوم ہوتا ہے کہ بس ابھی کوئی شکل اختیار کر لےگی اور ساتھ ہی گویا دلیل و عقل کا ایک تمسخر ہے، وہ میرے پاس آتی ہے، سامنے کھڑی ہو جاتی ہے جیسے کوئی حقیقت ہے ناقابل انکار، پراسرار، ہیبت ناک اور سیماب صفت بےقرار۔ عقل ہر طرح احتجاج کرتی ہے، مگر اس کے احتجاج و انکار کے باوجود یہ خوف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس حد تک کہ اگرچہ ایسے لمحوں میں ذہن زیادہ کھل جاتا ہے پھر بھی

8—1651

اس کا بس نہیں چلتا کہ اندرونی کیفیت کا مقابلہ کر سکے۔ دماغ بےطاقت ہو جاتا ہے، بےکار ہو جاتا ہے، اس کی کچھ نہیں چلتی اور اس اندرونی انتشار کے سبب اضطرابی حالت کا سمٹتا ہوا کرب بہت تیز ہو جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ اسی قسم کا کرب ہے جو ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو مردے سے ڈرتے ہیں۔ لیکن تکلیف کی اس حالت میں خوف و اندیشے کا نامعلوم ہونا دکھ کی شدت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں دروازے کی طرف پشت کئے کھڑا تھا اور میز پر سے ٹوپ اٹھانے ہی والا تھا کہ عین اسی لمحے یہ خیال میرے دماغ میں آ دھمکا کہ جیسے ہی میں مڑوں گا مجھے اسمتھ لازمی طور پر نظر پڑے گا — پہلے تو وہ آہستہ سے دروازہ کھولے گا، راستے میں کھڑا ہو جائے گا، کمرے میں چاروں طرف نظر گھمائے گا، پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے گا۔ گردن ڈالے ہوئے اور میرے مقابل آکر ٹھیر جائے گا۔ مجھ پر اپنی اجاڑ آنکھیں گاڑ دے گا اور ایک دم مجھ سے آنکھیں چار کرکے ہنس پڑے گا۔ دیر تک پوپلے منہ سے بےآواز ہنسی ہنستا رہے گا۔ اور اس کا سارا جسم ہنسی کے مارے کانپے گا اور دیر تک کانپتا رہے گا۔ یہ تصویر غیرمعمولی طور پر صاف اور واضح کھلی کھلی میرے ذہن کی آنکھوں کے آگے پھر گئی اور ٹھیک اسی وقت اچانک یہ بھرپور اور بڑا ہی اٹل خیال دماغ میں بیٹھ گیا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور ضرور ہوکر رہے گا۔ اور بس اب یہ واقعہ ہو رہا ہے۔ میں اسے صرف اس لئے نہیں دیکھ پا رہا ہوں کیونکہ دروازے کی طرف پشت کئے کھڑا ہوں۔ اور ٹھیک اسی سیکنڈ میں شاید دروازہ کھلنے کی آہٹ ہو رہی ہے۔ میں نے جلدی سے گھوم کر دیکھا — دیکھتا ہوں کہ دروازہ کھل رہا تھا — آہستہ آہستہ بےآواز، ٹھیک اسی طرح جیسے میں نے منٹ بھر پہلے تصور کیا تھا۔ میں چیخ پڑا۔ دیر تک کوئی نظر نہ آیا، گویا دروازہ آپ سے آپ کھل گیا ہو۔ اچانک ایک اجنبی صورت دروازے میں نظر آئی۔ کسی کی آنکھیں تھیں، جہاں تک اندھیرے میں مجھے قیاس ہو سکا وہ آنکھیں مجھے گھور کر بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔ سارے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ سخت دہشت کے عالم میں دیکھتا ہوں تو وہ ایک بچہ تھا، چھوٹی سی لڑکی، اور اگر خود اسمتھ بھی ہوتا تو وہ بھی

شاید مجھ پر اس سے زیادہ دہشت نہ بٹھا سکتا جیسی اس اتفاق سے آنے والی انجان لڑکی کے نمودار ہونے سے ہوئی کہ وہ ایسے وقت اور اس عالم میں میرے کمرے میں نظر پڑی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ بچی نے دروازہ اس قدر احتیاط سے اور آہستگی سے کھولا تھا گویا وہ اندر قدم رکھنے سے ڈرتی ہو۔ جب وہ دروازہ کھول چکی تو بیچ راستے میں کھڑی ہو گئی اور مجھے یوں حیرت سے تکنے لگی جیسے پتھرا سی گئی ہو۔ آخر وہ نہایت آہستہ آہستہ احتیاط سے دو قدم کمرے میں آگے بڑھی اور میرے سامنے آکر رک گئی۔ اب تک اس نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا تھا۔ میں نے اسے اور نزدیک سے دیکھا۔ کوئی بارہ تیرہ سال کی بچی ہوگی۔ چھوٹے قد کی، دبلی پتلی اور اس قدر پیلی جیسے ابھی کسی سخت بیماری سے اٹھی ہو۔ اور اس کی وجہ سے لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی چمک اور نمایاں ہو گئی تھی۔ بائیں ہاتھ سے وہ اپنی بوسیدہ چیتھڑے چیتھڑے شال کو جوڑے ہوئے اور شال سے ہی سینہ ڈھکے ہوئے تھی جو شام کی سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے لباس کو پارہ پارہ اور گودڑ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے گھنے کالے بال اجاڑ تھے، ان میں کنگھی بھی نہ ہوئی تھی۔ ہم دونوں اسی طرح کوئی منٹ دو منٹ کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

”نانا ابا کہاں ہیں؟“ اس نے آخر میں بھرائی ہوئی آواز سے، جو بمشکل سنائی دیتی تھی، پوچھ لیا۔ آواز سے ایسا لگتا تھا کہ اس کے حلق میں تکلیف ہے۔

اس سوال کے سنتے ہی ذہن سے وہم کے وسوسے سب مٹ گئے۔ یہ گویا اسمتھ کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا، اچانک اس کا اتہ پتہ معلوم ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔

”تمہارے نانا — مگر ان کا تو انتقال ہو گیا“ اتفاق سے میرے منہ سے نکل گیا۔ میں اس بچی کے سوال کے لئے تیار نہ تھا اور فوراً مجھے اس بے تکے جواب پر افسوس بھی ہوا۔ منٹ بھر تو وہ ہکی بکی کھڑی رہی۔ اس کے بعد اچانک سارے بدن سے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس قدر سخت لرزہ تھا اس کو کہ معلوم ہوتا تھا اب کوئی خوفناک دورہ پڑے گا۔ میں نے اسے سہارا دے کر سنبھالا کہ کہیں گر نہ پڑے۔ چند منٹ میں اس کی طبیعت سنبھل گئی اور مجھے صاف نظر آیا کہ وہ میرے سامنے ضبط سے کام لینے کی بڑی کوشش کر رہی ہے۔

”مجھے معاف کردو۔ بچی مجھے معاف کر دو۔ میری بچی“ میں نے اس سے کہا ”میرے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔ شاید مجھ سے غلطی ہوئی... میری بچی، تمہیں آخر کس کی تلاش ہے؟ وہ بڑے میاں جو یہاں رہتے تھے ان کی؟“

”جی ہاں“ اس نے بہت زور لگا کر منہ سے یہ لفظ نکالا اور مجھے وہ پریشان نظروں سے دیکھتی رہی۔

”ان کا نام اسمتھ تھا — یہی نا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی — جی ہاں۔“

”اوہو — تو، وہی — اچھا تو وہی تھے۔ ہاں، صبر کرو، میری بچی۔ مگر تم پہلے کیوں نہیں آئیں؟ اب کہاں سے آئی ہو؟ کل ہی انہیں دفن کیا گیا ہے۔ اچانک ان کی موت ہو گئی... تو تم ان کی نواسی ہو۔ یہی بات ہے؟“

لڑکی نے میرے تیز تیز اور بے ربط سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور مڑ کر چپ چاپ کمرے سے چل دی۔ میں ایسا بھونچکا ہو گیا کہ اسے روکنے کی یا آگے پوچھ گچھ کرنے کی بھی کوشش نہ کی۔ دروازے میں رک کر اس نے ذرا دماغ پر زور دیا اور پھر ذرا مڑ کر مجھ سے پوچھا:

”کیا ازورکا بھی مر گیا؟“

”ہاں، ازورکا بھی مر گیا“ میں نے جواب دیا۔ اس کا سوال مجھے بڑا عجیب سا لگا یعنی اسے پہلے ہی گویا یقین ہو گیا تھا کہ بڑے میاں کے ساتھ ازورکا بھی ضرور مر گیا ہوگا۔ میرا جواب سنتے ہی لڑکی خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ باہر سے دروازہ بھیڑ دیا۔

منٹ بھر بعد میں اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔ اپنے اوپر بڑا طیش آ رہا تھا کہ یہ کیا کیا جو اسے جانے دیا۔ مگر لڑکی اس تیزی سے نکل گئی تھی کہ زینے پر باہر کا دروازہ کھلنے تک کی آہٹ مجھے نہ سنائی دی۔ میں نے سوچا ”ابھی وہ زینے سے نیچے تو اتری نہ ہوگی“ اور اس خیال کے ساتھ میں ٹھیرا کہ آہٹ سنوں۔ لیکن سناٹا تھا۔ قدموں کی چاپ بالکل نہیں سنائی دی۔ میں نے صرف سب سے نیچے کی منزل پر کواڑوں کی چراچراہٹ سنی۔ لیکن پھر اس کے بعد خاموشی ہی خاموشی تھی۔

جلدی جلدی میں زینے کے نیچے اترنے لگا۔ پانچویں منزل پر، جہاں میں آ کے رہا تھا، وہاں سے چوتھی منزل تک کا زینہ چکردار

تھا، اور چوتھی سے نیچے زینہ سیدھا اترتا تھا۔ بالکل سیاہ، گندا، ہمیشہ اندھیرا، ویسا ہی زینہ تھا جیسا عام طور سے ان بڑی عمارتوں میں ہوا کرتا ہے جن میں چھوٹے چھوٹے کرائے کے فلیٹ ہوں۔ اور پھر یہ وقت بھی ایسا تھا کہ زینے میں گھپ اندھیرا ہو چکا تھا۔ چوتھی منزل تک راستے ٹٹولتا میں پہنچ تو گیا لیکن وہاں قدم تھم گئے۔ اور اچانک محسوس ہوا کہ کوئی شے مجھے اکسا رہی ہے کہ یہاں کوئی موجود ہے جو مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں ادھر ادھر ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ وہ بچی وہیں موجود تھی ٹھیک ایک کونے میں سکڑی ہوئی اور اپنا منہ دیوار کی طرف کئے ہوئے ان‌سنی سسکیاں لے رہی تھی۔

''میں کہتا ہوں، تمہیں کیا ڈر لگ رہا ہے؟،، میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے تمہیں ڈرا دیا ہے، یہ میری غلطی۔ مرتے وقت تمہارے نانا ابا نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ آخری لمحے بھی تمہارا نام ان کی زبان پر تھا... ان کی کچھ کتابیں رکھی ہیں... شاید وہ تمہاری ہی ہوں‌گی، کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں رہتی ہو؟ وہ ذکر کرتے تھے کہ چھٹی سڑک...،،

ابھی میں نے جملہ پورا نہ کیا تھا کہ لڑکی خوف سے چیخ پڑی جیسے اس بات سے سہم گئی ہو کہ میں اس کا ٹھکانا جانتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے سوکھے ہوئے بازو سے ایک طرف ہٹایا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اتر گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ نیچے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اچانک وہ رک گئی۔ جب میں نیچے سڑک پر پہنچا ہوں تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ ووزنیسینسکی پراسپکٹ تک میں بڑھتا چلا گیا تو احساس ہوا کہ ساری کوشش فضول ہے۔ وہ لاپتہ ہو چکی تھی۔ ''بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ سے کہیں چھپ گئی ہو — وہیں زینے پر،، میں نے جی میں سوچا۔

گیارھواں باب

مگر ابھی میں اس سڑک کے کیچڑ میں لت‌پت فٹ‌پاتھ پر مشکل سے چار قدم چلا ہوں‌گا کہ ایک راہ گیر میرے برابر سامنے سے گزرا۔ وہ شخص سر جھکائے، غالباً اپنے خیال میں ڈوبا ہوا کسی طرف

تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ حیرت ہو گئی جو میں نے پہچانا کہ یہ تو وہی میرے پرانے مہربان اخمنیف تھے۔ یہ شام بھی میرے لئے عجب قسم کی ملاقاتوں کی شام تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ بڑے میاں تین دن ہوئے بری طرح بیمار پڑے تھے اور اب جو دیکھتا ہوں تو ایسے بارش کے موسم میں وہ سڑک پر چلے جا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی حیرت کہ انہیں شام کے وقت گھر سے باہر نکلنے کی عادت نہ تھی۔ اور جب سے نتاشا انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی، یعنی کوئی چھ مہینے سے، تو وہ مستقل گھر پر پڑے رہنے لگے تھے۔ انہیں مجھ سے مل کر کوئی معمولی خوشی نہیں ہوئی، ایسے کھل گئے جیسے کسی پرانے دوست سے ملاقات پر آدمی خوش ہوتا ہے جس سے دل کی باتیں کر سکے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا، اسے زور سے دبایا اور بغیر یہ پوچھے کہ میں کہاں جا رہا ہوں، مجھے اپنے ساتھ کھینچنے لگے۔ وہ کسی معاملے میں بہت الجھے ہوئے تھے اور طور طریقوں میں گھبراہٹ، بےصبری اور اضطراب کی کیفیت تھی۔ میں نے تعجب سے سوچا ''بھلا یہ کہاں جا رہے ہوں گے؟،، اگر ان سے کچھ سوال کیا جاتا تو غلطی ہوتی۔ ان میں بےحد شکی‌پن پیدا ہو گیا تھا اور کبھی کبھی وہ سیدھے سادے سوال پر یا معمولی سے جملے پر بھی یہی شبہ کرتے تھے کہ ان پر جملہ کسا گیا یا توہین کی گئی ہے۔

میں نے انہیں کنکھیوں سے دیکھا — ان کے چہرے پر بیماری کے اثرات موجود تھے۔ وہ پچھلے دنوں سے بہت دبلے ہو گئے تھے۔ ٹھوڑی پر کوئی ہفتے بھر کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال جو سفید ہو چلے تھے، پچکے ہوئے ہیٹ کے اندر سے بےترتیبی میں باہر کو نکلے ہوئے تھے اور پرانے ملے دلے اوورکوٹ کے کالر پر الجھے ہوئے گچھوں میں پڑے ہوئے تھے۔ میں پہلے ہی اندازہ کر چکا تھا کہ ان پر ایسے لمحے آتے ہیں جب ان کے ذہن سے چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کمرے میں ان کے سوا اور کوئی موجود ہے یا نہیں، اور اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگتے ہیں، ہاتھ گھمانے پھرانے لگتے ہیں۔ ان کو دیکھ کے دل دکھتا تھا۔

''ہاں، تو وانیا، کہو،، انہوں نے بولنا شروع کیا ''تم کدھر جا رہے تھے؟ میں نکلا ہوں، بیٹے، کام سے نکلا ہوں۔ تم جانو۔ کہو، اچھے تو ہو تم؟،،

''آپ کہئیے، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟،، میں نے جواباً پوچھا ''ابھی کل تک آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور اب آپ باھر جا رہے ھیں۔،،

ایسا لگا کہ بڑے میاں نے میری بات سنی ھی نہیں۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''آننا اندریئونا کیسی ھیں؟،،

''اچھی ھیں۔ ٹھیک ھی ھیں... بھرحال ان کی بھی ذرا طبیعت گڑبڑ ہے... وہ کچھ افسردہ سی لگ رھی تھیں۔ تمہارا ذکر کرنے لگیں کہ کتنے دن سے وہ ھمارے یہاں نہیں آئے ھیں۔ وانیا، تم ھمارے یہاں ملنے جا رہے ھو ابھی؟ چل رہے ھو بولو؟ ممکن ہے تم کہیں اور جا رہے ھو اور میں تمہیں روک رھا ھوں، دیر کروا رھا ھوں؟،، انھوں نے اچانک سوال کیا اور مجھے بھچی ھوئی آنکھوں سے بےاعتمادی اور شبہ کے ساتھ تکنے لگے۔ شکی‌مزاج بڑے میاں کو ذرا ذرا سی بات ایسی لگنے لگی تھی اور وہ اس قدر چڑچڑے ھو گئے تھے کہ اگر کہیں میں انہیں جواب دے دیتا کہ نہیں، میں آپ کے ھاں نہیں جا رھا ھوں تو انہیں یقینا ٹھیس لگتی، اور وہ مجھ سے روکھےپن کے ساتھ رخصت ھوتے۔ میں نے جلدی سے ان کے سوال پر ھاں کر دیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جی ھاں میں تو آپ ھی کی طرف چلا تھا آننا اندریئونا سے ملنے کا ارادہ کرکے۔ میں نے یہی بات بنا دی اگرچہ مجھے احساس تھا کہ دیر ھو جائےگی اور ممکن ہے نتاشا سے ملنے جانے کا وقت ھی نہ رہے۔

''خوب، تو یہ ٹھیک ہے،، بڑے میاں نے میرے جواب سے مطمئن ھوتے ھوئے کہا ''یہ بہت اچھا رھا،، اور وہ اتنا کہہ کر خاموشی اور غور و فکر میں ڈوب گئے۔ ایسے جیسے کوئی بات ان کہی رہ گئی ھو۔

''ھاں تو یہ ٹھیک رھا!،، بےخیالی میں انھوں نے پھر کوئی پانچ منٹ بعد دھرایا گویا ایک لمبی بےخودی کے بعد ھوش میں آئے ھوں۔ ''ھونہہ، تو تم جانو، وانیا، ھمارے لئے تم بیٹے کی طرح ھو ھمیشہ... خدا نے ھمیں بیٹا عطا نہ کیا... تو اس نے تمہیں بھیج دیا ھمارے پاس۔ میں تو بھئی، ھمیشہ ایسے ھی سمجھتا رھا۔ اور میری بڑی بی تو وہ بھی... ھاں! اور تم بھی ھمیشہ بڑی محبت سے

اور ادب سے پیش آتے رہے، سعادت‌مند بیٹے کی طرح۔ خدا تمہیں اس کی جزا دے۔ خوش رھو تم وانیا، جیسے ھم دونوں بوڑھے بڑھیا تمہیں دعائیں دیتے ھیں، تم سے پیار کرتے ھیں... ھاں تو!،،

ان کی آواز کانپ گئی اور ایک لمحہ انھوں نے غور کیا۔

''اچھا... ھاں تو؟ تم کہیں بیمار تو نہیں پڑے رہے؟ آخر اتنے عرصے سے ملنے کیوں نہیں آئے؟،،

میں نے اس پر انہیں اسمتھ کا پورا قصہ سنایا اور اس بات کی معذرت کی کہ اس معاملے نے مجھے الجھائے رکھا۔ کہا کہ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ میں کچھ بیمار سا رھا اور پھر ان وجہوں سے کچھ مجبوری رھی کہ اتنی دور واسی‌لیفسکی جزیرے میں ان سے ملنے نہ آسکا (اب یہ خاندان اس علاقے میں رہنے لگا تھا)۔ میں یہ ذکر کرتے کرتے رہ گیا کہ اس کے باوجود نتاشا کے ھاں جانے کا وقت میں نے نکال لیا تھا۔ عین وقت پر میں نے زبان کو لگام دی۔

اسمتھ کا جو واقعہ میں نے انہیں سنایا اس سے بڑے میاں کو بہت دلچسپی ھوئی۔ نہایت توجہ سے وہ اسے سنتے رہے۔ جب انہیں میری زبانی معلوم ھوا کہ جس مکان میں اب گیا ھوں وھاں سیلن ہے بلکہ وہ پہلےوالے مکان سے بھی گیا گزرا ہے اور اس کا کرایہ بھی چھہ روبل ماھوار ہے تو وہ گرم ھو گئے۔ وہ قطعی بھڑک اٹھنے کے لئے تیار اور بےقرار ھوگئے۔ ایسے موقعوں پر صرف ایک خاتون آننا اندریئونا ایسی تھیں جو بڑے میاں کو قابو میں رکھنا جانتی تھیں اور وہ بھی ھمیشہ نہیں۔

''ھونہہ، تو یہ ہے تمہارا ادب ودب، وانیا!،، وہ کچھ برھمی کے لہجے میں اچانک بولے ''وہ تمہیں کوٹھری تک تو لے آیا ہے اب قبر تک پہنچا دےگا۔ میں نے تم سے اسی وقت کہہ دیا تھا، پہلے ھی آگاہ کرچکا ھوں۔ کہو، وہ تمہارے 'ب، صاحب ابھی تک تنقید لکھ رہے ھیں؟،،

''جی نہیں، ان کا تو انتقال ھوگیا۔ وہ بدن میں قوت نہ ھونے سے مر گئے۔ شاید اس کے بارے میں تو میں پہلے ھی آپ سے کہہ چکا ھوں۔،،

''مر گئے؟ ھونہہ، تو مر گئے وہ۔ یہی تو ھونا تھا۔ ھاں، یہ بتاؤ، انھوں نے بال بچوں کے لئے بھی کچھ چھوڑا؟ تم نے ھی شاید بتایا تھا کہ ان کی بیوی ہے۔ بھلا، ایسے لوگوں کو شادی کرنے کی کیا ضرورت؟ کیوں شادی کرتے ھیں؟،،

"جی نہیں - کچھ بھی چھوڑ کر نہیں مرے -"

"ہاں، مجھے بھی یہی اندیشہ تھا!"، وہ اس زور سے، اس جذبے سے چیخے گویا اس معاملے کا ان کی ذات سے کوئی گہرا تعلق تھا، جیسے مرحوم "ب"، ان کے سگے بھائی تھے - "کچھ نہیں — یہ کچھ نہیں اور تم جانتے ہو وانیا، میں تو پہلے ہی سے یہ سمجھ گیا تھا کہ یوں خاتمہ ہوگا ان کا، اور یہ کب میں نے اندازہ کیا تھا، اس وقت جب تم نے ان کی بڑی تعریفیں کی تھیں مجھ سے، یاد ہے؟ منہ سے کہہ دینا آسان ہے کہ کچھ نہیں چھوڑا - ہونہہ... تو کیا ہے شہرت مل گئی - چلو، خیر، مان لیا، لیکن اگر یہ لافانی شہرت بھی ہو تب بھی اس سے پیٹ تو نہیں بھرتا - اور تمہارے بارے میں بھی وانیا، مجھے یہی دکھائی دیتا ہے - میرے بھائی، اگرچہ تم مجھے بہت پسند ہو اور تمہاری تعریف بھی کی میں نے، پھر بھی اندیشہ رہا تمہاری طرف سے - 'ب'، تو یوں مر گئے، مرتے نہیں تو کیا کرتے - زندگی بھی خوب گزری ہے اور... دیکھو کیا عمدہ جگہ ہے واہ!"

اور اپنے ہاتھ کی تیز بےاختیار حرکت سے انہوں نے راستے کی دھندلی گزرگاہوں کی طرف اشارہ کیا جن پر کہر میں ڈوبے ہوئے سڑک کے چراغ ٹمٹما رہے تھے، وہ میلے کچیلے مکانوں کی طرف، فٹ پاتھوں کے سیلن سے چمکتے ہوئے پتھروں کی طرف، اور پاس سے گزرتے ہوئے بجھے بجھے مردار، افسردہ راہ گیروں کی طرف اشارہ کیا — اس سارے منظر کی طرف جس پر پیٹرسبرگ کا آسمان گنبد کی طرح رکھا ہوا ہے اور اس درجہ سیاہ جیسے کسی نے اس پر کالی روشنائی تھوپ دی ہو - اب ہم چوک میں نکل آئے تھے - ہمارے سامنے اندھیرے میں یادگار کا بت نصب تھا جس پر نیچے سے گیس کے ہنڈوں کی روشنی پڑ رہی تھی اور اس سے آگے بڑھ کر سینٹ اسحاق کا بہت بڑا دھندلایا ہوا کلیسا* کھڑا تھا جو افسردہ آسمان کے پس منظر میں صاف نظر نہیں آتا تھا -

"وانیا، تم کہا کرتے تھے کہ 'ب'، بہت اچھے آدمی ہیں -

---

* پیٹرسبرگ (لینن گراد) میں واقع سینٹ اسحاق کا کلیسا جو ۱۸۱۸ء تا ۱۸۵۸ء میں تعمیر کیا گیا تھا - کلیسا کی بہت بڑی عمارت تقریباً ۱۰۲ میٹر اونچی ہے - (ایڈیٹر)

عالی ظرف، وجیہ، حساس اور پرجوش دل ودماغ کے انسان، دیکھو — یہ سب تمہارے عمدہ انسان ایک سے ہوتے ہیں، یہ جن کے دل ودماغ میں آنچ ہوتی ہے - مگر ان سب کے کرم کیا ہیں — یتیم بچے! ہونہہ — اور پھر میں سمجھوں کہ اس طرح مرتے وقت وہ خوش رہے ہوں گے!.. افوہ، توبہ ہے - یہاں سے کہیں بھی نکل بھاگوں، کہیں نہیں تو سائبیریا سہی... کیا بات ہے، بیٹی؟" انہوں نے اچانک ایک بچی کو دیکھ کر پوچھا جو فٹ پاتھ پر بھیک مانگ رہی تھی -

دبلی پتلی زرد بچی تھی، عمر ہوگی کوئی سات آٹھ برس کی - میلے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی، ننھے منے ننگے پیروں میں جوتے بھی پھٹے ہوئے تھے - وہ کوشش کر رہی تھی کہ اپنے تھرتھراتے ہوئے ننھے سے جسم کو اس پھٹے چیتھڑے، چھوٹے سے لباس سے چھپائے جو مدتوں ہوئے اس کے لئے چھوٹا پڑ چکا تھا - اس کا پیلا، روگی اور پچکا ہوا چہرہ ہماری طرف تھا، اس نے ہمیں عاجزی سے اور بےسوال کئے دیکھا اور اپنا کانپتا ہوا ننھاسا ہاتھ بڑھا دیا، اس کی آنکھوں میں انکار سننے کا خوف جھلک رہا تھا - بڑے میاں اسے دیکھتے ہی چونک پڑے اور اس کی جانب اس تیزی سے مڑے کہ خود بچی سہم گئی اور ان سے ایک طرف کو ہٹ گئی -

"کیا ہے، کیا بات ہے، لڑکی؟ بھیک مانگتی ہے تو؟ ہاں - لے... یہ لے لے!"، وہ چیخ کر بولے -

اضطراب کے مارے تمتماتے کانپتے وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگے اور اس میں سے چاندی کے دو یا تین سکے نکالے - لیکن یہ ان کی نظر میں کم لگے - تو انہوں نے بٹوا نکالا، اندر سے ایک روبل کا نوٹ کھینچا، بس اس میں یہی کچھ تھا اور اسے بھکاری بچی کے ہاتھ میں تھما دیا -

"حضرت مسیح کا تجھ پر سایہ رہے بچی... بیٹی میری! خدا کے فرشتوں کا تجھ پر سایہ رہے!"

کانپتے ہوئے ہاتھ سے بڑے میاں نے اس بچی پر کئی بار صلیب کا نشان بنایا - لیکن اچانک انہیں خیال آ گیا کہ میں بھی ساتھ ہوں اور دیکھ رہا ہوں، وہ اس بات سے ناراض ہو گئے اور تیز تیز قدموں سے چل دئیے -

"یہ سب مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، وانیا"، وہ خاصی دیر تک ملول اور خاموش رہنے کے بعد بولے "یہ ننھی معصوم مخلوق سڑک

پر جاڑے سے کانپ رہی ہے... کیوں؟ صرف اپنے کم بخت ماں باپ کی خاطر۔ اگرچہ کوئی ماں بھی اپنے جگر کے ٹکڑے کو یوں مصیبت میں کیوں نکالے گی جب تک کہ وہ خود انتہائی مجبور و مقہور نہ ہو... بہت ممکن ہے کہ اس کے پاس اور بھی ننھے یتیم بچے ہوں جو گھر کے کونے کھدرے میں سر جوڑے پڑے ہوں اور یہی ایک بچی سب سے بڑی ہو اور ماں خود بیمار ہو۔ اور... ہونہہ۔ یہ کوئی شاہزادوں کی اولاد تھوڑئی ہے۔ دنیا میں بہت بچے ہیں میرے بھائی، جو شاہزادوں کی اولاد نہیں ہیں، سمجھے؟"

وہ لمحے بھر سر جھکائے سوچتے رہے جیسے کہنے کو لفظ نہ مل رہے ہوں۔

"دیکھو وانیا، میں نے آننا اندریئونا سے وعدہ کیا تھا کہ..."

ذرا لکنت کرتے ہوئے اور کہنے میں جھجکتے ہوئے وہ آخر بولے "میں نے ان سے وعدہ کیا تھا، یعنی... آننا اندریئونا اور میں ہم دونوں نے طے کیا تھا کہ کسی چھوٹی سی یتیم کو گود لے لیں گے... اسے پالیں پوسیں گے، کسی بھی بےچاری یتیم بچی کو، بالکل اپنے پاس ہی رکھ لیں گے۔ تم سمجھے میری بات؟ کیونکہ ہم بوڑھے آدمی اکیلے پڑے رہتے ہیں، اس سے جی گھبراتا ہے۔ مگر دیکھو، آننا اندریئونا ابھی سے، نہ جانے کیوں، اس خیال سے پھر گئی ہیں اور نہیں چاہتی ہیں۔ ذرا تم بات کرنا ان سے، میری طرف سے نہیں، سمجھے؟ مگر دیکھو اس طرح بات چھیڑنا جیسے خود تمہیں سوجھی ہو... انہیں راضی کر لینا، سمجھے نا؟ بہت دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ تم سے کہوں، تم انہیں کسی طرح اس بات پر مناؤ... تم جانو، میرے لئے مناسب نہیں ہے کہ میں ان پر دباؤ ڈالوں — خیر، یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ میرے واسطے بچہ کا ہونا یا نہ ہونا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تمنا نہیں ہے۔ صرف ذرا اچھا لگتا ہے کہ بچے کی آواز کان میں پڑے... لیکن اصل میں، تم سے سچ کہوں، میں یہ سب اپنی بڑی بی کی خاطر چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ اکیلے پڑے رہنے کے بجائے گھر میں بچہ کھیلےگا تو ان کا جی بہل جائےگا۔ خیر، یہ سب واہیات باتیں ہیں۔ وانیا، اگر ایسے چلتے رہے تو کہیں بہت دیر میں جاکر گھر پہنچیں گے، لاؤ، ایک گھوڑا گاڑی بلا لیں۔ فاصلہ کافی ہے، آننا اندریئونا کو فکر لگی ہوگی..."

ساڑھے سات بج رہے تھے جب ہم گھر پہنچے۔

بارھواں باب

اخمنیف میاں بیوی کے آپس میں بڑا پیار تھا۔ محبت اور برسوں کی سنگت نے ہمیشہ کے لئے ایک کو دوسرے سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود نکولائی سرگیئچ نہ صرف آجکل بلکہ پہلے بھی، عیش و آرام کے اچھے دنوں میں بھی ہمیشہ آننا اندریئونا سے احتیاط برتتے تھے، خاص طور سے اگر دوسرے لوگ موجود ہوں تو ان کے سامنے خود کو لئے دئے رہتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ کچھ نازک اور حساس طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بعض اوقات ایک طرح کی ضد اور حد سے زیادہ احتیاط ہو جاتی ہے کہ اپنی بات کھل کر کسی سے نہ کہی جائے اور دل کی دل میں ہی رکھی جائے۔ یہاں تک کہ جو آدمی انہیں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، اس سے بھی ذرا پردہ رکھتے ہیں، صرف دوسروں کے سامنے ہی نہیں، بلکہ تنہائی میں بھی۔ دراصل تنہائی میں تو اور بھی زیادہ۔ کبھی ایک مدت کے بعد ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ان کی دلی کیفیت پھٹ پڑتی ہے، اور جتنے زیادہ عرصے اسے دباکر رکھا گیا ہو، اتنے ہی زور سے، شدت اور بےقراری سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ نکولائی سرگیئچ اپنی آننا اندریئونا کے ساتھ بالکل شروع سے اب تک یہی طرزعمل اختیار کئے ہوئے تھے۔ وہ آننا اندریئونا کا بہت لحاظ کرتے تھے اور ان سے بےانتہا محبت تھی اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ آننا اندریئونا ایک ایسی شریف نیک‌دل خاتون تھیں جو اپنے شوہر سے محبت کرنے کے سوا کسی کام کی نہ تھیں اور اس بات سے شوہر کو سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اکثر اوقات سادہ‌دلی کی وجہ سے شوہر کے ساتھ ضرورت سے زیادہ کھل جاتی تھیں اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی تھیں۔ لیکن جب سے نتاشا نے گھر چھوڑا تھا، دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور محبت برتنے لگے تھے۔ انہیں اس بات کا واقعی بڑا دکھ تھا کہ دنیا میں اب ان دونوں کا کوئی نہیں رہ گیا ہے۔ اور اگرچہ نکولائی سرگیئچ کبھی کبھی بےانتہا اداس ہو جایا کرتے تھے، تاہم وہ دونوں ایک دوسرے سے دو گھنٹے کے لئے بھی جدا ہو جاتے تو طبیعت پر شاق گزرتا تھا اور بےچینی ہونے لگتی تھی۔ انہوں نے گویا ان کہا معاہدہ کر رکھا تھا کہ نتاشا کا کوئی ذکر نہ کیا جائے جیسے اس نام کا کوئی

وجود ہی نہ تھا۔ آننا اندریئونا کو اتنی بھی جرأت نہ ہوتی تھی کہ شوہر کی موجودگی میں نتاشا کے متعلق کنایۃً ہی کر دیں اگرچہ یہ ضبط ان پر بہت گراں گزر رہا تھا۔ دل میں تو وہ بہت پہلے نتاشا کو معاف کرچکی تھیں۔ بہرحال کسی نہ کسی صورت سے یہ ایک مقررہ رسم بن چکی تھی کہ جب بھی میں ان کے گھر جاؤں تو ان کی چہیتی اور ناقابل فراموش بیٹی کی کوئی نہ کوئی خبر ضرور سناؤں۔

بڑی بی کو اگر بیٹی کی خبر ملنے میں دیر ہو جاتی تو وہ بیمار پڑ جاتیں اور جب میں خبریں لئے ہوئے پہنچتا تو وہ ذرا ذرا سی تفصیل تک پوچھا کرتیں اور ہانپتے کانپتے ہر بات کی ٹوہ لینے کے لئے سوالات کرتی جاتی تھیں۔ میرے بیان سے ان کے دل کو تسکین ہوتی۔ ایک بار جب نتاشا بیمار پڑی تو بڑی بی اندیشے کے مارے مرتے مرتے بچیں اور بالکل کمربستہ ہو گئی تھیں کہ بیٹی کو دیکھنے خود جائیں۔ لیکن یہ انتہا درجے کا واقعہ تھا۔ اول تو ان میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ خود مجھ سے کہہ دیتیں کہ بیٹی سے ملنے جانا چاہتی ہیں، پھر یہ کہ ہمیشہ جب ہماری بات‌چیت ہوتی اور وہ بیٹی کے بارے میں ذرا ذرا سی تفصیل تک مجھ سے پوچھ چکی ہوتیں تو وہ اسے ضروری سمجھتی تھیں کہ میری خاطر ذرا سختی اور رکھائی دکھائیں اور یہ جتائیں کہ اگرچہ بیٹی کی زندگی سے انہیں دلچسپی ضرور ہے تاہم نتاشا نے ایسی بےہودگی کا برتاؤ کیا ہے کہ اسے کسی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ سب بناوٹی باتیں ہوتی تھیں۔ ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ آننا اندریئونا غم سے مری جا رہی ہیں، رو رہی ہیں، میرے سامنے نتاشا کو پیار کے ناموں سے پکار رہی ہیں اور نکولائی سرگیئچ کی سخت شکایتیں کر رہی ہیں، مگر ان کی موجودگی میں بڑی احتیاط کے ساتھ اشاروں میں طعنے تشنے کرتی جاتی ہیں کہ بعض لوگوں کو کتنی اکڑ ہوتی ہے، پتھر کے دل ہوتے ہیں ان کے، بھلا ہم اوروں کی زیادتی معاف کیوں نہیں کر سکتے، اگر دوسروں کو معاف نہیں کریں گے تو خدا بھی ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ یہ سب تو تھا مگر وہ شوہر کی موجودگی میں اس سے آگے کبھی نہیں بڑھتی تھیں۔ بڑے میاں اتنا سنتے تو ہمیشہ ان کے تیور بگڑنے لگتے، ان کا چہرہ تمتمانے لگتا، وہ منہ بنا کر چپ بیٹھے

رہتے یا ایک دم بڑے زور زور سے بےتکےپن کے ساتھ، بات کہیں سے کہیں لےجاتے یا ہمیں چھوڑ کر وہاں سے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اس طرح آننا اندریئونا کو موقع مل جاتا کہ وہ دل کا لہو میرے سامنے ٹپکائیں، آنسوؤں سے روئیں اور آہیں بھریں۔ وہ ہمیشہ میرے آنے پر اسی طرح اپنے کمرے میں چلے جایا کرتے تھے، کبھی کبھی تو ان سے صرف سلام دعا ہوکر رہ جاتی اور وہ ٹل جاتے تاکہ مجھے آننا اندریئونا کو نتاشا کی تمام تازہ ترین خبریں بتانے کا موقع مل جائے۔ اس وقت بھی انہوں نے یہی کیا۔

”میں بالکل بھیگ چکا ہوں“، وہ کمرے میں گھستے ہوئے فوراً بولے ”اب میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ تم وانیا تھوڑی دیر یہیں ٹھیرو۔ اس بھلے آدمی کے مکان کا قصہ خوب ہے۔ لو! وانیا، تم ذرا ان کو سنا تو دو۔ اور میں اتنے میں آتا ہوں...“

وہ جلدی سے کھسک گئے کہ ہم پر نظر بھی نہ پڑے جیسے اس بات سے شرما رہے ہوں کہ مجھے اور آننا اندریئونا کو ملا کیوں دیا۔ ایسے موقعوں پر اور خاص طور پر جب وہ واپس آتے تو ہمیشہ مجھ سے اور آننا اندریئونا سے کترائے ہوئے، جھجکے ہوئے رہتے تھے بلکہ ایک حد تک برہمی اور نکتہ‌چینی ان میں پائی جاتی گویا خود پر جھنجھلا رہے ہیں کہ اس قدر نرم اور دبو کیوں واقع ہوئے ہیں۔

”دیکھو تو بھلا، کیسے آدمی ہیں“، بڑی بی نے کہا جو ادھر کچھ عرصے سے میرے ساتھ اپنی بےرخی اور بےاعتباری بالکل چھوڑ چکی تھیں ”ہمیشہ سے ان کا میرے ساتھ یہی برتاؤ ہے۔ خود جانتے ہیں کہ ہم سے ان کی چالاکیاں چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ بھلا مجھ سے یہ ظاہرداری برتنے کی کیا ضرورت؟ کیا میں کوئی غیر ہوں؟ اور وہ تو بیٹی کے ساتھ بھی غیروں کا سا برتاؤ کر رہے ہیں۔ چاہئے تو تھا کہ معاف کر دیں۔ بلکہ وہ تو ممکن ہے جی سے چاہتے ہوں کہ معاف کر دیں۔ خدا ہی جانے ان کی باتیں۔ راتوں کو روتے ہیں — میں نے خود سنا۔ لیکن اوپر سے سخت بنے ہوئے ہیں۔ اکڑ نے انہیں مار ڈالا... بیٹے، ایوان پتروویچ، جلدی سے بتاؤ تو مجھے، گئے کہاں تھے یہ؟“

”نکولائی سرگیئچ؟ مجھے نہیں معلوم کہاں گئے تھے۔ میں تو آپ سے ہی پوچھنے والا تھا۔“

''میرا دل کیسا ہول رہا تھا جب وہ گھر سے نکلے ہیں۔ تم جانو، طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں ہے اور پھر اس موسم میں، ایسے وقت۔ خیر، چلو، میں سمجھی کوئی ضروری کام ہوگا جو گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور اس کام سے زیادہ خاص بات اور کیا ہو سکتی تھی، تم سمجھے نا میرا مطلب! میں نے اپنے جی میں تو ضرور سوچا مگر ان سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اور پھر ان دنوں ان سے کسی بات کی بھی پوچھ گچھ کرنا میرے بس کا نہیں ہے۔ ان بڑے میاں کے اور بیٹی کے مارے ویسے ہی میرے اوسان خطا رہتے ہیں۔ کیا ہو، میں نے جی میں سوچا، جو وہ بیٹی کے گھر چلے گئے ہوں۔ اور جو انہوں نے یہی طے کر لیا ہو کہ چلو اسے معاف کر دیں۔ کیونکہ انہوں نے سب کچھ پتہ چلا لیا ہے۔ انہیں نتاشا کی رتی رتی خبر ہے۔ مجھے یقین ہے پکا کہ انہیں سب کچھ اس کا حال معلوم ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں یہ سب کچھ معلوم کیسے ہو جاتا ہے۔ کل وہ بہت ہی اداس تھے اور آج بھی رنجیدہ رہے۔ آپ کچھ منہ سے بتاتے کیوں نہیں؟ بتائیے آخر، وہاں اور کیا کچھ گزری؟ میں تو فرشتہ رحمت کی طرح آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آنکھیں آپ کی راہ تک رہی تھیں کہ کب آئیں اور کب حال کھلے۔ ہاں تو کہہ دیجئے! کیا وہ پاجی کمینہ نتاشا کو چھوڑنے پر آمادہ ہے؟،،

جو کچھ مجھے خبر تھی میں نے سب آننا اندریئونا کو بتا دیا۔ ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ معاملہ واقعی اب نتاشا اور الیوشا کے درمیان علحدگی تک آ پہنچا ہے۔ اور اب کے جو کچھ ہوگا وہ پہلے والی غلطفہمیوں سے بڑھ کر ہوگا۔ نتاشا نے مجھے کل ہی ایک پرزہ بھیجا تھا اور مجھ سے اصرار کیا تھا کہ آج رات کو نو بجے اس کے گھر پہنچوں۔ اس لئے میرا ارادہ آپ کے ہاں آنے کا نہیں تھا۔ نکولائی سرگیئچ مجھے یہاں لے آئے۔ میں نے انہیں پوری تفصیل سے سمجھایا کہ پوزیشن بہت نازک ہے۔ کیونکہ الیوشا کے باپ جو کہیں باہر گئے ہوئے تھے دو ہفتے ہوئے واپس آ گئے ہیں اور کسی کی سنے بغیر الیوشا کو اپنی مٹھی میں لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ الیوشا بھی ایسا لگتا ہے جیسے اس منگیتر کی طرف سے بےنیاز نہیں ہے بلکہ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اس لڑکی کی محبت

میں مبتلا ہو گیا ہے۔ میں نے آننا اندریئونا کو یہ بھی بتایا کہ جہاں تک میرا قیاس ہے نتاشا نے وہ پرزہ جو مجھے بھیجا تھا بہت گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ آج رات کو سب کچھ فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن میری تو عقل میں نہیں آتا کہ فیصلہ کیا ہونا رہ گیا ہے۔ یہ بھی عجیب سی بات ہے کہ اس نے خط لکھا تھا کل اور مجھے بلایا تھا آج اور وہ بھی مقررہ وقت ۹ بجے رات کو۔ چنانچہ مجھے جانا ہے اور جلد سے جلد وہاں پہنچنا ہے۔

''جاؤ، جاؤ۔ میرے بیٹے، ضرور جاؤ!،، آننا اندریئونا نے بےصبری سے کہا ''مگر جانے سے پہلے ذرا وہ آجائیں تو ایک چائے کی پیالی پیتے جاؤ... افوہ، اب تک سماوار بھی نہیں لا کر رکھا! ماتریونا! سماوار کو کیا ہو گیا؟ دیر کیوں کر دی؟ حرام خور ہے، عورت نہیں ہے! دیکھو تو۔ تم چائے ہی لو۔ اور چائے پیتے ہی بس، کسی بہانے چل دو۔ لیکن ہاں، دیکھو، کل یہاں آنا نہ بھولنا اور مجھے سب بتا جانا۔ ذرا اول وقت چلے آنا۔ توبہ ہے خدایا، کہیں میری بچی پر کوئی اور نئی بپتا تو نہیں پڑی؟ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے برا اور کیا ہو سکتا ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ نکولائی سرگیئچ کو سب خبر ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ تم جانو ماتریونا کی زبانی مجھے بہت کچھ سننے میں آتا ہے اور وہ اگاشا سے معلوم کرتی ہے۔ اور اگاشا اس ماریا واسیلی‌ونا کی دینی ماں ہے جو پرنس کی ڈیوڑھی میں رہتی ہے... مگر ہاں... تم خود جانتے ہو۔ میرے شوہر آج بہت گرم تھے۔ میں نے کئی طرح سے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ مجھی پر برس پڑے۔ پھر افسوس کرنے لگے۔ کہنے لگے کہ روپیہ کم رہ گیا ہے۔ جیسے میں سمجھتی نہ ہوں، وہ روپے کی ہی وجہ سے تو چلائیں گے۔ شام کے کھانے کے بعد ذرا آنکھ جھپکنے الھ گئے۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا (انہیں معلوم نہیں ہے مگر دروازے میں ایک جھری پڑی ہوئی ہے) تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ بیچارے طاق کے سامنے دوزانو ہیں اور دعا مانگ رہے ہیں۔ جب میں نے یہ منظر دیکھا تو پیروں نے کھڑے ہونے سے جواب دے دیا۔ انہوں نے آنکھ تک نہیں لگائی، چائے بھی نہیں پی، بس ہیٹ اٹھایا

اور چل دئیے گھر سے - چار بجے کے بعد گھر سے نکلے تھے - میری ہمت بھی نہیں پڑی کہ پوچھوں کہاں چلے - ڈر تھا کہ کہیں چیخ نہ پڑیں - ان دنوں انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی عادت پڑ گئی ہے - اکثر ماتریونا پر برس پڑتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے بھی ڈانٹ پلاتے ہیں - جب وہ چیخنا چلانا شروع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں اور دل ڈوبنے لگتا ہے - اگرچہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ صرف فوں فاں ہے لیکن پھر بھی مجھے ہول آتا ہے - ان کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد پورے گھنٹہ بھر میں دعا مانگتی رہی کہ خدا ان کو ہدایت دے، ان کے دل میں نیکی ڈالے - اچھا ہاں، وہ نتاشا کا پرزہ کہاں ہے - ذرا دیکھوں تو!،،

میں نے وہ پرزہ انہیں دکھا دیا - مجھے معلوم تھا کہ آننا اندریئونا کے دل میں چوری چوری یہ خیال آتا تھا کہ الیوشا جسے وہ کبھی پاجی کمینہ کہتی تھیں، کبھی بےحس، احمق لڑکا کہہ کر پکارتی تھیں، بالآخر نتاشا سے شادی کرے گا اور اس کا باپ پرنس پیوتر الیکساندرووچ اس پر رضامند ہو جائے گا - ان کے منہ سے دل کا چور میرے سامنے بھی آ چکا تھا اگرچہ بعد میں انہیں اس کا افسوس رہا اور وہ صاف مکر گئیں - لیکن نکولائی سرگیئچ کی موجودگی میں وہ اپنے خوابوں کی امیدیں کبھی کھول کر نہ کہتی تھیں اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ شوہر کو اس بات کا شبہ ہے اور صرف اتنا نہیں بلکہ کئی موقعوں پر شوہر نے اشاروں میں انہیں برا بھلا بھی کہا - مجھے یقین ہے کہ اگر بڑے میاں کو اس شادی کا امکان بھی نظر آ جاتا تو وہ نتاشا پر لعنت بھیجتے اور اسے اپنے دل سے نکال کر پھینک دیتے -

اس وقت ہم سب ایسا ہی سمجھتے تھے - وہ جی جان سے اپنی بیٹی کے لئے تڑپتے تھے لیکن یہ تڑپ صرف نتاشا کے لئے تھی اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ کسی طرح الیوشا کی یاد قطعی طور پر بیٹی کے دل سے نکل جائے - نتاشا کو معاف کرنے کے لئے وہ صرف اس شرط پر تیار ہو سکتے تھے - اگرچہ یہ بات کبھی زبان سے نہیں نکلی لیکن ان کو دیکھنے سے یہ حقیقت صاف طور سے کھل جاتی تھی -

''بےکردار ہے وہ تو - بالکل ڈانواڈول لڑکا - ڈانواڈول بھی اور

بےدرد بھی - میں نے تو ہمیشہ یہی کہا،، آننا اندریئونا نے پھر کہنا شروع کیا - ''یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ اس کی تربیت کیسے کی جائے - اب وہ بالکل موم کی ناک بن کر نکلا ہے - نتاشا تو اس پر یوں مر مٹی اور وہ اب اسے چھوڑنے چلا ہے - توبہ ہے میری پروردگار! اب اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟ بےچاری نتاشا! اور نئی میں اسے کیا مل گیا؟ تعجب تو مجھے اس بات کا ہے -،،

میں نے جواب دیا ''آننا اندریئونا، میں نے سنا ہے کہ اس کی منگیتر بہت دل کش لڑکی ہے - اور خود نتاشا بھی اس لڑکی کے بارے میں یہی بتاتی ہیں...،،

''تمہیں یقین آ گیا اس کا!،، ماں نے فوراً بات کاٹی - ''بڑی آئی دل کش لڑکی! تم لوگ جو کاغذ پر قلم گھسیٹنے والے ہو، تمہیں تو ہر ایک لڑکی میں دل کشی ہی نظر آتی ہے، بس، ذرا اسکرٹ ہلانا جانتی ہو - رہا نتاشا کا کہنا، تو وہ اپنے دل کی بڑائی سے کہتی ہوگی - اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکے الیوشا کو کیوں کر قابو میں رکھے - اسے سب کچھ معاف کر دیتی ہے اور خود ہر طرح کے دکھ جھیلتی ہے - اب تک وہ کتنی بار اسے فریب دے چکا ہے - پاجی، بےدرد کہیں کا! میرا تو دل لرزتا ہے ایوان پترووچ! سبھوں میں ہوا بھری ہوئی ہے - اگر ذرا بڑے میاں ہی جھک جائیں اور اپنی اکڑ سے باز آ جائیں تو - اس بےچاری بچی کا قصور معاف کرکے اسے اپنے گھر لے آئیں - میں اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لوں گی اور اس کا منہ دیکھتی رہوں گی - کیا وہ دبلی ہو گئی ہے؟،،

''جی ہاں - دبلی تو ہو گئی ہیں -،،

''میری بچی، ہائے میں کیا کروں، ایوان پترووچ! ایک اور مصیبت آ گئی ہے - ساری رات اور آج سارے دن میں روتی رہی ہوں... مگر کیا! بعد میں سناؤں گی سب تمہیں - کتنی بار میں نے اشاروں میں ان سے کہا کہ بس اب جانے دو - صاف صاف کہنے کی میری ہمت نہیں پڑتی، اس لئے گھما پھرا کے کہتی ہوں ذرا ہوشیاری سے - ہر وقت میرا دل ڈوبا رہتا ہے - کیا ہو اگر وہ بگڑ جائیں اور بیٹی کے حق میں بددعا کا کلمہ منہ سے نکل جائے - ابھی تک ان کی زبان سے نتاشا کے لئے برا لفظ میں نے نہیں سنا - ڈرتی ہوں کہ ایسا نہ ہو کہیں - اگر وہ اسے عاق کر بیٹھے تو

کیا ہوگا۔ جس اولاد کو باپ عاق کردے اس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ میری زندگی یہ رہ گئی ہے کہ خوف کے مارے ہر روز لرزہ چڑھا رہتا ہے۔ اور ایک تم ہو ایوان پتروویچ، تمہیں شرم آنی چاہئے کہ تم اس گھر میں پلے بڑھے۔ ہم نے تمہیں اپنی مامتا محبت دی مگر تم بھی آتے ہو تو ایسی بےہودہ باتیں کرنے لگتے ہو۔ لڑکی دلکش ہے! تم سے تو بہتر ماریا واسیلیونا جانتی ہے (ایک دن میں نے یہ گناہ اپنے سر لیا، جب بڑے میاں آدھے دن کو باہر گئے ہوئے تھے اسے کافی پینے بلا لیا)۔ اس نے مجھے سب اندر باہر کی باتیں بتادیں۔ پتہ یہ چلا کہ پرنس یعنی الیوشا کے باپ میں اور اس کاؤنٹیس میں ناجائز تعلقات چلے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کاؤنٹیس نے الیوشا کے باپ پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس سے شادی کرے۔ لیکن وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ یہ ایسی کاؤنٹیس صاحبہ ہیں کہ اپنے پہلے شوہر کی زندگی میں بھی بےشرمی کی حرکتوں سے بدنام تھیں۔ جب شوہر کا انتقال ہوا تو وہ ملک سے باہر گئی ہوئی تھیں، اور وہاں اطالوی اور فرانسیسی انہیں گھیرے رہتے تھے اور پتہ نہیں کیسے کیسے رئیس‌زادوں سے واسطہ تھا۔ وہیں یہ پرنس پیوتر الیکساندرووچ اس کے پلے پڑے۔ اس عرصے میں کاؤنٹیس کی سوتیلی بیٹی جو پہلے مرحوم شوہر سے ہے (پہلا شوہر آبکاری کا ٹھیکیدار تھا) جوان ہوتی جا رہی تھی۔ اماں جان نے شوہر کے بعد ساری دولت اڑا دی۔ ادھر تو بیٹی کاتیرینا فیودورووِنا بڑھ رہی تھی اور ادھر وہ جو باپ نے بیٹی کے نام بیس لاکھ روبل چھوڑے تھے وہ بڑھتے جا رہے تھے۔ اب بتاتے ہیں کہ اس کے نام کے تیس لاکھ ہو گئے ہیں۔ پرنس کو سوجھ گئی کہ یہ جوڑا الیوشا بیٹے کے لئے اچھا رہےگا! (فکر مت کرو، وہ بڑا چنٹ ہے، موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔) وہ کاؤنٹ صاحب جو درباری بھی ہیں، تم تو جانتے ہو، خیال آیا؟ ان کے خاص رشتہ‌دار، انہوں نے بھی اس رشتے کی منظوری دے دی ہے۔ تیس لاکھ کی رقم کوئی مذاق تھوڑئی ہے۔ 'بہت مناسب ہے، تم کاؤنٹیس سے اس سلسلے میں بات کر لو، انہوں نے پرنس سے کہہ دیا۔ چنانچہ پرنس نے اس عورت کو ٹٹولا اور اپنے من کی کہہ ڈالی۔ وہ تو ہاتھ پاؤں چلانے لگی سخت خلاف۔ کہتے ہیں عورت بڑی بےڈھب ہے۔ ایک حرافہ ہے کہیں کی۔ بتاتے ہیں کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو

اسے ہمارے یہاں منہ لگانے کو تیار نہیں۔ سرحد پار کی اور بات ہے۔ خیر تو وہ بولی پرنس سے کہ ایسے نہیں، تم خود مجھ سے شادی کرو۔ رہا سوتیلی بیٹی کے الیوشا سے شادی کرنے کا معاملہ تو اس کی بات چھوڑو، لڑکی کو بتاتے ہیں کہ اپنی سوتیلی ماں پر فدا ہے۔ پوجا کرتی ہے اماں‌جان کی اور ہر بات میں اس کی سنتی ہے۔ مختصر یہ پتہ چلا کہ دل کی بڑی ہی شریف لڑکی ہے بھولی بھالی، نیک — پرنس تو خوب سمجھتا ہے معاملے کو، اس نے کاؤنٹیس سے کہا کہ فکر نہ کرو۔ اپنی ساری رقم تو تم اڑا چکی ہو، اب تمہارے پاس اتنا بھی نہیں کہ اپنا قرضہ چکاسکو۔ چنانچہ اگر تمہاری بیٹی میرے الیوشا سے شادی کر ڈالے تو یہ ہو گئی جوڑی — تمہاری بیٹی بھی معصوم اور میرا بیٹا بھی بدھو۔ ہم ان دونوں کو اپنی نگرانی میں لے لیں‌گے اور ان کے بن جائیں‌گے سرپرست۔ پھر سب ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس بھی رقم ہوجائےگی۔ کہنے لگا کہ اور جو مجھ سے شادی کروگی تو کیا ملےگا؟ بڑا کائیاں آدمی ہے۔ یہ چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ اس عرصے میں کاؤنٹیس کچھ طے نہیں کر پائی۔ مگر اب بتاتے ہیں کہ وہ دونوں وارسا چلے گئے اور وہاں بات پکی ہو گئی۔ سننے میں یہی آیا ہے۔ مجھے یہ سب ماریا واسیلیونا نے بتایا۔ اندر کی باتیں ہیں۔ اس نے خود بھی یہ خاص بھروسے کے آدمی سے سنا ہے۔ تو سمجھے تم، یہ کیا بات ہے۔ یہ سارا قصہ لاکھوں روپے کا ہے۔ اس میں بھلا دلکش لڑکی کا کیا دھرا ہے۔''

آننا اندریئونا نے جو قصہ مجھے سنایا اس کا مجھ پر اثر ہوا کیونکہ یہ بالکل اس کے مطابق تھا جو میں الیوشا کی زبان سے سن چکا تھا۔ جب وہ اس کا ذکر کرتا تو سینہ تان کر کہتا کہ میں روپے کی خاطر ہرگز شادی نہیں کروں‌گا۔ مگر کاتیرینا فیودورووِنا نے اس کو موہ لیا تھا۔ میں نے الیوشا ہی سے یہ بھی سنا کہ اس کا باپ خود شادی کی فکر میں ہے اگرچہ وہ ان افواہوں سے انکار اس لئے کرتا ہے کہ کہیں وقت سے پہلے ہی کاؤنٹیس جھنجھلا نہ جائیں۔ یہ تو میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ الیوشا کو اپنے باپ سے بڑی عقیدت تھی، وہ اس کی تعریفوں کے پل باندھا کرتا تھا اور اس کی بات پر ایسا اندھا یقین کرتا تھا جیسے وہ غیبی آواز ہو۔

"اور پھر ایسی اعلی خاندان کی بھی نہیں ہے تمہاری وہ دلکش لڑکی۔" میں نے جو پرنس کے صاحب‌زادے کی منگیتر کی ذرا تعریف کر دی تھی اس پر آننا اندریئونا بہت خفا تھیں، وہ کہتی چلی گئیں "بلکہ نتاشا تو اس لڑکے کا بہتر جوڑ ہے۔ وہ لڑکی تو صرف آبکاری کے ٹھیکیدار کی اولاد ہے اور میری بیٹی نتاشا پرانے درباری خاندان کی بیٹی ہے۔ کل ھی کی بات ہے (میں تمہیں بتانا بھول گئی) میرے بڑے میاں نے اپنا صندوقچہ کھولا، لوھے کی پٹیوں کا صندوقچہ ہے پرانا۔ وہ میرے سامنے آدھی رات تک بیٹھے رہے اور اس میں سے پرانے خاندانی کاغذات الٹتے پلٹتے رہے۔ بہت سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھے۔ میں بیٹھی موزہ بنتی رہی اور ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ مجھے اندیشہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں کچھ بولتی نہیں ہوں تو انہیں یہ ناگوار گزرا اور وہ آپ سے آپ بول پڑے۔ آدھی رات تک وہ مجھے اپنا شجرۂ نسب سمجھاتے رہے۔ تمہیں معلوم ہے کیا کہ ھمارے خاندان اخمنیف کے بزرگ پرانے وقتوں میں، جب زار ایوان واسلی‌وچ سفاک کا زمانہ تھا، درباریوں میں تھے۔ اور میرا شمیلوف خاندان زار الکسئی میخائلووچ کے زمانے میں بھی کافی مشہور تھا۔ ثبوت کے کاغذات موجود ھیں ھمارے یہاں، بلکہ کرامزین* کی تاریخ میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔ تم خود دیکھو بیٹے، ھم لوگ اس میں کوئی ادھروالوں سے دبے ہوئے نہیں ھیں۔ جیسے ھی میرے بڑے میاں نے یہ بات چھیڑی میں فوراً سمجھ گئی کہ ان کے دماغ میں کیا ہے۔ جانو کہ بڑے میاں کو بھی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ نتاشا کو طعنے دئے جا رہے ھیں۔ صرف ایک چیز ہے جس میں وہ لوگ ھم سے اونچے ھیں، یعنی دولت۔ خیر بلا سے، وہ لٹیرا پیوتر الیکساندرووچ دولت کی فکر کئے جائے۔ سب کو خبر ہے کہ اس کی روح بڑی ھی بےدرد اور لالچی ہے۔ لوگ بتاتے ھیں کہ جب وہ وارسا میں تھا تو اس نے یسوعی فرقے سے کچھ اندرونی ساز باز کر لیا تھا، خبر ٹھیک ہے کیا؟"

"بیکار کی بکواس ہے،" میں نے جواب دیا اگرچہ اس پر تعجب

* کرامزین، نکولائی میخائلووچ (۱۷۶۶ء تا ۱۸۲۶ء) — مشہور روسی ادیب اور مورخ۔ (ایڈیٹر)

کئے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ افواہ اتنی شدت کیوں رکھتی ہے۔ لیکن نکولائی سرگیئچ کے اپنے خاندانی کاغذات چھاننے کی جو خبر مجھے ان کی بیوی سے ملی وہ البتہ ایسی تھی جس نے مجھ میں کرید پیدا کر دی۔ بڑے میاں نے پہلے کبھی اپنے شجرے پر اونچی نہیں ھانکی تھی۔

"یہ بڑے پاجی، کمینے، بےدرد لوگ ھیں!" آننا اندریئونا بولتی چلی گئیں "اچھا یہ تو بتاؤ، وہ کیسی ہے، میری بچی، بہت دکھی ہے کیا؟ روتی رہتی ہے؟ توبہ ہے، اب تک تمہیں وہاں روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔ ماتریونا، اے ماتریونا! حرام‌خور ہے یہ، عورت نہیں ہے! انہوں نے اس کی تذلیل تو نہیں کی؟ وانیا، بتاتے کیوں نہیں؟"

بھلا میں اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ بڑی بی بیچاری آنسو بہا رہی تھیں۔

میں نے ان سے پوچھا، یہ تو بتائیے، وہ نئی مصیبت کیا ہے جس کا آپ مجھ سے ذکر کرنےوالی تھیں۔

"ھائے میرے بیٹے، یہی مصیبتیں کیا کم تھیں کہ صبر کا پیمانہ اور لبریز کیا جا رہا ہے۔ تمہیں یاد ہے؟ مگر شاید تمہیں یاد نہ ہو، میرے پاس سونے کا ایک لاکٹ تھا، ایک طرح سے یادگار یا نشانی کی چیز سمجھو، اس لاکٹ میں نتاشا کی بچپن کی ایک تصویر تھی۔ اس وقت میری پیاری بچی کی عمر ھوگی کوئی آٹھ برس۔ ایک آرٹسٹ تھا سفری، اس سے ھم نے نکولائی سرگیئچ کی معرفت یہ کہہ کر بنوائی تھی۔ تم بھول گئے، وہ کاری‌گر بڑا عمدہ تھا، اس نے نتاشا کو کیوپڈ کے روپ میں پیش کیا تھا۔ اس زمانے میں میری بچی کے بال ایسے خوبصورت تھے جھاگ جھاگ سے۔ مصور نے تن‌زیب کی فراک میں اس کی تصویر ایسی بنائی تھی کہ ننھا سا بدن اس میں سے پھوٹتا تھا اور ایسی پیاری، ایسی خوبصورت لگتی تھی کہ اس پر سے نظر ھٹانے کو جی نہ چاہے۔ میں نے اس کاری‌گر سے بہت کہا کہ اس کے ننھے ننھے پر اور لگا دو مگر وہ تیار نہ ہوا۔ اچھا تو جب یہ آفت ھم پر ٹوٹ چکی تو میں نے وہ لاکٹ صندوقچے سے نکالا اور اسے گلے میں ڈال لیا۔ صلیب کے علاوہ یہ بھی ہمیشہ پہنے رہتی تھی۔ اگرچہ اس ڈر سے میرا دم نکلا جاتا تھا کہ کہیں بڑے میاں کی نظر اس پر

نہ پڑ جائے۔ تمہیں تو معلوم ہے اسی وقت مجھ سے کہہ چکے تھے کہ نتاشا کا جتنا سامان ہے گھر سے نکال پھینکا جائے یا پھونک دیا جائے تاکہ کوئی ایسی چیز باقی نہ رہے جو اس کی یاد دلا سکے۔ لیکن مجھے کیا چاہئے تھا، بیٹی کی تصویر تو رہتی ہی میرے پاس کہ جب جی چاہا دیکھ لی۔ کبھی کبھی آنسو نکل آتے تھے اور میں اس پر نظر ڈال لیتی تھی تو دل کو کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ گھر میں اکیلی ہوں تو اس کی تصویر چوم رہی ہوں گویا خود نتاشا کو پیار کر رہی ہوں۔ اسے پیار کے ناموں سے پکارتی رہتی تھی اور ہر رات اس تصویر پر صلیب کا نشان بناکر، خدا کی امان میں دے کر سوتی تھی۔ جب میں اکیلی ہوتی تو اس کی تصویر سے جی کھول کر باتیں کرتی، اس سے کچھ نہ کچھ پوچھا کرتی اور جی میں سوچ لیتی کہ وہ جواب دے رہی ہے۔ اور پھر اور سوال کرتی۔ ہائے، بیٹے وانیا، اس کا بیان کرتے میرا دل بھر آتا ہے۔ مجھے یہ تو ڈھارس تھی کہ بڑے میاں کو کم سے کم اس لاکٹ کی خبر نہیں ہے اور ان کی نظر سے وہ بچا ہوا ہے۔ لیکن کل صبح جو دیکھتی ہوں تو لاکٹ غائب ہے۔ اس کی ڈوری ڈھیلی تھی، گھس گھسا کر کہیں نکل گئی ہوگی اور لاکٹ گر گیا۔ میں ہکی بکی رہ گئی۔ ہر طرف ڈھونڈھا، کونا کونا چھان مارا مگر اس کا کہاں پتہ۔ بس سمجھو، اڑ گیا کہیں۔ کہاں گرا ہوگا ایسا؟ میں نے سوچا ممکن ہے بستر میں گر پڑا ہو چنانچہ وہاں بھی ہر چیز کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا۔ کہیں پتہ نہیں۔ اگر وہ کہیں نکل کے گر گیا ہوتا تو کسی نہ کسی کی نظر پڑتی اور وہ اٹھا لیتا۔ لیکن اٹھا کون لیتا سوائے ان کے یا ماتریونا کے؟ خیر، ماتریونا پر تو شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، وہ مجھ پر ویسے ہی سو جان سے فدا ہے۔ (اری او ماتریونا، سماوار لاتی ہے تو یا نہیں؟) میں سوچتی رہی کہ اگر بڑے میاں کے ہاتھ پڑا ہوگا تو کیا ہوگا؟ بیٹھی رہی دل مسوسے ہوئے۔ دیر تک روتی رہی۔ آنسو! ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے۔ اور نکولائی سرگیئچ مجھے تسلی دے رہے ہیں، منا رہے ہیں، تھپک رہے ہیں ایسے جیسے انہیں خبر ہی ہو کہ میں کس وجہ سے رو رہی ہوں اور مجھ پر خود بھی ترس کھا رہے ہیں۔ اس پر مجھے بڑا تعجب آیا

کہ آخر انہیں خبر کیسے ہو گئی۔ ممکن ہے انہیں لاکٹ مل گیا ہو اور انہوں نے اٹھاکر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ہو۔ غصے میں وہ یہ حرکت کر تو سکتے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے لاکٹ مکان سے باہر پھینکا اور اب افسوس کر رہے ہیں، خود رنجیدہ ہیں کہ ایسا کیوں کیا۔ میں ماتریونا کے ساتھ مکان کے باہر کھڑکی کے نیچے پہنچی وہاں ڈھونڈتی رہی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ بس سمجھو، اڑ ہی گیا۔ ساری رات میں اس غم سے روتی رہی۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ میں اپنی بچی پر صلیب کا نشان نہیں بنا سکی۔ ہائے یہ کیسا برا شگون ہے، ایوان پتروویچ، یہ بہت ہی برا شگون ہے۔ دو دن ہو گئے ہیں روتے روتے، آنکھیں خشک نہیں ہوئیں۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی کہ تم فرشتہ رحمت بن کر آؤ گے اور میرا دل ہلکا کروگے...،،

یہ کہہ کر بےچاری بڑی بی پھوٹ کر روئیں۔

،،اوہو، میں تو آپ سے کہنا ہی بھول گئی،، وہ اچانک بولیں اور اس بات کے یاد آجانے کی انہیں خوشی معلوم ہوتی تھی ،،کیا ان کی زبانی آپ نے یتیم بچی کے بارے میں کوئی بات سنی؟،،

،،جی ہاں، انہوں نے مجھے بتایا تو تھا کہ آپ دونوں کی مرضی ہے کہ کسی یتیم غریب بچی کو گود لے لیں اور اس کی پال پوس کریں۔ ٹھیک ہے یہ بات؟،،

،،نہیں، میں نے تو نہیں سوچا یہ، میرے بیٹے، میں نے نہیں سوچا، مجھے کوئی یتیم بچی نہیں چاہئے۔ اس سے ہمیں اپنی بپتا یاد آئے گی، اپنی بدنصیبی کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ مجھے کوئی نہیں چاہئے اپنی نتاشا کے سوا۔ وہ میری اکلوتی بیٹی تھی اور وہی رہے گی اکلوتی۔ مگر اس کا مطلب کیا کہ انہیں یتیم بچی کو گود لینے کا خیال آیا۔ کیا رائے ہے تمہاری ایوان پتروویچ؟ انہوں نے جو یہ بات سوچی تو کیا میرے آنسو دیکھ کر میرا دل بہلانے کے لئے سوچی یا یہ کہ وہ اپنی بیٹی نتاشا کو دماغ سے بالکل نکال دینے اور دوسری بچی سے جی لگانے کے لئے ایسا سوچتے ہیں۔ انہوں نے راستے میں کیا بات کی تھی میرے بارے میں؟ وہ کیسے لگ رہے تھے ناراض سے؟ بجھے بجھے؟ ہا! لو وہ آ پہنچے۔ تو پھر بعد میں بتانا، میرے بچے بعد میں ضرور بتانا... کل ادھر آنا مت بھولنا...،،

بڑے میاں آ گئے، انہوں نے ہم دونوں کو ٹوہ لینے کی نظر سے دیکھا اور ایسے گویا کسی بات سے شرمندہ ہوں، بگڑے ہوئے ہوں، سیدھے میز پر جا بیٹھے۔

’’سماوار کہاں ہے؟‘‘ انہوں نے پوچھا۔ ’’مطلب یہ ہے کہ وہ اب تک سماوار نہیں لائی کیا؟‘‘

’’آ رہا ہے سماوار، ابھی آتا ہے۔ یہ رہا،‘‘ آننا اندریئونا نے گھبرا کر کہا۔

ماتریونا نے جیسے ہی نکولائی سرگیئچ کو دیکھا وہ فوراً سماوار لے کر آ پہنچی جیسے وہ اسی بات کا انتظار کر رہی تھی کہ بڑے میاں آ جائیں تو سماوار لے کر آئے۔ ماتریونا بڑی عمر کی آزمودہ‌کار اور وفادار ملازمہ تھی۔ لیکن اپنی من‌مانی کرنےوالی اور ضدی اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی دنیا میں ایسی نوکرانی ہوگی، تنک‌مزاجی اور سرکشی سے بھری ہوئی۔ وہ نکولائی سرگیئچ سے دبتی تھی اور ان کی موجودگی میں زبان کو لگام دئے رہتی تھی۔ مگر اس کی ساری کسر نکال لیتی تھی آننا اندریئونا پر، کیونکہ ہر بار وہ ان کے ساتھ بدزبانی سے پیش آتی اور مالکہ پر حکم چلانے کی کھلے عام کوشش کرتی تھی اگرچہ یہ بھی ہے کہ بڑی بی اور نتاشا سے اسے دلی لگاؤ تھا اور ان کا درد دل میں رکھتی تھی۔ میں ماتریونا کو اس زمانے سے جانتا تھا جب ہم لوگ اخمنیفکا کی زمینداری میں رہتے تھے۔

’’ہونہہ... بھیک جانا اچھا نہیں ہوتا اور پھر دیکھو یہ لوگ تمھیں چائے کو بھی نہیں پوچھتے،‘‘ بڑے میاں منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

آننا اندریئونا نے مجھے آنکھ ماری۔ بڑے میاں کو اس طرح کے غمزے پسند نہ تھے، وہ ایسے بن گئے گویا ہم پر نظر ہی نہیں۔ مگر چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ آننا اندریئونا نے ابھی ابھی ان کے سلسلے میں مجھے آنکھ کا اشارہ کیا ہے۔

’’ابھی میں اپنے معاملے میں لگا ہوا تھا، وانیا،‘‘ وہ ایک دم بولے ’’نہایت واہیات چیز ہے یہ۔ میں نے تمھیں بتایا کیا کہ مقدمہ

میرے خلاف پڑ رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ میرے پاس ثابت کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ کاغذوں دستاویزوں کی کمی ہے۔ اور جو ہیں وہ کام نہیں آئیں گے، ایسا لگتا ہے... ہونہہ!‘‘

وہ اپنے اس مقدمے کے بارے میں بات کر رہے تھے جو پرنس سے ابھی تک چل رہا تھا اور نکولائی سرگیئچ کے خلاف جا پڑا تھا۔ میں چپ رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں۔ انہوں نے مجھے مشتبہ نظر سے دیکھا۔

’’ہاں تو!‘‘ وہ ایک‌دم بولے، ایسے بگڑکر جیسے ہماری خاموشی انہیں ناگوار گزری ہے ’’جتنی جلدی قصہ پاک ہو، اچھا ہے۔ اگر میرے خلاف ڈگری بھی انہیں مل گئی تو میں ناک نہیں رگڑوں گا۔ میرا ضمیر صاف ہے۔ جیسے جی چاہے فیصلہ کردیں۔ کم سے کم یہ جھگڑا تو نمٹے گا۔ معاملہ ختم ہو... میرا دیوالہ نکلوا دیں... کیا ہے، میں سب کچھ پھینک پھانک کر سائبیریا چل دوں گا۔‘‘

’’توبہ ہے۔ چل دینے کو بھی کیا جگہ سوجھی ہے۔ بھلا اتنی دور کاہے کو؟‘‘ آننا اندریئونا ضبط نہ کرسکیں۔

’’اور یہیں کس سے قریب رہنا ہے؟‘‘ انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ مگر یہ بات انہیں اچھی لگی کہ ٹوکا تو ہے کسی نے۔

’’یہاں اور کچھ نہیں تو... لوگوں سے ہی قریب ہیں‘‘ آننا اندریئونا بولیں اور غمگین نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

’’کس قسم کے لوگوں سے؟‘‘ وہ قریب قریب چیخ کر بولے۔ اپنی غضب‌ناک نظریں میری طرف سے ہٹا کر آننا اندریئونا پر ڈالیں اور پھر وہاں سے ہٹالیں۔ ’’کس قسم کے لوگوں سے؟ چور اچکے، ڈاکو، بدمعاش؟ ایسے تو ہر جگہ بھرے پڑے ہیں۔ فکر نہ کرو، سائبیریا میں بھی ایسے مل جائیں گے۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا نہ چاہو تو کوئی زبردستی نہیں ہے— تم یہیں رہ جانا۔‘‘

’’میرے پیارے نکولائی سرگیئچ، تمہارے بغیر بھلا میرا کون بیٹھا ہے جس کے پاس رہ جاؤں گی!‘‘ بے‌چاری آننا اندریئونا روہانسی ہوکر بولیں ’’ساری دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی...‘‘

لفظ ان کے حلق میں پھنس گئے۔ وہ چپ ہو گئیں اور میری طرف مڑ کر یوں اندیشے بھری نظر سے دیکھا جیسے مجھ سے مدد اور حمایت طلب کر رہی ہوں۔ بڑے میاں اس وقت بری طرح

بگڑے ہوئے تھے اور کسی چیز پر بھی پھر سکتے تھے، ان کی بات کاٹنا ٹھیک نہیں تھا۔

”گھبرائیے نہیں، آنا اندریئونا، سائبیریا اتنی بری جگہ نہیں ہے جتنی بظاہر لگتی ہے۔ اگر حالات بد سے بدتر ہو گئے اور آپ کو اخمتیفکا کی زمین جائداد بیچنی ہی پڑی تو نکولائی سرگیئچ کا ارادہ نہایت مناسب ہے۔ سائبیریا میں ان کو اعلیٰ درجے کی معقول نوکری مل جائےگی اور پھر...“

”خیر، غنیمت ہے ایوان کہ تم کام کی بات کر رہے ہو۔ میں نے جی میں یہی سوچ رکھا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں گا۔“

”ہائے، اس کا تو مجھے گمان تک نہ تھا!“ آنا اندریئونا ہاتھ پر ہاتھ مار کر چیخیں ”اب تم بھی وانیا، انہی کی سی کہنے لگے! تمہاری طرف سے تو ایوان پتروویچ مجھے اس کا اندیشہ نہیں تھا... سوائے شفقت کے آپ کو ہم سے کچھ نہ ملا ہوگا، کیوں؟ اور اب آپ بھی...“

”اہا، ہا — اور تمہیں کس بات کی امید تھی؟ ذرا سوچو تو اور کس طرح یہاں بسر ہوگی۔ روپیہ نبٹ گیا۔ آخری پیسوں پر گزارا ہے۔ تو کیا اب یہ حکم دینے والی ہو کہ میں پرنس پیوتر الیکساندرووچ کی خدمت میں پہنچ کر ہاتھ جوڑوں کہ وہ مجھے معاف کر دے؟“

پیوتر الیکساندرووچ کا نام سن کر آنا اندریئونا خوف سے لرز اٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں چائے کا چمچہ طشتری سے ٹکرا کر بجنے لگا۔

”نہیں واقعی، اس میں کیا ہے،“ نکولائی سرگیئچ کینہ اور ضد سے بھری ہوئی خوشی سے گرم ہو کر بولتے گئے ”کیا خیال ہے تمہارا وانیا، کیسا رہے گا کہ میں واقعی اس کی خدمت میں پہنچوں؟ سائبیریا جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہی اچھا رہے گا کہ کل خوب عمدہ سوٹ نکالوں، بال بناؤں، اپنا حلیہ ٹھیک ٹھاک کروں۔ آنا اندریئونا ایک نئی سفید واسکٹ کلف کرکے تیار کر دیں گی (بھلا اس جیسی ہستی کی خدمت میں آدمی یوں ہی تھوڑئی جا سکتا ہے)۔ نئے دستانے بھی خرید لاؤں گا تاکہ سراپا درست رہے۔ اور پھر پرنس بہادر کی خدمت میں حاضر ہوں گا کہ ’اے حضور والا! ہمارے مائی باپ، ہمارے سرپرست! خطاوار کو معاف کر دیجئے!

مجھ پر رحم کیجئے۔ مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا عنایت کیجئے۔ میں بال بچےوالا ہوں!، کیوں یہ ٹھیک رہےگا نا آنا اندریئونا؟ تم یہی چاہتی ہو نا؟“

”ہائے میرے پیارے... مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ بس تو یوں ہی سوچے سمجھے بغیر بول پڑی تھی۔ مجھ سے خطا ہو گئی۔ معاف کر دو۔ بس، تم چلاؤ نہیں“ آنا اندریئونا نے خوف سے اور زیادہ کانپتے ہوئے کہا۔

مجھے یقین ہے کہ جب بڑے میاں نے اپنی غریب بیوی کی آنکھوں میں آنسو اور خوف لرزتے دیکھا تو ان کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ غمزدہ ہو گئے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ بڑے میاں اپنی بیوی سے بھی زیادہ دکھی تھے لیکن یہ کہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ کبھی کبھی نہایت شریف، نیکدل مگر کمزور اعصاب کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ نرمی اور شرافت کے باوجود وہ اپنے غم و غصے کو یہ چھوٹ دے دیتے ہیں کہ وہ انہیں بہاکر اس حد تک لے جائے جہاں خودغرضی کو تسکین ملے اور چاہے کچھ ہو جائے اپنی بات کہہ ڈالتے ہیں، خواہ اس کی وجہ سے دوسروں کو بلکہ کسی بےقصور آدمی کو صدمہ ہی کیوں نہ پہنچے اور اکثر حالتوں میں یہ بےقصور ہستی وہی ہوتی ہے جو ان سے بہت قریب ہو اور انہیں بہت پیاری ہو۔ عورتوں میں یہ خصلت عام ہے کہ چاہے غمزدہ اور اداس ہونے کا کوئی سبب ہو یا نہ ہو لیکن کبھی کبھی ان کو دکھی اور اداس بننے کا شوق ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اکثر مرد بھی اسی طبیعت کے واقع ہوئے ہیں اور ایسے ایسے مرد، جو نہ تو کمزور ہیں اور نہ ان پر نسوانی خصوصیات کا کوئی شائبہ گزرتا ہے۔ بڑے میاں کو چل اٹھتی تھی کہ جھگڑا کرنا چاہئے اگرچہ اس جھگڑے میں وہ خود ہی اذیت اٹھاتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ عین اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیا واقعی نکولائی سرگیئچ اس قسم کی راہ اختیار کر سکتے ہیں جیسی آنا اندریئونا سمجھ رہی ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ خدا نے ان کے دل میں نیکی ڈال دی ہو اور وہ نتاشا کے ہاں جا رہے ہوں لیکن راستے میں ارادہ بدل دیا ہو یا کوئی اور گڑبڑ ہو گئی ہو اور وہ اپنے اس ارادے سے باز آ گئے ہوں — یہ بات یقینی

طور پر ہونا ممکن تھی — اور اب وہ جھنجھلائے ہوئے، جلے ہوئے گھر واپس آئے ہیں اور اپنے ابھی ابھی کے ارادوں پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں، انہیں اپنی نیت پر شرمندگی ہو رہی ہے اور اب کسی ایسے وجود کی تلاش ہے جس پر غصہ اتار سکیں جو خود اپنی کمزوری کا غصہ ہے اور جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ بھی یہی جذبات اور یہی نیت رکھتے تھے ان پر وہ طیش کھائے ہوئے ہیں۔ غالباً ایسا ہوا ہے کہ جب بڑے میاں نے اپنی بیٹی کو معاف کرنے کی سوچی تو ان کی آنکھوں کے آگے تصویر آ گئی کہ بیچاری آننا اندریئونا اس بات سے کس قدر خوش ہوں گی، پھولی نہ سمائیں گی، لیکن جب اس ارادے کا حاصل کچھ بھی نہ نکلا تو اب آننا اندریئونا ہی کی شامت آئی ہے اور انہی کو سب سے پہلے اس غصے کا شکار ہونا پڑا ہے۔

مگر شوہر کے سامنے آننا اندریئونا خوف و دہشت سے تھرتھرائیں تو ان کی دکھ بھری آنکھوں سے بڑے میاں کو خود تکلیف ہوئی۔ وہ اپنے بگڑ جانے پر، معلوم ہوتا ہے کہ پچھتائے اور خود کو لمحے بھر کے لئے سنبھال لیا۔ ہم سب خاموش تھے، میں اس کوشش میں تھا کہ بڑے میاں سے نظر چار نہ ہو۔ لیکن یہ بھلا وقت دیر تک باقی نہ رہا۔ کچھ بھی نتیجہ ہو انہیں تو پھٹ پڑنے سے یا اگر ضرورت پڑے تو ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے اپنے دل کا بخار نکالنا تھا۔

"دیکھو، وانیا"، وہ آخر ایک دم سے بولے "افسوس ہے، مجھے کہنا تو نہ چاہئے تھا، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ مجھے صاف طور سے گول مول بات کئے بغیر برملا کہہ دینا چاہئے اور ہر صاف گو آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ کہہ ڈالے... ہاں تو سمجھے وانیا؟ مجھے خوشی ہے کہ تم آ گئے، اور میں پکار کر تمہاری موجودگی میں کہہ دینا چاہتا ہوں تاکہ دوسروں کے بھی کان میں پڑ جائے کہ مجھے اس بکواس سے کوفت ہونے لگی ہے، میں ان آنسوؤں، سسکیوں، آہوں اور کراہوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ جس کو میں نے ایک بار اپنے دل سے نکال پھینکا، دل کا اتنا لہو جلا، قلق ہوا، سب کچھ سہا اب اسے دوبارہ میں اپنے دل میں جگہ دینے والا نہیں ہوں۔ یہ میرا قول ہے اور عمل بھی یہی ہوگا۔ میرا اشارہ ہے اس واقعے کی طرف جو چھ مہینے پہلے ہو چکا ہے۔ سمجھے نا تم میرا

مطلب، وانیا؟ میں اس کے بارے میں یوں کھل کر اور صاف طور سے کہہ رہا ہوں کہ اب میرے لفظوں کے بارے میں کوئی غلط‌فہمی نہ ہونی چاہئے"، انہوں نے میری طرف خون‌آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اپنی بیوی کی طرف نہیں دیکھا اس خیال سے کہ ان کی سہمی ہوئی نظر سے نظر چار نہ ہو جائے۔ "میں پھر دہراتا ہوں — یہ نہایت بےہودہ بات ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا!.. جس بات پر مجھے بےحد طیش آتا ہے وہ یہ کہ ہر کوئی میرے متعلق اس قسم کی رائے قائم کر لیتا ہے کہ میں ایسے گرے ہوئے کمزور جذبات کا آدمی ہوں، گویا کوئی احمق ہوں، گویا میں کوئی پاجی کمینہ آدمی ہوں، غم سے دیوانہ ہوا جا رہا ہوں... بکواس! بس ختم، میں نے دل سے وہ پہلے کے جذبات ہی نکال پھینکے۔ اب یاد کرنے کا کوئی سوال نہیں رہا میرے لئے۔ بالکل نہیں، قطعی نہیں۔ ہرگز نہیں — اور نہیں!.."

وہ اپنی کرسی سے اچھلے اور میز پر اس زور سے مکا مارا کہ چائے کی پیالیاں جھنجھنا اٹھیں۔

"نکولائی سرگیئچ! کیا آپ کو آننا اندریئونا پر ترس نہیں آتا؟ ذرا دیکھئے تو آپ ان پر کیا ستم کر رہے ہیں!"، میں نے کہا۔ اب مجھ میں ضبط کا یارا نہ رہا تھا اور یہ کہتے ہوئے میں نے ان کی طرف تحقیرآمیز نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر صرف آگ پر تیل چھڑکا۔

"نہیں، مجھے بالکل ترس نہیں آتا!"، وہ زور سے چیخے اور کانپتے ہوئے سفید پڑ گئے۔ "مجھے کسی پر ترس نہیں کیونکہ مجھ پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ ترس نہیں آتا کیونکہ خود میرے گھر میں میری لٹی‌پٹی آبرو کے خلاف سسکوٹ کی جاتی ہے۔ اور میری بگڑی ہوئی بیٹی کی حمایت کی جاتی ہے جو اس قابل ہے کہ اسے بالکل عاق کر دیا جائے اور ہر طرح کی سزا دی جائے!.."

"نکولائی سرگیئچ، آپ اس کے حق میں بددعا کا کلمہ منہ سے مت نکالئے، جو جی چاہے کہئے، مگر بیٹی کو عاق کرنے کا لفظ نہ کہئے!"، آننا اندریئونا گڑگڑائیں۔

"اسے میں عاق کرتا ہوں!"، بڑے میاں پہلے سے دگنی بلند آواز میں چیخے۔ "کیونکہ مجھ سے، جو ذلتوں کا مارا ہوا ہے، جس کی آبرو خاک میں ملائی جا چکی ہے، یہ توقع کی جاتی ہے

که میں اس ذلیل چھوکری کے پاس جاؤں اور اس سے معافی مانگوں — جی ہاں! بس، یہی بات ہے ساری۔ اس طرح سے مجھے خود اپنے گھر میں دن رات تنگ کیا جاتا ہے، آنسو بہائے جاتے ہیں، سسکیاں بھری جاتی ہیں اور بےوقوفی کے اشارے کئے جاتے ہیں۔ مجھے ترس کھلوانا چاہتے ہیں مگر دیکھو، وانیا، دیکھو،،
انہوں نے بیان جاری رکھا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی باہر کی جیب سے جلدی جلدی کاغذ نکالتے ہوئے بولے ''یہ رہے ہمارے مقدمے کے کاغذات! ان سے صاف یہ نکلتا ہے کہ میں چور ہوں، میں نے غبن کیا، کمینہ پن کیا، اپنے محسن کو لوٹا!.. میں ذلیل ہوا، میری آبرو خاک میں ملی۔ کیوں؟ اس لڑکی کی وجہ سے! لو۔ یہ رہے۔ دیکھو۔ اب دیکھو ان کو!..،،

اور وہ اپنی باہر کی جیب سے طرح طرح کے کاغذ الٹنے اور انہیں یکے بعد دیگرے میز پر پٹکنے لگے۔ اور ان میں بڑی بےصبری سے کسی ایک کاغذ کو نکالنے کے لئے ہاتھ مارتے رہے جو وہ مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت ایسی کہ جس کاغذ کی انہیں بےقراری تھی وہی ہاتھ نہ لگا۔ اضطراری حالت میں انہوں نے اپنی جیب سے ہر وہ چیز نکال پھینکی جس پر ان کا ہاتھ پڑ سکتا تھا اور اچانک ٹھن سے کوئی وزنی چیز میز پر بجی۔ آننا اندریئونا کی چیخ نکل گئی۔ یہ وہی گم‌شدہ لاکٹ تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ بڑے میاں کے بدن سے خون کنپٹیوں کی طرف دوڑا اور ان کے گال تمتما اٹھے۔ وہ چونک پڑے۔ آننا اندریئونا ہاتھ باندھے کھڑی تھیں اور ان کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایک پرمسرت امید کا اجالا پھیل گیا۔ بڑے میاں کا چہرہ سرخ ہو جانا، ان کا ہمارے سامنے جھینپ جانا... ہاں ٹھیک ہے، آننا اندریئونا نے کچھ غلط نہیں سوچا تھا۔ اب وہ بالکل سمجھ چکی تھیں کہ لاکٹ کیسے گم ہوا۔

پورا معاملہ صاف تھا کہ بڑے میاں کو لاکٹ ملا، انہیں یہ پاکر بڑی خوشی ہوئی اور غالباً خوشی کے مارے کانپتے ہوئے انہوں نے اسے سب کی نظروں سے چھپا لیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ کہیں اکیلے میں انہوں نے اپنی چہیتی بیٹی کی تصویر بےپناہ محبت سے دیکھی ہوگی اور دیکھتے رہ گئے ہوں گے۔ بلکہ شاید بیچاری دکھی

ماں کی طرح انہوں نے بھی سب کی نظروں سے دور بند کمرے میں پیاری نتاشا سے باتیں کی ہوں گی، اس سے آپ ہی آپ باتیں کی ہوں گی، رات کو دل مسوس کر اور سینے میں آہیں گھونٹ کر اپنی بچی کی تصویر چومی ہوگی، اسے تھپکا ہوگا اور ڈانٹ ڈپٹ گالی کوسنے کے بجائے ان کے دل میں اسی بیٹی کو معاف کر دینے اور دعا دینے کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا جس سے وہ ملنے تک کو تیار نہ تھے اور جسے دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہتے تھے۔

''تو میرے پیارے، تمہیں اب بھی اس کی چاہ ہے؟،، آننا اندریئونا چیخ پڑیں، اب ان میں تاب ضبط نہ رہی تھی کہ اس سخت گیر باپ کے سامنے چپ رہ سکتیں، جو ابھی ابھی ان کی نتاشا کو کوس رہا تھا۔

لیکن ابھی آننا اندریئونا کے منہ سے حیرت کے یہ لفظ سنے نہ ہوں گے کہ بڑے میاں کی آنکھوں میں جنونی غصہ اتر آیا۔ انہوں نے لاکٹ پر ہاتھ مارکر اسے اٹھا لیا اور بہت زور سے زمین پر پھینک کر مارا اور پھر آپے سے باہر ہوکر وہ پیر سے اسے روندنے لگے۔

''ہمیشہ کے لئے، ہمیشہ کے لئے عاق کیا میں نے تجھے!،، وہ پھٹ پڑے۔ ان کی آواز بھرا رہی تھی اور سینے میں سانس نہیں سما رہا تھا۔ ''ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے!،،

''توبہ ہے میری!،، ماں چلائی ''اسے، ارے اسے! میری نتاشا کو! اس کے پیارے مکھڑے کو پاؤں سے... کچلے ڈالتے ہو۔ پیروں سے؟ ظالم!.. بےدرد، سنگدل! مغرور!،،

اپنی بیوی کی چیخ پکار سن کے بپھرے ہوئے بڑے میاں خوف کے مارے رک گئے کہ یہ کیا کیا؟ ایک دم انہوں نے لاکٹ زمین سے اٹھا لیا اور دروازے کی طرف دوڑے لیکن ابھی دو قدم نہ بڑھے ہوں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑے اور سامنے جو صوفہ پڑا تھا اس پر بازو ڈال کر انہوں نے سر نہوڑا دیا۔

وہ سسکیاں لینے لگے بچے کی طرح، عورت کی طرح۔ ان کے سینے میں آہیں اور آنسو ایسے گھٹے گویا ان کی شدت سے سینہ پھٹ جائے گا۔ وہی بڑے میاں جو ابھی غصے سے گرج رہے تھے دم بھر میں بچے سے بھی زیادہ نرم پڑ گئے۔ اب ان میں اتنا دم نہ تھا کہ نتاشا پر لعنت بھیج سکتے۔ اب انہیں ہماری موجودگی کا بھی

پاس نہ رہا تھا اور محبت کی آگ میں اسی تصویر کو جسے ذرا پہلے پیر سے روند رہے تھے، اپنے بوسوں میں ڈبوئے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بیٹی کی طرف ان کی وہ ساری شفقت، وہ تمام محبت، جو اب تک ضبط کرکے رکھی تھی، اب ایک دم بےپناہ قوت کے ساتھ پھٹ پڑنے کو بےچین ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا وجود بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والا ہے۔

"معاف کر دو، معاف کر دو اسے!" آننا اندریئونا نے سسکیاں لیتے ہوئے، ان پر جھکتے ہوئے، انہیں سینے سے لگاتے ہوئے التجا کی۔ "اسے گھر واپس لے آؤ، میرے پیارے! خداوند عالم حشر کے دن تمہیں اس رحم و کرم اور بردباری کی جزا دے گا!"

"نہیں، ہرگز نہیں! کسی صورت نہیں!" وہ بھرائی ہوئی گلے میں پھنسی ہوئی آواز سے چیخے "یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

چودھواں باب

دیر ہو گئی تھی، دس بج چکے تھے جب میں نتاشا کے ہاں پہنچا۔ ان دنوں وہ سیمیونوفسکی پل کے پاس فونتانکا سڑک پر رہتی تھی۔ یہ مکان چوتھی منزل پر تھا، فلیٹوں کے ایک گندے بلاک میں جو کسی بیوپاری کلوتوشکن کی ملکیت تھا۔ جب شروع شروع میں وہ گھر سے نکلی تھی تو تھوڑے دنوں وہ الیوشا کے ساتھ ایک اچھے سے فلیٹ میں رہی۔ یہ تھا تو چھوٹا لیکن خوبصورت اور آرام‌دہ اور لیتینایا سڑک پر ایک عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ لیکن نوجوان صاحب‌زادے کے ذرائع آمدنی بند ہونے لگے۔ وہ موسیقی کا استاد تو نہ بنا مگر روپیہ قرض ادھار لیتا رہا اور تھوڑے عرصے میں ہی مقروض ہو گیا۔ اس نے فلیٹ کے سجانے میں اور نتاشا کو تحفے تحائف دینے میں سارا روپیہ اڑا دیا حالانکہ نتاشا اس کی فضول خرچیوں کو روکنے کی کوشش کرتی رہتی تھی، اسے ڈانٹتی ڈپٹتی اور کبھی کبھی رو بھی پڑتی تھی۔ الیوشا کی طبیعت جذباتی اور اثرپذیر تو تھی ہی۔ وہ ہفتہ ہفتہ بھر ان خوابوں کے مزے لیا کرتا تھا کہ وہ کیونکر نتاشا کو کسی چیز

کا تحفہ دے گا اور وہ کیسے اسے قبول کرے گی۔ اور اس معاملے کو اس نے اپنے لئے خاص تقریب بنا رکھا تھا اور مزے لے لے کر مجھے پہلے سے بتایا کرتا تھا کہ اس نے کیا منصوبہ سوچا ہے اور دل میں کیا ٹھان رکھی ہے۔ لیکن جب نتاشا منہ بناتی، روٹھتی اور آنسو بہانا شروع کرتی تھی تو وہ بیچارہ ایسا کھسیانا ہو جاتا تھا کہ دیکھنےوالے کو ترس آ جائے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ تحفے تحائف آپس میں بدکلامی، رنجش اور جھگڑوں کا باعث بنتے گئے۔ اس کے علاوہ الیوشا نے نتاشا کو بتائے بغیر بہت روپیہ بہا دیا۔ یار دوستوں میں جی بہلاتا پھرا۔ نتاشا کا حق دوسروں میں لٹایا۔ طرح طرح کی جوزفینوں، مِنّاؤں کے ہاں آمد و رفت شروع کردی اگرچہ یہ بھی ہے کہ اسے ابھی تک نتاشا سے بہت محبت تھی۔ اس کی محبت میں ایک قسم کا درد اور افسوس پنہاں تھا۔ وہ اکثر جب مجھ سے ملنے آتا تو اداس اور الجھا ہوا ہوتا، کہنے لگتا کہ میں تو اپنی نتاشا کی چھنگلیا کے قابل بھی نہیں ہوں۔ میں بہت اجڈ اور بدطینت آدمی ہوں، نہ تو اسے سمجھنا میرے بس کا ہے، نہ اس کی محبت کے شایان شان ہوں۔ اس میں ایک حصہ سچائی ضرور تھی۔ ان دونوں میں کوئی برابری نہ تھی۔ نتاشا کے سامنے وہ بچہ لگتا تھا اور وہ اسے بچہ ہی شمار کرتی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرکر میرے سامنے کسی جوزفین سے اپنے تعلقات کا اقرار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی قسم دے دی کہ میں نتاشا سے اس کے بارے میں کچھ نہ کہوں اور جب ان سب اقراروں کے بعد وہ نتاشا کے پاس دبتا ہوا، لرزتا ہوا واپس پہنچا (اور مجھ سے ضد کی کہ میں بھی ساتھ جاؤں کیونکہ جو کچھ حرکت سرزد ہو چکی ہے اس کے بعد نتاشا سے نظر چار کرنے میں ڈر لگتا ہے اور صرف ایک میں ہوں جو ایسے وقت اس کے کام آ سکتا ہوں) تو نتاشا نے اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی سمجھ لیا کہ معاملہ کیا ہے۔ نتاشا میں رقابت کی آگ بہت تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی تمام بھول چوک معاف کیسے کر دیتی تھی۔ عام طور سے ایسا ہوتا تھا کہ الیوشا میرے ساتھ گھر میں داخل ہوا، بہت دبتے دبتے نتاشا سے بات کی، بہت جھینپی ہوئی نظر سے نتاشا کو دیکھا۔ وہ دیکھتے ہی تاڑ گئی کہ الیوشا سے کوئی غلط حرکت سرزد ہوئی ہے لیکن جان بوجھ کر انجان

بن گئی۔ وہ کبھی اس سوال کو چھیڑنے کی پہل نہیں کرتی
تھی، نہ اس سے پوچھ گچھ کرتی تھی بلکہ اس کے بجائے اور دگنی
محبت سے اسے گلے لگاتی، اس کے ساتھ اور زیادہ پیار محبت کرتی
اور ہنستی کھیلتی — اور یہ کوئی اس کی جانب سے اداکاری یا
پہلے سے سوچی سمجھی چال نہ ہوتی تھی۔ نہیں، اس کی نیک
سیرت کو بے پناہ لطف اور راحت اسی میں ملتی تھی کہ وہ اس
کی غلطی سے چشم پوشی کرے اور بھول جائے۔ ایسے الیوشا کو
معاف کر دینے کا عمل خود اپنے اندر خاص قسم کی پراسرار کشش
رکھتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک معاملہ صرف جوزفین جیسی
عورتوں کی ذات کا تھا۔ جوں ہی الیوشا دیکھتا کہ نتاشا یوں
جھکی ہوئی ہے اور درگزر کرنے پر تلی ہے تو وہ خود اس راز
کو سینے میں دبا نہ پاتا تھا اور فوراً کھل کر کسی کے پوچھے
بغیر سارا قصہ سنا ڈالتا تھا تاکہ اپنے ضمیر کو اس کے بوجھ سے
ہلکا کر لے اور بقول خود ''پہلے کا سا،، ہو جائے۔ نتاشا جب
اسے معاف کر دیتی تو اس سے الیوشا کو بڑا لطف آتا، کبھی کبھی
ایسا بھی ہوا کہ ادھر نتاشا نے بخشا ادھر وہ خوشی کے مارے
رونے لگا، اور نتاشا کو فرط مسرت سے چومنے اور سینے سے لگانے
لگا، پھر فوراً ہی اسے جوش آ جاتا تھا اور وہ بچوں کی سی صاف گوئی
سے کام لیتے ہوئے اسے جوزفین کے ساتھ اپنا کارنامہ سنا ڈالتا اور
خوب قہقہہ مارتا، نتاشا کو شاباشیاں دیتا اور اس کی خوب تعریفیں
کرتا اور اس طرح آدھی رات ہنسی خوشی گزر جاتی۔ جب ساری
رقم اس کے ہاتھ سے نکل چکی تو پھر چیزیں بیچنے کی باری آئی۔
نتاشا کے اصرار پر فونتانکا سڑک پر کم کرائے کا سستا سا مکان
لیا گیا۔ اس کے بعد بھی گھر کا سامان بیچ بیچ کر کام چلتا
رہا یہاں تک کہ نتاشا کو اپنا لباس بیچنا پڑا اور اس نے کام
تلاش کرنا شروع کر دیا۔ جب الیوشا کو اس کا پتہ چلا تو
اس کے افسوس کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے خود کو لعنت ملامت
کی، چیخا چلایا کہ میں خود اپنی خطاؤں کا ذمہ دار ہوں، مگر
اس درمیان میں حالت ذرا بھی نہیں سنبھلی۔ اس وقت تک خود
اس کے تمام آخری ذریعے بھی نمٹ چلے تھے۔ اب نتاشا کے ہاتھ
میں کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ کام کرے اور اس کی آمدنی
برائے نام تھی۔

بالکل شروع میں جب نتاشا اور الیوشا دونوں ساتھ رہتے تھے
تو الیوشا نے باپ سے اس سلسلے میں سخت جھگڑا کر لیا تھا۔
پرنس والکوفسکی نے اپنے بیٹے کی کاتیرینا فیودوروونا فیلیمونووا یعنی
کاؤنٹیس کی سوتیلی بیٹی سے شادی کرا دینے کی جو ٹھان رکھی تھی
وہ ابھی محض منصوبے کے درجے میں تھی۔ لیکن ان کا اصرار
بہت بڑھا ہوا تھا۔ باپ بیٹے کو لے کر جایا کرتا تھا تاکہ لڑکی
سے اس کی ملاقات کرائی جائے۔ بیٹے کو انہوں نے اکسایا بھی
تھا کہ وہ لڑکی سے گھلے ملے اور اسے اپنی طرف مائل کرے۔ اس
کے علاوہ دلیل سے، سختی سے اسے قائل معقول کرنے کی بھی کوشش
کی تھی، لیکن کاؤنٹیس کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اتنے
میں نتاشا سے الیوشا کا یہ قصہ ہو گیا اور باپ نے اس طرف سے
چشم پوشی کر لی۔ اس نے ٹال دیا کہ ذرا وقت گزر جانے دو۔ وہ
خوب آگاہ تھا کہ بیٹا خیال کا کمزور اور ارادے کا کچا ہے اور
اسے امید تھی کہ یہ محبت کا جنون چار دن کی چاندنی ہے۔ رہا
یہ معاملہ کہ کہیں الیوشا نتاشا سے شادی نہ رچا لے تو پرنس
نے آخر میں اس پر اپنا دماغ کھپانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور خود
اس جوڑے نے شادی کا معاملہ اس دن کے لئے اٹھا رکھا تھا جب
تک بیٹے کی باپ سے صلح صفائی نہ ہوجائے یا جب تک حالات میں
تبدیلی نہ ہو جائے۔ بہرحال نتاشا بظاہر خود اس پر آمادہ نہ تھی
کہ یہ بات چھیڑے۔ خود الیوشا کے منہ سے ایک روز میرے سامنے
رازدارانہ طور پر یہ بات نکل گئی کہ ابا جان اس سارے قضیے سے
کسی قدر خوش نظر آتے ہیں کہ اس معاملے میں اخمنیف کو نیچا
ہونا پڑا۔ بظاہر دکھانے کو وہ بیٹے کے ساتھ ناراضگی کا سا
برتاؤ کرتے رہے اور انہوں نے وہ جیب خرچ، جو پہلے ہی کچھ
زیادہ نہ تھا، کم کر دیا (صاحب‌زادے کو جیب خرچ کی بڑی
شکایت تھی) اور اب بالکل بند کرنے کی دھمکی دیتے تھے۔ زیادہ
عرصہ نہ گزرا تھا کہ کاؤنٹیس کے پیچھے پیچھے پرنس پولینڈ چل
دیا۔ کاؤنٹیس وہاں کسی کام سے گئی تھیں۔ پرنس اب کی بار
بھی منگنی کی تجویز لئے ہوئے پہنچا۔ یہ درست ہے کہ الیوشا
کی عمر ابھی شادی کی نہ تھی لیکن اس کا کیا علاج کہ لڑکی کافی
مالدار تھی اور اس طرح کے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا ممکن
نہ تھا۔ آخر پرنس کو اپنے منشا میں کامیابی ہوئی۔ ہم تک

یہ خبر اڑتی ہوئی پہنچی کہ اب اس معاملے نے حسب منشا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں انہی دنوں پرنس پولینڈ سے پیٹرسبرگ واپس آیا تھا۔ وہ اب کے بڑے پیار سے اپنے بیٹے سے ملا لیکن اس نے جو دیکھا کہ الیوشا ابھی تک نتاشا سے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہے، یہ اسے ناگوار گزرا اور تعجب ہوا۔ وہ شبہ کرنے لگا اور ذرا گھبرایا بھی۔ اس نے سختی کی اور بہت شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ بیٹا ان تعلقات کا سلسلہ توڑ لے لیکن فوراً ہی حملے کا ایک اور کارگر طریقہ اسے سوجھا اور وہ بیٹے کو کاؤنٹیس کے ہاں لے کر پہنچا۔ پہلے شوہر سے کاؤنٹیس کی سوتیلی بیٹی نے اگرچہ ابھی لڑکپن سے شاید ہی قدم باہر رکھا ہوگا لیکن واقعی نہایت حسین تھی، نکسک سے درست، شاداب، ذہین، ہوشیار، دلکش، بےمثال شریف دل اور نفیس پاکیزہ روح کی مالک۔ پرنس نے یہ اندازہ لگایا کہ چھ مہینے ہو چکے ہیں، اس مدت کا کچھ تو اثر ضرور پڑا ہوگا۔ اب الیوشا کو نتاشا کی ذات میں نئے نویلے پن کی کشش تو نہ ملتی ہوگی، اور اب وہ باپ کی تجویز کی ہوئی منگیتر کے متعلق چھ مہینے پہلے کے مقابلے میں ذرا مختلف طریقے سے سوچے گا۔ وہ اپنے اندازے میں ایک حد تک ضرور صحیح تھا ... الیوشا واقعی اب ادھر کھنچا ہوا تھا۔ ہاں اتنا یہاں کہہ دوں کہ باپ نے ایک دم اپنا رویہ بدل دیا اور وہ غیرمعمولی طور پر بیٹے کے ساتھ شفقت اور محبت برتنے لگا (اگرچہ روپیہ دینے کو اب بھی تیار نہ تھا)۔ الیوشا کو محسوس ہوا کہ اگرچہ باپ نے زیادہ تپاک دکھایا ہے لیکن اس کے پردے میں ان کا وہی اٹل اور ضدی ارادہ پوشیدہ ہے۔ اس بات سے الیوشا کو رنج پہنچا لیکن اتنا رنج نہیں پہنچا جتنا اس وقت ہوتا اگر وہ کاتیرینا فیودوروونا سے روزانہ ملاقات نہ کر پاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ الیوشا کو نتاشا کے پاس گئے ہوئے آج پانچ دن ہو چکے ہیں۔ اب اخمنیف سے اس کے گھر جاتے مجھے اس خیال سے پریشانی ہو رہی تھی کہ بھلا وہ مجھ سے کیا بات کہنے والی ہے؟ ابھی گھر فاصلے پر تھا کہ مجھے نتاشا کی کھڑکی میں روشنی نظر آنے لگی۔ ہمارے درمیان بہت زمانے سے یہ طے تھا کہ جب نتاشا کو میری سخت ضرورت ہوگی اور وہ مجھے بلانے پر مجبور ہوگی تو کھڑکی میں روشنی رکھ دے گی

تاکہ میں اگر ادھر سے گزرتا ہوں (اور ادھر سے میں قریب قریب ہر شام گزرتا تھا) تو مجھے روشنی دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ میرا انتظار ہو رہا ہے اور نتاشا کو میری ضرورت ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے اس کھڑکی میں اکثر روشنی رہنے لگی تھی...

پندرھواں باب

میں مکان گیا تو نتاشا اکیلی تھی اور کمرے میں آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی، ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے، اپنے خیالوں میں غرق۔ میز پر سماوار رکھا تھا جس کے انگارے بجھتے جا رہے تھے۔ سماوار بڑی دیر سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مسکراہٹ کے ساتھ نتاشا نے چپ چاپ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کا چہرہ پیلا تھا اور داستان غم سنا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک جذبۂ شہادت کی سی، صبروسکون کی سی لطافت پائی جاتی تھی۔ صاف وشفاف نیلی آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ اور بڑی ہو گئی ہیں اور بال پہلے سے بھی گھنے لگتے تھے۔ اس کے ستجانے اور بیمار رہنے کی وجہ سے ایسا نظر آتا تھا۔

"میں سمجھی کہ تم آؤ گے ہی نہیں"، نتاشا نے مجھے ہاتھ دیتے ہوئے کہا "میں ماورا کو تمہارے ہاں بھیجنے والی تھی کہ معلوم کرے کیا ہوا۔ ڈر تھا کہ کہیں پھر بیمار تو نہیں پڑ گئے تم۔"

"نہیں، بیمار تو نہیں پڑا، ہاں ذرا اٹک گیا تھا۔ ابھی سب بتاتا ہوں۔ تم اپنا حال کہو۔ نتاشا، کیا گزری؟"

"کچھ نہیں گزری"، وہ ایسے بولی جیسے اسے کچھ تعجب ہوا ہو۔ "کیوں، کیا بات ہے؟"

"کیوں، تم نے لکھا جو تھا، کل ہی تو لکھا تھا مجھے بلانے کو۔ اور وقت بھی مقرر کیا تھا کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد نہ آؤں۔ عام طور سے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

"ہاں۔ وہ تو مجھے کل اس کا انتظار تھا۔"

"تو کیا ہوا اسے، ابھی تک نہیں آیا یہاں؟"

"ابھی تک نہیں، میں نے سوچا کہ لاؤ، وہ نہیں آتا ہے تو اتنے میں تم سے ہی کہہ سن ڈالوں"، اس نے ذرا دم لے کر کہا۔

"اور آج رات اس کے آنے کی امید ہے؟"

"نہیں، امید نہیں۔ وہ رات گئے تک وہاں رہے گا۔"

"تو کیا سوچتی ہو تم، نتاشا؟ کیا وہ قطعی نہیں آنے والا؟"

"آئے گا تو خیر ضرور"، اس نے مجھے کسی خاص قسم کی سنجیدگی سے نظر بھر کے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اسے میرے تابڑتوڑ سوال پسند نہیں آئے۔ ہم دونوں چپ ہو گئے اور کمرے میں ٹہلتے رہے ادھر سے ادھر۔

"میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی وانیا، اور تمہیں خبر ہے میں کیا کر رہی تھی اس وقت؟" نتاشا نے مسکراہٹ کے ساتھ پھر کہنا شروع کیا۔ "میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی اور شعر گنگنا رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے گھنٹیوں کا بجنا اور سردی کا وہ راستہ۔ 'میرا سماوار بلوط کی میز پر سنسنا رہا ہے...'، ہم دونوں ساتھ پڑھا کرتے تھے:

تھم گیا طوفان، شفق نے راستے روشن کیے
ٹمٹمائے رات کی افسردہ آنکھوں کے دیے

. . . .

اور پھر یہ بول ہیں:

وہ صدا آئی، سنائی دی کسی کی لے وہاں
بج رہی ہیں گنگناتی، چھن چھناتی گھنٹیاں:
"ہائے! آتے ہوں گے ساجن، میرے ساجن آئیں گے
شاد ہوجائے گا سینہ، رکھ کے سر سو جائیں گے!
زندگی، یہ زندگی ہے! جب سویرے کی کرن
میرے شیشے کے دریچوں پر دکھاتی ہے پھبن
پھول پتی بن کے چھنتا ہے کڑے پالے کا نور
جوش کھاتا ہے سماوار، دل میں آتا ہے سرور
اور انگیٹھی میں چٹخنے ہیں دہکتے کوئلے
سیج کے کاڑھے ہوئے رنگین پردوں سے پرے..."*

---

* یہ اشعار پولونسکی (۱۸۱۹ء تا ۱۸۹۸ء) کے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے "گھنٹی"۔ (ایڈیٹر)

"ہائے کیا خوب! کیسے پردرد اشعار ہیں وانیا، اور کس قدر خیال انگیز کہ تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ ایک کنویس ہے جس پر ہلکا سا نقش کڑھا ہوا ہے، جو چاہو بن لو۔ دو طرح کی سنسنی ہے: پہلے کی بھی اور اب کی بھی۔ وہ سماوار، وہ گاڑھے کا موٹا پردہ — کس قدر اپناپن ہے ان میں... ایسا لگتا ہے کہ ہمارے چھوٹے سے شہر میں کوئی اوسط درجے کا بنگلہ ہے۔ اور میں جیسے اس مکان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں — نیا مکان، لٹھوں کا بنا ہوا۔ ابھی تختے بھی نہیں جوڑے گئے... اور پھر اس کے بعد یہ دوسری تصویر:

وہ صدا آئی، سنائی دی وہی آواز، ہاں!
بج رہی ہیں درد میں ڈوبی ہوئی سی گھنٹیاں:
"تم کہاں ہو، میرے ہمدم، کیا خبر، تم آہی جاؤ،
ہائے کیا ہو، تم جو آجاؤ تو سینے سے لگاؤ!
یہ بھی کوئی زندگی ہے! دل بجھا، آنکھیں ملول،
میری نگری میں اندھیرا ہے، مری کھڑکی میں دھول
ایک جھڑبیری، دریچے سے ادھر، بےبس، نراس
سخت پالے میں لرزتی ہے، نہیں کچھ آس پاس
کون جانے، جی رہی ہے، یا کبھی کی چل بسی
رنگ پردوں کے اڑے، ہے یہ بھی کوئی زندگی!
ایک میں دکھیا ہوں، تنہا، کس کے در جاکر رہوں
کون اٹھائے ناز میرے، بول میں کس کے سہوں
بدزباں بڑھیا ہے لے دے کر، کوئی اپنا نہیں
کون بگڑے، کون چاہے، چاہنے والا نہیں..."

"'ایک میں دکھیا ہوں'... یہ لفظ 'دکھیا'، کیا خوب رکھ دیا ہے یہاں پر۔ اور یہ 'تنہا، کس کے در جاکر رہوں، کون اٹھائے ناز میرے...'، اس میں کیا سوز ہے، کیا گداز ہے، جیسے یاد کرنے سے دل بھر آئے۔ اور سوز بھی کیسا جو خود مول لیا اور خود ہی اب عزیز ہے۔ اف خدایا، کیا خوب کہا! ٹھیک ایسے جیسے ہوتا ہے!..."

وہ خاموش ہو گئی جیسے وہ حلق میں اٹھتے ہوئے کسی طوفان سے جدوجہد کر رہی ہو۔

"وانیا، پیارے،، اس نے منٹ بھر بعد کہا اور پھر سوچ میں پڑگئی جیسے بھول گئی کہ کیا کہنا تھا یا یہ کہ بے سوچے سمجھے کسی اتفاقی جذبے میں بول گئی تھی۔

اس دوران ہم دونوں برابر کمرے میں ٹہلے جا رہے تھے۔ عبادت کے طاق میں دیا روشن تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے نتاشا زیادہ سے زیادہ خدا سے لو لگاتی جا رہی تھی اور اس کے بارے میں بحث چھیڑنا اسے پسند نہ تھا۔

"کیا کل تہوار کا دن ہے؟،، میں نے پوچھا "تمہارے ہاں روشنی جو ہو رہی ہے۔،،

"نہیں، کل تہوار تو نہیں ہے... وانیا، بھئی، تم بیٹھ جاؤ۔ تھک گئے ہوگے۔ کہو، چائے پیوگے تھوڑی سی؟ میرے خیال میں تم نے اب تک چائے بھی نہیں پی؟،،

"ہاں بیٹھ ہی جائیں نتاشا۔ مگر میں چائے تو پی چکا ہوں۔،،

"تم آ کہاں سے رہے ہو؟،،

"ان کے ہاں سے،، ہم اسی طرح نتاشا کے پرانے گھر کے بارے میں اشارہ کیا کرتے تھے۔

"ان کے ہاں سے؟ یعنی تم وہاں پہنچ کیسے گئے؟ خود چلے گئے تھے؟ یا انہوں نے بلوایا تھا؟،،

نتاشا نے مجھے سوالوں سے گھیر لیا۔ اندرونی کیفیت سے اس کا چہرہ اور پیلا پڑ گیا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ اسے بتایا کہ تمہارے والد سے ملاقات ہوئی تھی۔ ماں سے بات‌چیت ہوتی رہی اور وہ جو لاکٹ والا واقعہ پیش آیا۔ میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ایک ایک کیفیت کا نقشہ اس کے آگے کھینچا۔ میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ وہ بڑی توجہ اور غور سے سنتی رہی، ایک لفظ بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ لاکٹ والے واقعے نے تو اسے بالکل دہلا کر رکھ دیا۔

"ٹھیرو، ٹھیر جاؤ وانیا،، وہ برابر بیان کرتے مجھے ٹوکتی رہی۔ "مجھے ایک ایک بات خوب ٹھیک سے بتاؤ جتنا ہو سکے تفصیل سے۔ تم ذرا ٹھیک سے نہیں کہہ رہے ہو...،،

میں بار بار وہ قصہ دہراتا تھا، اور ہر لمحے مجھے تفصیل کے بارے میں اس کے مسلسل سوالوں کا جواب دینے کے لئے اٹکنا پڑتا تھا۔

"تو کیا تمہارا خیال ہے کہ واقعی وہ مجھ سے ملنے آ رہے تھے؟،،

"مجھے نہیں معلوم نتاشا، اور سچ پوچھو تو میں اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ تو کھلی بات ہے کہ انہیں تمہارا صدمہ ہے اور وہ تمہیں دل سے چاہتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی وہ تم سے ملنے چلے تھے یہ ایسا... ایسا کہ...،،

"اور انہوں نے لاکٹ کو پیار کیا تھا، کیا؟،، وہ بیچ میں پھر بول پڑی "جب انہوں نے لاکٹ چوما تو کیا کہا تھا؟،،

"وہ بےقابو ہو رہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جو منہ میں آیا چیختے گئے۔ تمہیں پیار کے ناموں سے یاد کیا۔ تمہیں بلایا ہے...،،

"بلایا ہے مجھے؟،،

"ہاں۔،،

وہ چپ‌چاپ رو پڑی۔

"بیچارے،، وہ بولی۔ "اور اگر انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے،، پھر ذرا چپ رہنے کے بعد اس نے اضافہ کیا "کیا تعجب ہے۔ وہ الیوشا کے باپ کے بارے میں بھی تو سب کچھ سنتے رہتے ہیں۔،،

"نتاشا،، میں نے لجاجت سے کہا "ہمیں ان کے پاس چلنا چاہئے...،،

"کب؟،، اس نے پوچھا، وہ بالکل پیلی پڑ گئی اور کرسی پر سے ذرا اٹھ گئی۔ اس نے سوچا کہ شاید میں ابھی اسی وقت چلنے کو کہہ رہا ہوں۔

"نہیں وانیا،، اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھتے ہوئے افسردگی سے مسکرا کر کہا "نہیں، میرے دوست، تم تو ہمیشہ سے یہی کہتے رہتے ہو۔ لیکن ہیں... میں جانوں، اس کا ذکر ہی نہ کرو تو اچھا ہے۔،،

"اچھا تو کیا یہ کم‌بخت قطع تعلق کبھی بھی، کسی وقت بھی ختم ہونے میں نہیں آئے گا؟،، میں غم‌وغصے سے چیخ پڑا۔ "تم میں اس قدر اکڑ ہے کہ پہل کرنے کو تیار نہیں ہو؟ یہ تمہاری ذمہ‌داری ہے، تمہارا فرض ہے۔ تمہیں اپنی طرف سے بڑھنا چاہئے۔ شاید تمہارے باپ اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ تم جاؤ تو وہ تمہیں معاف کر دیں... وہ تمہارے باپ ہیں۔ تم

نے انہیں صدمہ پہنچایا ہے۔ ان کی عزت کا تمہیں پاس ہونا چاہئے۔ بالکل بجا ہے، قدرتی بات ہے۔ تم ہی کو پہلا قدم اٹھانا ہوگا۔ کرکے دیکھو وہ تمہیں قطعی معاف کر دیں گے۔،،

’’قطعی معاف — یہ تو ہو نہیں سکتا۔ مجھے ملامت نہ کرو، وانیا، یہ بیکار ہے۔ دن رات مجھے اس کا خیال رہتا ہے۔ جب سے میں نے انہیں چھوڑا ہے، ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا جب اس بات کا مجھے خیال نہ آیا ہو۔ کئی بار تم سے بھی ذکر ہوا۔ تم تو خود جانتے ہو کہ یہ بات ناممکن ہے!،،

’’کر دیکھو۔،،

’’نہیں، میرے دوست، میں نہیں کر سکتی۔ اگر میں نے تمہارے کہنے پر عمل کیا بھی تو اس سے ان کو اور اپنے خلاف کر لوں گی۔ جو ہونا تھا ہو چکا، اب اس کی تلافی ممکن نہیں اور تم جانتے ہو کہ اس معاملے میں وہ کیا شے ہے جو اب لوٹ کر نہیں آسکتی؟ وہ پیارے مسرت کے دن لوٹ کر نہیں آئیں گے جو میں نے ان کے سائے میں گزارے۔ اگر میرے باپ نے مجھے معاف بھی کر دیا تب بھی میں ان کی نظر میں وہ نہیں رہوں گی جو تھی۔ انہیں چھوٹی بچی سے پیار تھا، وہ جو ایک بڑی بچی تھی۔ وہ میری بچپن کی سادگی کو چاہتے تھے۔ مجھے تھپکتے سہلاتے تھے، وہ اب بھی میرے بالوں کو اسی طرح تھپتھپاتے تھے جیسے اس وقت جب میں سات آٹھ برس کی بچی رہی ہوں گی اور ان کے زانو پر بیٹھ کر اپنے ننھے ننھے بچوں کے سے گیت گایا کرتی تھی۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تب سے لے کر آخری دن تک ان کا عمل یہ رہا کہ وہ رات کو میرے بستر کے پاس آتے اور دعائیں دم کیا کرتے تھے۔ میرے گھر چھوڑنے سے مہینہ بھر پہلے انہوں نے میرے لئے چپکے سے بندے خرید کر رکھے تھے (لیکن مجھے ان کا پتہ چل گیا) اور وہ بچوں کی طرح مزے میں تھے، انہیں یہ سوچ سوچ کر لطف آ رہا تھا کہ جب مجھے بندوں کا تحفہ ملے گا تو میں کیسی خوش ہوں گی۔ لیکن ہر ایک پر بگڑ گئے اور خاص طور سے مجھ پر، جب انہیں میری ہی زبانی پتہ چلا کہ مجھے بہت پہلے سے بندے خریدے جانے کی خبر ہو گئی تھی۔ گھر چھوڑنے سے تین دن پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ میں افسردہ

رہتی ہوں۔ وہ خود اس بات سے ایسے بجھے بجھے رہے کہ بیمار پڑ گئے۔ اور تمہیں یقین آئے گا کیا کہ میرا جی بہلانے کے لئے انہوں نے تھیٹر کے ٹکٹ خریدنے کی سوچی!.. واقعی، انہوں نے سوچا اس سے میرا دل ذرا بہل جائے گا۔ ہاں، میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ انہیں چھوٹی سی بچی سے پیار تھا، وہ اسی کو جانتے تھے، وہ تو یہ سوچنے تک کو تیار نہ تھے کہ میں بھی ایک دن عورت ہو جاؤں گی... یہ امکان ہی ان کے ذہن میں کبھی نہ آیا۔ اب اگر میں گھر گئی بھی تو وہ مجھے پہچانیں گے نہیں۔ اگر وہ مجھے معاف بھی کر دیں تو اب ان کا سامنا بالکل مختلف قسم کے وجود سے ہوگا۔ اب میں وہ نہیں رہی ہوں۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔ میں بہت نشیب و فراز سے گزر چکی ہوں۔ اگر میں نے راضی بھی کر لیا تب بھی یہ ضرور ہے کہ پہلے والی مسرت کے لوٹ کر نہ آنے کا غم انہیں ستاتا رہے گا۔ انہیں یہ دکھ رہے گا کہ اب میں ویسی نہیں رہی جیسی اس وقت تھی جب وہ بچی کی طرح مجھ سے پیار کرتے تھے۔ ماضی ہمیشہ سب سے اچھا لگتا ہے، بڑے درد سے اس کی یاد آتی ہے! وانیا، واقعی ماضی کس قدر پیارا تھا!،، وہ چیخ پڑی اور خود اپنے لفظوں میں بہہ گئی، یہ اچانک جملہ جو بڑے درد کے ساتھ اس کے دل سے پھوٹا تھا، نتاشا کے سلسلۂ بیان کو قطع کر گیا۔

’’جو کچھ تم نے کہا، سب صحیح ہے، نتاشا!،، میں نے جواب دیا۔ ’’مطلب یہ کہ انہیں چاہئے کہ تمہیں پھر سے سمجھیں اور تم سے ازسرنو محبت کریں۔ اصل بات ہے: سمجھنا۔ اچھا تو پھر، وہ تم سے کریں گے محبت، یہ تو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ تمہیں سمجھ نہیں سکتے یا پہچان نہیں سکتے۔ وہ، وہ جن کا ایسا بڑا دل ہے!،،

’’ہائے، وانیا، بے درد مت بنو۔ بھلا مجھ میں کیا رکھا ہے جو کوئی سمجھے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ تم جانو، اس کے علاوہ بھی کچھ ہے — باپ کی محبت میں بھی بڑی رقابت ہوتی ہے۔ انہیں لگتا ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی کی گئی کہ ان کی اطلاع کے بغیر سب کچھ ہو ہوا گیا، انہیں خبر نہیں ہوئی اور پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ جانتے ہیں کہ انہیں اس بات کا تو شبہ تک نہ تھا، اور اب وہ ہماری محبت کے اور میرے گھر

سے بھاگ آنے کے سارے افسوسناک نتائج کی ذمہ داری میری ناشکری، رازداری پر رکھتے ہیں، کہ میں خود سے ان کے پاس شروع میں ہی نہیں گئی، میں نے اپنی محبت شروع ہوتے ہی اپنے دل کی ایک ایک دھڑکن انہیں نہیں بتا دی۔ بلکہ اس کے برخلاف جتنا بن پڑا میں نے ان سے چھپایا۔ میں نے ان سے راز رکھا۔ اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، وانیا، کہ ان کے دل کی گہرائی میں یہ بات ہماری محبت کے نتائج سے یعنی اس سے بھی بدتر ہے کہ بیٹی والدین کو چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئی اور خود کو عاشق کے حوالے کر دیا۔ فرض کرو اب وہ مجھ سے باپ کی طرح ملتے ہیں، بڑے تپاک کے ساتھ، بڑی شفقت سے، تاہم رنجش کا جو بیج پڑ چکا ہے وہ اپنی جگہ باقی رہے گا۔ دو ایک دن کے بعد مایوسیاں نمودار ہوں گی، غلط فہمیاں پیدا ہوں گی، طعنے تشنے ہوں گے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھے قطعی طور سے معاف کرنے پر تیار نہ ہوں گے۔ اچھا فرض کرو میں کہتی ہوں، تہہ دل سے قبول کرتی ہوں، سمجھتی ہوں کہ ہاں میں نے انہیں بڑا صدمہ پہنچایا، ان کے ساتھ کس قدر ظلم کیا۔ اور اگر انہوں نے یہ اندازہ کرنے سے انکار کر دیا کہ مجھے الیوشا کے ساتھ عیش کا کس قدر بھگتان بھگتنا پڑا ہے اور خود میں نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں، تو اس سے مجھے صدمہ پہنچے گا، پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح اسے سہہ جاؤں گی لیکن میرے سہہ جانے سے بھی ان کی تسکین نہیں ہوگی۔ وہ مجھ سے اور زیادہ سخت کفارہ چاہیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ میں اپنے ماضی پر لعنت بھیجوں، الیوشا کو برا کہوں اور الیوشا کے ساتھ اپنی محبت سے اظہار بیزاری کروں۔ یہ ناممکن بات وہ مجھ سے چاہیں گے کہ ماضی کی تلافی ہو اور اپنی زندگی میں پچھلے چھ مہینے کو کاٹ کر پھینک دوں۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ کسی کو بددعا دوں، میں اب پچھتاوا نہ کر سکوں گی۔ اب اس کا کیا چارہ ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا... نہیں وانیا، ابھی مناسب نہیں۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

"تو پھر وقت کب آئے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم... ابھی ہمیں آئندہ کی مسرتیں حاصل کرنے

کے لئے اور دکھ بھرنے ہوں گے، اسے نئی مصیبتیں مول لے کر خریدنا ہوگا۔ مصائب سب کو پگھلا کر صاف کر دیتے ہیں۔ ہائے وانیا، زندگی میں کتنے دکھ بھرے ہیں!"

میں خاموش تھا اور اپنے خیالوں میں گم اسے تک رہا تھا۔

"تم مجھے ایسے کیوں تک رہے ہو الیوشا — معاف کرنا وانیا!" خود غلط نام لے دینے پر وہ مسکرا دی۔

"میں تمہاری مسکراہٹ کو تک رہا ہوں، نتاشا۔ تمہیں یہ ملی کہاں سے؟ پہلے تو تم اس طرح نہیں مسکراتی تھیں!"

"کیوں، میری مسکراہٹ میں کیا خاص بات ہے؟"

"یہ تو صحیح ہے نتاشا کہ تمہاری مسکراہٹ میں ابھی تک بچپن کی سادگی باقی ہے۔ لیکن جب تم ہنستی ہو تو ایسا لگتا ہے کہ دل کا درد بھی عین اسی وقت کروٹ لے رہا ہے۔ تم خود دبلی ہو گئی ہو لیکن تمہارے سر کے بال پہلے سے زیادہ گھنے لگتے ہیں... یہ کون سا لباس ہے؟ جب تم وہاں ان کے ہاں تھیں تبھی بنوایا تھا؟"

"وانیا، تم مجھے کتنا چاہتے ہو!" مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے وہ بولی۔ "ہاں تو تم اپنی کہو۔ اب تم کیا کر رہے ہو؟ تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"جو تھا وہی ہے، ناول لکھے جا رہا ہوں۔ مگر مشکل آ پڑی ہے، کام آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ امنگ مر گئی۔ زور لگاؤں تو کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔ ممکن ہے ناول اچھا خاصا دلچسپ رہے۔ لیکن اچھے خیال کو برباد کر لینے کا افسوس ہے۔ یہ میرا ایک چہیتا ناول ہوتا۔ لیکن اب جیسے تیسے اسے رسالے کے لئے وقت پر تیار ہونا ہی چاہئے۔ اب تو یہ بھی سوچنے لگا ہوں کہ ناول ایک طرف رکھ کر جھٹ پٹ کہانی لکھ ڈالوں — کوئی ہلکی سی، سنبھلی ہوئی کہانی جس میں افسردگی اور اداسی کا شائبہ تک نہ ہو... یقینی طور پر ایسی کہ بس جو پڑھے خوش ہو اور مزا آ جائے۔"

"بیچارے جفاکش! اور اسمتھ کا کیا ہوا؟"

"مگر اسمتھ تو مر چکا۔"

"وہ تمہیں لگتا تو نہیں؟ میں تم سے سنجیدگی سے کہتی ہوں وانیا کہ تم بیمار ہو اور تمہارے اعصاب ٹھیک نہیں ہیں۔

تم ہمیشہ ایسے ہی خوابوں میں گم رہتے ہو۔ جب تم نے مجھ سے وہ کمرہ لینے کا ذکر کیا تھا تبھی مجھے تم میں یہ بات نظر آئی تھی۔ کمرہ مرطوب ہے اور کچھ اچھا بھی نہیں ہے؟،،

”اوہو، میں تو بالکل بھول ہی گیا، تم سے آج شام کا حادثہ کہنا تھا... لیکن میں تم سے پھر کہوں گا۔،،

وہ میری بات ہی نہیں سن رہی تھی اور اپنے ہی گہرے خیالات میں غرق تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں چھوڑ کیسے سکی۔ مجھے بخار رہا ہوگا اس وقت،، وہ مجھے ایک ایسے تاثر کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولی جس کے معنی تھے کہ اس سوال کا جواب کچھ ضروری نہیں ہے۔

اگر میں اس لمحے بولتا بھی تو وہ میری بات ہی نہ سنتی۔

”وانیا،، اس نے ایسی آواز میں کہا جو بمشکل سنی جا سکتی تھی ”ایک خاص وجہ سے میں نے تمہیں بلایا تھا۔،،

”وہ کیا؟،،

”یہ کہ میں اس سے الگ ہو رہی ہوں۔،،

”الگ ہو چکی ہو یا الگ ہونےوالی ہو؟،،

”بس اب مجھے یہ سب قصہ ختم کرنا چاہئے۔ میں نے اس لئے تم سے آنے کو کہا تاکہ تمہیں سب کچھ بتا سکوں۔ وہ جو کچھ اس عرصے میں ہوتا رہا ہے اور آج تک تم سے چھپائے رہی ہوں۔،، ہمیشہ مجھ سے نتاشا اپنے پوشیدہ منصوبے اسی طرح کہنا شروع کرتی تھی اور قریب قریب ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ ایسے تمام منصوبے مجھے خود اسی کی زبانی بہت پہلے معلوم ہو چکے ہوتے۔

”اوہ نتاشا، میں تمہاری زبانی یہی بات ہزار بار تو سن چکا ہوں۔ تم دونوں کا ساتھ رہ جانا تو البتہ اب ممکن نہیں رہا۔ عجیب معاملہ ہے تمہارا بھی۔ تم دونوں میں کوئی بات بھی مشترک نہیں۔ لیکن... یہ سوچو کیا تم میں الگ ہونے کی طاقت بھی ہے؟،،

”پہلے تو سوائے نیت کے اور کچھ نہ تھا لیکن اب میں نے قطعی طے کر لیا ہے۔ میں اس سے بےپناہ محبت کرتی ہوں لیکن اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میں ہی اس کی اولین دشمن ہوں اور

میں اس کا مستقبل بننے میں رکاوٹ ہوں۔ اس کو آزاد کر دینا چاہئے۔ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس کے بس سے باہر ہے کہ وہ اپنے باپ کے خلاف جائے۔ میں بھی اسے باندھ کے نہیں رکھنا چاہتی۔ چنانچہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جس لڑکی سے اس کی شادی ٹھیرائی جا رہی ہے وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ اسے اب جدائی شاق نہ گزرے گی۔ اور مجھے یہ کرنا ہی ہے۔ میرا فرض ہے یہ... اگر مجھے واقعی اس سے محبت ہے تو ہر شے اس پر قربان کرنی ہوگی اور اپنی محبت کا ثبوت دینا ہوگا۔ یہ میرا فرض ہے۔ ہے کہ نہیں؟،،

”لیکن تم اسے سمجھا بجھا نہ سکوگی، سمجھیں؟،،

”میں بالکل نہیں سمجھاؤں بجھاؤں گی۔ پہلے ہی کی طرح برتاؤ کروں گی چاہے وہ عین اسی لمحے چلا آئے۔ لیکن مجھے کوئی ایسی تدبیر سوچنی ہوگی جس سے وہ اپنے ضمیر پر چوٹ کھائے بغیر مجھ سے جدائی آسانی سے قبول کر لے۔ یہی ایک چیز ہے جو مجھے سخت پریشان کئے ہوئے ہے، وانیا۔ میری مدد کرو۔ تمہیں کوئی تدبیر سوجھتی ہے؟،،

”صرف ایک تدبیر ہے،، میں نے کہا۔ ”اس سے محبت کرنا ایک‌دم بند کرو اور کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ لیکن شاید ہی اس سے کچھ نتیجہ نکلے گا۔ بہرحال تم اس کو خوب سمجھتی ہو۔ اب پانچ دن ہو رہے ہیں کہ وہ تم سے ملنے نہیں آیا۔ فرض کر لو کہ اس نے تمہیں بالکل چھوڑ دیا۔ اب اگر اٹھاکے ایک خط اسے لکھ دو کہ خود تم اسے چھوڑ رہی ہو تو وہ فوراً دوڑا چلا آئے گا۔،،

”تم اسے ناپسند کیوں کرتے ہو وانیا؟،،

”میں؟،،

”ہاں، تم، تم! تم اس کے پکے دشمن ہو — کھلے اور ڈھکے! تم اس کا ذکر تک نہیں کر سکتے بغیر وار کئے۔ میں نے ایک نہیں ہزار بار دیکھا ہے کہ تم کو اس کی برائی کرنے اور عیب نکالنے میں خاص مزا آتا ہے۔ ہاں ہاں عیب نکالنے میں، میں سچ کہتی ہوں!،،

”اور تم نے بھی یہ بات ہزار بار تو ضرور کہی ہے۔ بس بہت ہوا نتاشا، اب اس گفتگو کو بند کرو۔،،

''میں یہاں سے کسی اور مکان میں چلی جاؤں گی،،'' اس نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا ''دیکھو، اب غصے نہ ہونا وانیا!..،،

''تو کیا ہے، وہ دوسرے مکان پہنچ جائے گا۔ اور قسم ہے کہ میں غصے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔،،

''محبت بڑی طاقتور چیز ہے۔ نئی محبت اس کا دامن تھام لے گی۔ پھر اگر وہ میرے پاس آیا بھی تو کیا، منتوں کے لئے آیا کرے گا۔ کیوں ہے نا یہ بات؟،،

''مجھے نہیں معلوم نتاشا، بات یہ ہے کہ اس کے بارے میں ہر چیز نہایت بےتکی ہے۔ وہ دوسری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور تم سے بھی محبت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح دونوں باتیں وہی ایک ساتھ چلا سکتا ہے۔،،

''اگر مجھے پکا یقین ہو جائے کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرتا ہے تو پھر میں فوراً فیصلہ کر لوں... وانیا! مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں! کیا کوئی ایسی بات تمہیں معلوم ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟،،

اس نے میری طرف نظر اٹھائی، نگاہ میں تردد اور جستجو تھی۔

''میری دوست، کچھ نہیں معلوم مجھے — میں قسم کھاکے کہتا ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ صاف بات کرتا رہا ہوں۔ بہرحال، میں یہ سوچتا ہوں کہ غالباً وہ کاؤنٹیس کی صاحب‌زادی سے اتنی محبت نہیں کرتا جتنی ہم لوگ اپنی جگہ فرض کئے ہوئے ہیں۔ بس، ایک چلتی ہوئی کشش ہے...،،

''تو یہ ہے تمہاری رائے وانیا؟ توبہ ہے میرے پروردگار، کاش مجھے اس کا یقین ہوتا! اوفوہ اس وقت کتنا جی چاہ رہا ہے اسے دیکھنے کو، صرف اتنا کہ اسے دیکھ لوں۔ اس کا چہرہ مجھے سب کچھ بتا دے گا۔ مگر اس کا تو پتہ ہی نہیں! اس کا پتہ ہی نہیں!،،

''کیا تمہیں اس کی آمد کا انتظار ہے؟،،

''نہیں، وہ تو اسی لڑکی کے پاس ہے۔ میں جانتی ہوں، میں نے پتہ لگایا ہے۔ کس قدر میرا دل چاہتا ہے کہ اس لڑکی کو نظر بھر کے دیکھ تو لوں... مگر سنو، وانیا، شاید میں بکواس کئے جا رہی ہوں — کیا واقعی میں اس لڑکی سے نہیں مل سکتی؟ کیا

کہیں بھی اس سے ملنا ٹھیک نہیں ہوگا؟ کیا خیال ہے تمہارا؟،،

وہ بےچینی سے انتظار کرتی رہی کہ میرے منہ سے کیا نکلتا ہے۔

''تم اس سے مل تو ضرور سکتی ہو مگر صرف دیکھنے یا مل لینے سے کوئی خاص بات بنے گی نہیں۔،،

''صرف اسے دیکھ لینا ہی کافی ہوگا، پھر میں خود اپنی جگہ نتیجہ نکال لوں گی۔ دیکھو، میں کس قدر احمق ہوتی جا رہی ہوں۔ تمام وقت یہاں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہتی ہوں — آگے پیچھے۔ ہمیشہ تنہا، ہمیشہ اکیلی، ہر وقت خیالوں میں غرق۔ دماغ کو خیال ایسے ڈبوئے دیتے ہیں جیسے بھنور ہوں۔ اوہ، کیا مصیبت ہے! ایک بات میں نے سوچی ہے وانیا، کیا تم اس لڑکی سے میل ملاقات کی صورت نہیں نکال سکتے؟ تم جانتے ہو کہ کاؤنٹیس نے تمہارے ناول کی تعریف کی تھی (خود تم نے ہی ایک بار اس کا ذکر کیا تھا)۔ تم کبھی کبھی وہاں ان پرنس 'ر' کی شام کی محفلوں میں بھی جاتے رہتے ہو۔ جاتے ہو نا اور وہ لڑکی بھی وہاں ہوتی ہے۔ کوشش کرو کہ اس سے تمہارا تعارف کرایا جائے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود الیوشا ہی بڑھ کر تعارف کرا دے۔ تو پھر تم مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دینا۔،،

''نتاشا پیاری، اس کے بارے میں آئندہ بات ہوگی۔ لیکن اس وقت تو سنجیدگی سے یہ بتاؤ کہ کیا تم اپنے اندر جدائی کی تاب پاتی ہو؟ ذرا اپنی طرف دیکھ لو ابھی — تمہیں قرار کہاں ہے؟،،

''ہو... جائے... گا،،'' اس نے بہت ہی دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''اس کے لئے سب کچھ ہوگا! میری ساری زندگی اس کے لئے وقف ہے! لیکن تم سمجھتے ہو وانیا، جو بات میری برداشت سے باہر ہے وہ یہ کہ جب وہ اس کے ساتھ ہو تو مجھے بھول جائے۔ اب وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہوگا، باتیں کر رہا ہوگا، ہنس رہا ہوگا — جیسے یہاں کیا کرتا تھا، یاد ہے تمہیں؟ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا ہوگا، وہ ہمیشہ سے لوگوں کو اسی طرح دیکھنے کا عادی ہے۔ اور یہ بات بھی اس کے دماغ میں نہ گزرتی ہوگی کہ میں یہاں ہوں... تمہارے ساتھ۔،،

اس نے جملہ بھی توڑ دیا اور مجھے اداس نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کیوں نتاشا، ابھی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ...''

''ہم دونوں ایک دوسرے سے ایک ساتھ جدا ہوں!'' اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ایک دم میرا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میں خود اسے دعا دوں گی... لیکن وانیا، دیکھو، یہ تو بہت کٹھن ہے کہ مجھ سے پہلے وہ مجھے بھول جائے۔ ہائے وانیا، یہ کیسے ستم کی بات ہے! میں خود اپنے من کی نہیں سمجھ پاتی — جب آدمی دلیل سوچے تو ایک بات ہوتی لیکن جب اس پر عمل کرنے چلے تو یہ اور چیز ہے۔ میرا کیا حشر ہونے والا ہے!''

''بس، بس نتاشا، صبر سے کام لو۔''

''اور اب پانچ دن ہو گئے۔ ہر گھنٹے، ہر منٹ... سوتے، جاگتے ہر دم مجھے اسی کا خیال رہتا ہے۔ بس وہی خوابوں میں سمایا رہتا ہے۔ جانتے ہو کیا، وانیا، چلو، اب ہم خود چلیں۔ تم مجھے وہاں لے چلو۔''

''نتاشا، خود کو سنبھالو۔''

''نہیں، بس اب ہمیں چلنا چاہئے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی، وانیا۔ تین دن سے برابر میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لئے میں نے تمہیں خط بھی لکھا تھا... تمہیں مجھ کو لے کر چلنا ہی ہوگا۔ اس میں انکار نہ کرنا... مجھے تمہارا سخت انتظار تھا... تین دن سے برابر... وہاں پر آج شام کو دعوت ہے... وہ بھی وہیں ہے... چلو، چلیں۔''

بالکل معلوم ہوتا تھا کہ نتاشا کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ ڈیوڑھی میں کچھ ہنگامہ ہوا۔ ماورا شاید کسی سے الجھ رہی تھی۔

''ٹھہرو، نتاشا۔ یہ کون آدمی ہے؟'' میں نے پوچھا ''کان لگاؤ۔''

اس نے بےاعتباری کی مسکراہٹ سے آہٹ سنی اور ایک دم سفید پڑ گئی۔

''اف، پروردگار، یہ کون؟'' نتاشا نے کہا، ایسی آواز میں جو بمشکل سنی جا سکتی تھی۔

وہ مجھے پکڑ کر پیچھے کھینچنا چاہتی تھی مگر میں ڈیوڑھی

میں ماورا کی طرف بڑھا۔ دیکھتا ہوں تو وہاں الیوشا موجود ہے۔ وہ ماورا سے کسی بات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اور ماورا نے اسے شروع میں تو اندر قدم رکھنے سے ہی روک دیا تھا۔

''تم آ کہاں سے رہے ہو؟'' اس نے اپنا اختیار جتاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا کہاں ٹھانی تھی؟ خیر۔ جاؤ، جاؤ اندر! مجھے تم کیا پھسلاؤ گے! جاؤ اندر۔ دیکھیں تو اب کے کیا باتیں بناتے ہو؟''

''میں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں۔ جاتا ہوں اندر!'' الیوشا بولا، البتہ وہ کسی قدر گڑبڑا گیا تھا۔

''جاؤ اندر۔ بڑے سورما بنے ہو تو...''

''ہاں، ہاں، میں اندر جاتا ہوں۔ اوہو، آپ بھی یہاں موجود ہیں!'' مجھ پر نظر پڑی تو وہ بولا۔ ''کیا خوب ہوا کہ آپ بھی تشریف رکھتے ہیں۔ تو یہ رہا میں۔ دیکھتے ہیں آپ... اب بات کیسے بتاؤں؟..''

''چلے جائیے بس'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ ڈر کس چیز سے رہے ہیں؟''

''میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، قسم کھاکے کہتا ہوں کہ میں بالکل قصوروار نہیں ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے کوئی قصور کیا ہے؟ آپ خود مان لیں گے۔ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ نتاشا کیا میں آ سکتا ہوں تمہارے پاس؟'' وہ ایک طرح کی بناوٹی جرأت سے بند دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر پکارا۔

مگر اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' اس نے بےچینی سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں، ابھی ابھی تو وہ یہاں موجود تھی'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر ہو سکتا ہے کہ شاید کوئی...''

الیوشا نے احتیاط سے دروازہ کھولا اور کمرے میں دبتے دبتے جھانکا۔ کوئی بھی موجود نہ تھا۔

ایک دم کونے میں اس کی نظر نتاشا پر پڑی۔ وہ الماری اور کھڑکی کے بیچ میں ایسے کھڑی تھی جیسے چھپی ہوئی ہو۔ وہ ادھ موئی ہو رہی تھی۔ آج تک جب بھی مجھے وہ سین یاد آتا

ہے بےاختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ الیوشا اس کے پاس قدم پھونک پھونک کے دھرتا ہوا پہنچا۔

''نتاشا، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ نتاشا، سلام!،، اس نے بہت جھجکتے ہوئے کہا اور اسے اندیشہ‌ناک نظر سے دیکھا۔

''اوہ، کچھ نہیں، کوئی بات نہیں...،، اس نے سخت بدحواسی کے عالم میں جواب دیا۔ گویا خود اس سے کوئی جرم ہو گیا ہو۔ ''کیا تم... تم چائے پیوگے؟،،

''نتاشا، سنو،، الیوشا نے کہنا شروع کیا لیکن اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کہے۔ ''شاید تمہیں یقین ہو گیا ہے کہ میں خطاوار ہوں... مگر میں نہیں ہوں خطاوار۔ بالکل نہیں۔ قطعی نہیں۔ تم مان لوگی۔ میں ابھی تمہیں سب سمجھائے دیتا ہوں۔،،

''کس لئے آخر؟،، نتاشا نے لب ہلائے ''نہیں، تمہیں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سنو، تم مجھے اپنا ہاتھ دو۔ بس سب ٹھیک ہے اب... ہمیشہ کی طرح...،، اور وہ کونے میں سے نکل آئی۔ چہرے پر پھر سے رنگ دوڑنے لگا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں جیسے الیوشا کو دیکھنے سے ڈر رہی ہو۔

''توبہ توبہ!،، وہ مزے میں آتے ہوئے چیخا ''اگر واقعی کہیں میری خطا ہوتی تو مجھ میں اس کے بعد نتاشا سے آنکھیں بھی چار کرنے کی ہمت نہ ہوتی! دیکھئے، دیکھئے!،، وہ میری طرف متوجہ ہوکر بولا ''وہ سمجھتی ہے کہ خطا ہے میری۔ سب کچھ میرے خلاف پڑ رہا ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے میرے خلاف ہے! پانچ دن سے میں یہاں نہیں آیا۔ افواہ ہے کہ صاحب، میں اپنی منگیتر کے ہاں تھا۔ تو کیا ہوا؟ وہ مجھے معاف کر بھی چکی! اس نے مجھ سے کہہ بھی دیا کہ 'اپنا ہاتھ دو۔ سب ٹھیک ہے'، نتاشا، میری پیاری، میری جان، میں قصوروار نہیں ہوں، تم کو یہ جاننا چاہئے! میں ہرگز قصوروار نہیں ہوں، ذرہ برابر نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف ہے۔ اس کے قطعی خلاف!،،

''مگر... مگر تمہیں تو اس وقت وہاں ہونا تھا... تمہیں وہاں کا بلاوا تھا نا... تم یہاں کیسے آ گئے؟.. کت... کتنے بجے ہیں؟،،

''ساڑھے دس بجے ہیں۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں... لیکن

میں نے کہا طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور چل دیا وہاں سے۔ یہ پہلی، ہاں پہلی مرتبہ ہے کہ ان پانچ دنوں میں مجھے آزادی ملی ہے اور میں ان لوگوں سے رسی تڑا کر تمہارے پاس آ پہنچا، نتاشا۔ یوں تو میں اس سے پہلے بھی آ سکتا تھا مگر جان بوجھ کر وہاں سے نہیں آیا۔ کیوں آخر؟ تو میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اسی لئے تو میں آیا ہوں کہ سمجھا دوں۔ صرف، قسم ہے خدا کی، اس دفعہ میں کسی طرح بھی تمہارے آگے قصوروار نہیں ہوں۔ کسی طرح بھی۔ ہرگز کسی صورت سے بھی نہیں!،،

نتاشا نے سر اٹھایا اور اس کی طرف نظر بھرکر دیکھا... لیکن اس کی جوابی نظر اس قدر راست‌باز تھی، اس کا چہرہ ایسا ہشاش بشاش تھا، دیانت‌دار اور خوش و خرم تھا کہ اس کی بات کا یقین نہ کرنا ناممکن تھا۔ میں نے سمجھا کہ بس، اب یہ دونوں چیخ مارکر ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے، کیونکہ ایک بار نہیں، نہ جانے کتنی بار پہلے بھی صلح صفائی کے وقت یہی ہوتا تھا۔ لیکن نتاشا نے، اس طرح جیسے خوشی سے ڈوبی جا رہی ہو، اپنا سر ڈھلکا دیا، سینے پر رکھ دیا... اور ایک‌دم سبکیاں لینے لگی۔ اتنا ہونا تھا کہ الیوشا بھی خود کو نہ سنبھال سکا اور نتاشا کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے اس کے ہاتھ چومے، پاؤں چومے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپے سے باہر ہے۔ میں نے نتاشا کی طرف آرام کرسی بڑھا دی اور وہ اس میں ڈوب گئی۔ اس کے قدم زمین پر ٹھیر نہیں رہے تھے۔

دوسرا حصّہ

پہلا باب

منٹ بھر بعد ہم سب ایسے ہنس رہے تھے جیسے نیم دیوانے ہوں۔

"ہاں تو ذرا دم لو، ذرا ٹھیرو تو میں ابھی سب کہے دیتا ہوں"، الیوشا زور سے کہہ رہا تھا اور اس کی کھنکتی ہوئی آواز ہم سب کے قہقہوں سے اونچی اٹھ رہی تھی۔ "سمجھتے ہیں کہ اب کے بھی پہلے کی طرح کہنے والا ہوں... اور کوئی فضول سی بات سنا دوں گا... جی نہیں، بڑے مزے کا قصہ آپ کو بتانا ہے۔ ہاں تو ذرا آپ خاموش ہوں گے؟"

وہ بہت ہی بےقرار تھا کہ اپنا واقعہ سنا دے۔ اس کے سارے تیور بتا رہے تھے کہ کوئی بہت ہی خاص خبر پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن خاص خبر اپنی مٹھی میں رکھنے سے جو خواہ مخواہ کی اکڑ اسے محسوس ہو رہی تھی اور جس طرح وہ شان جتا رہا تھا، اس پر نتاشا کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ اور مجھ سے بھی ہنسے بغیر نہ رہا گیا۔ جتنا وہ ہم پر بگڑتا تھا اتنا ہی زیادہ ہمیں ہنسی چھوٹتی تھی۔ الیوشا کی جھنجھلاہٹ اور پھر بچوں کی طرح ٹھنکنا، اس کی وجہ سے ہماری حالت ویسی ہو گئی تھی جیسی مصنف گوگول کے میچمن* کی تھی کہ بس ذرا کوئی انگلی ہی دکھا دے اور ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ ماورا باورچی خانے سے نکل کر باہر دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ اسے اس بات پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ الیوشا آیا تو بجائے اس

* گوگول کی تصنیف "شادی" میں لفٹنٹ ژیواکن کی زبانی ایک شخص میچمن دیرکا کا قصہ سنایا گیا ہے جس پر بلاوجہ ہنسی چھوٹتی ہے۔ (ایڈیٹر)

کے کہ نتاشا، جیسا کہ ماورا ان سارے پانچ دنوں کی توقع کر رہی تھی، اس کی اچھی طرح خبر لیتی، الٹی قہقہے لگا رہی ہے اور سب مزے لے رہے ہیں۔

آخر نتاشا نے یہ محسوس کرکے کہ ہمارے قہقہے الیوشا کے جذبات کو صدمہ پہنچارہے ہیں، ہنسنا بند کر دیا۔

"اچھا، خیر، کیا بتانا چاہتے ہو تم؟"

"کیا ہے، سماوار تیار کروں کیا؟" ماورا نے الیوشا کو ذرا بھی خاطر میں لائے بغیر سوال کیا۔

"ہٹ جاؤ ماورا، یہاں سے چل دو"، الیوشا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو میں آپ کو وہ سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں جو ہو چکا ہے، ہو رہا ہے اور ہوگا... کیونکہ مجھے اس سب کی خبر ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوستو، آپ کو یہ جاننے کی فکر ہے کہ میں پچھلے پانچ دن سے کہاں تھا۔ یہی تو میں بھی آپ کو بتانا چاہتا ہوں مگر آپ مجھے بولنے ہی نہیں دیتے۔ اچھا تو اول بات یہ کہ نتاشا میں تمہیں برابر دھوکا دیتا رہا۔ اس تمام عرصے میں، اب کی نہیں، بہت دن پہلے کی بات ہے کہ میں نے تمہیں دھوکا دے دیا۔ اور یہی بات ہے جو سب سے خاص ہے۔"

"دھوکا دیتے رہے؟"

"ہاں، برابر ایک مہینے سے دھوکے میں رکھا۔ ابھی میرے باپ باہر سے آئے بھی نہ تھے اس وقت کی بات ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ بالکل صاف گوئی سے کہہ دیا جائے۔ ایک مہینہ ہوا ابھی میرے ابا واپس نہ آئے تھے کہ مجھے اچانک ان کا ایک زبردست لمبا چوڑا خط ملا۔ میں نے یہ بات تم دونوں سے چھپائے رکھی تھی۔ اس خط میں ابا جان نے مجھے صاف صاف سیدھے لفظوں میں لکھا تھا — اور یہ بھی جتا دوں کہ خط کا لب ولہجہ ایسا گمبھیر تھا کہ واقعی میں چونک گیا — کہ میری رشتے کی بات بالکل طے ہو گئی ہے، میری منگیتر بےمثال اور ہر طرح سے باکمال ہے، اور میں دراصل اس کے قابل بھی نہیں تاہم مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔ لہذا اب اس کی تیاری کرنی چاہئے اور اپنی کھوپڑی سے یہ ساری خرافات نکال دینی چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگ بہرحال جانتے ہی ہیں کہ ساری خرافات کے لفظ

سے ان کا کیا مطلب تھا۔ خیر، تو وہ خط میں نے آپ سے چھپائے رکھا۔۔۔،،

”بالکل نہیں چھپایا!،، نتاشا نے بیچ میں ٹوک دیا۔ ”دیکھو تو سہی خود ستائی کس بات کی ہے! اصل بات یہ ہے کہ تم نے اس کے بارے میں فوراً ہی بتا دیا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ تم ایک دم سے کیسے سعادت‌مند اور انکسارپسند ہو گئے تھے اور مجھ سے جدا نہ ہوتے تھے جیسے کسی جرم پر شرمندہ ہو اور تم نے وہ خط بھی ٹکڑوں ٹکڑوں میں سنا دیا تھا۔،،

”ہرگز نہیں۔ خاص بات، مجھے یقین ہے کہ میں نے کبھی نہیں۔ ممکن ہے کہ تم لوگوں نے خود ہی جی میں سوچ لیا ہو، بہرحال یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ میں نے تو خود سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اسے راز رکھا اور میرا دل بہت بری طرح اس بوجھ سے دبا ہوا رہا۔،،

”اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ الیوشا آپ نے اس زمانے میں مجھ سے برابر اس کے متعلق مشورہ کیا اور سب کچھ کہہ دیا۔ البتہ یہ کہ آدھا اب، آدھا تب، جیسے اپنے من سے فرض کرکے کہہ رہے ہوں،، میں نے نتاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں، تم نے ہم سے سب کچھ بیان کر دیا تھا۔ اب مہربانی کرکے بنو نہیں زیادہ،، نتاشا نے اسے لقمہ دیا۔ ”تو کیا واقعی تم کسی بات کو راز رکھ سکتے ہو؟ توبہ، تم کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اور تو اور، ماورا تک کو اس کی سب خبر ہے۔ کیوں ماورا، ہے نا؟،،

”کیوں نہیں،، ماورا نے ہماری طرف سر نکال کر تڑ سے جواب دیا۔ ”پہلے ہی تین دنوں میں تم نے سب کچھ کہہ سنایا تھا۔ بھلا تم کیا چالاکی دکھاؤ گے!،،

”افوہ، تم سے بات کرنا بھی مصیبت ہے! نتاشا، تم یہ سب رقابت کی جلن سے کر رہی ہو اور تو بھی غلطی پر ہے ماورا۔ مجھے یاد ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ یاد ہے تجھے؟،،

”یاد کیوں نہ ہوتا۔ اور تم تو اب بھی پاگل ہو رہے ہو۔،،

”نہیں، نہیں، میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ یاد ہے تجھے! یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے یہاں روپیہ بالکل نہیں

رہا تھا اور تو میرا چاندی کا سگریٹ کیس رہن رکھنے گئی تھی۔ اور ہاں ایک بات ماورا میں تجھے جتائے دیتا ہوں کہ میرے سامنے تو اپنی حیثیت بھول جاتی ہے۔ نتاشا نے تجھے بگاڑ رکھا ہے۔ اچھا چلو، یوں ہی سہی — میں نے تم سے اس وقت سب کچھ کہہ دیا تھا اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں سنا دیا تھا (اب مجھے یاد آیا)۔ تب بھی تمہیں اس خط کا لب و لہجہ تو معلوم ہی نہیں اور خط میں یہ لب و لہجہ ہی اصلی چیز ہے۔ اب اس وقت میں اسی کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔،،

”اچھا تو کیا تھا لب و لہجہ؟،، نتاشا نے سوال کیا۔

”دیکھو، نتاشا، مجھے لگتا ہے کہ تم سوال نہیں کر رہی ہو، مذاق کر رہی ہو۔ مذاق مت کرو۔ میری مانو — یہ بہت اہم بات ہے۔ خط کا لب و لہجہ ایسا تھا کہ میرا دل بیٹھ گیا۔ ابا جان نے پہلے کبھی اس طرح مجھ سے بات نہ کی تھی۔ یعنی یہ کہ زمین آسمان اپنی جگہ سے ٹل جائیں لیکن ان کی مرضی کی خلاف‌ورزی نہیں ہو سکتی۔ بس، یہ تھا لب و لہجہ!،،

”اچھا تو اب ٹھیک سے بتاؤ۔ تم نے مجھ سے یہ چھپایا کیوں؟،،

”افوہ، توبہ ہے میری! چھپایا اس لئے کہ تم کہیں ڈر نہ جاؤ۔ مجھے امید تھی کہ خود ہی اس معاملے کو ٹھکانے لگا لوں گا۔ خیر، تو جب خط پہنچ گیا تو اس کے بعد ابا جان بھی آ پہنچے اور یہیں سے میری مصیبت شروع ہوتی ہے۔ میں نے جی میں ٹھان لی کہ بس، اب میں ان کو کھرے کھرے دوٹوک اور سنجیدہ جواب دے دوں گا، لیکن نہ جانے کیوں، اس کا موقع ہی نہیں آیا، اور انہوں نے بھی مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کی۔ ہیں نا وہ بھی بڑے ہوشیار آدمی! بلکہ ہوا یہ کہ انہوں نے ایسا برتاؤ کیا جیسے سب کچھ پہلے ہی طے ہو چکا ہے اور اب ہم باپ بیٹے کے درمیان بحث مباحثے، غلط فہمی یا اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ سنتی ہو؟ بحث و دلیل ممکن ہی نہیں جیسے — انہیں اس قدر اپنے اوپر بھروسہ تھا! اور وہ میرے ساتھ ایسی نرمی سے، پیار دلار سے پیش آئے کہ کیا کہوں۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ کس قدر تیز آدمی ہیں وہ، ایوان پتروویچ، آپ کو اندازہ نہیں! انہوں نے سب کچھ پڑھ رکھا ہے، ہر بات انہیں معلوم ہے۔ ذرا ایک بار آپ کی نظر ان سے چار ہو جائے وہ فوراً تاڑ جاتے ہیں

که آپ کے دل میں کیا ہے ایسے گویا خود اپنے دل کا حال ہو۔ اسی لئے شاید ان کو لوگ یسوعی کہتے ہیں۔ نتاشا کو یہ بات پسند نہیں کہ میرے منہ سے ان کی تعریف نکلے۔ نتاشا، تم بگڑو نہیں۔ تو بس... یہ قصہ ہے۔ اور ہاں، ایک بات رہ گئی۔ کل انہوں نے مجھے کچھ رقم بھی دی اس پوری مدت کے بعد۔ نتاشا، میری جان! ہماری غریبی ختم ہو گئی ہے۔ لو، دیکھو۔ چھہ مہینے میں جتنی رقم انہوں نے میرے جیب خرچ سے کاٹی تھی کل وہ سب کی سب یک مشت دے دی۔ لو، ذرا دیکھو، کتنا روپیہ ہے۔ میں نے تو ابھی تک گنا بھی نہیں۔ ماورا، ذرا دیکھو تو، کتنی بڑی رقم لایا ہوں۔ اب یہ مجبوری نہیں رہی کہ ہم اپنے چمچے اور کفوں کے بٹن رہن رکھتے پھریں۔،،

اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کا ذرا موٹاسا بنڈل نکالا۔ ہوں گے کوئی پندرہ سو روبل۔ اور ان کو میز پر رکھ دیا۔ ماورا نے اس رقم کو مسرت بھری نظروں سے دیکھا اور الیوشا کی تعریف کی۔ نتاشا نے بہت زور سے اصرار کیا کہ وہ بات پوری کرے۔

''ہاں تو پھر، بات یہ کہ میں نے سوچا، اب کرنا کیا چاہئے؟،، الیوشا بولتا چلا گیا۔ ''اب میں ان کی مرضی کے خلاف کیسے منہ کھولوں؟ اگر ابھی تک ان کی بدسلوکی میرے ساتھ قائم رہی ہوتی اور وہ اس طرح پسیج نہ گئے ہوتے تو میں آپ دونوں کے آگے قسم کھاکے کہتا ہوں کہ ایک بار سے زیادہ میں نے سوچا بھی نہ ہوتا۔ میں نے تبھی صاف صاف کہہ دیا ہوتا کہ آپ جو سوچ رہے ہیں وہ مجھ سے ہونے کا نہیں۔ میں اب سیانا ہو گیا ہوں، سمجھدار آدمی ہوں، بس، ختم ہوا۔ آپ یقین کیجئے کہ یوں ہی ہوا ہوتا۔ لیکن اب اس صورت میں کیا کہتا؟ مگر آپ لوگ میری خطا مت نکالئے۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ نتاشا، تم ناراض ہو مجھ سے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو کیا تک رہے ہو؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ دونوں اپنے جی میں سوچ رہے ہیں، لو، بھئی — انہوں نے اس نوجوان کو بہرحال قابو کر ہی لیا، اس میں ذرا بھی پختگی نہیں ہے۔ جناب، مجھ میں ہے پختگی۔ جتنی آپ سمجھتے ہیں اس سے زیادہ ہی مضبوطی ہے مجھ میں! اور ثبوت یہ ہے کہ جو پوزیشن میری تھی اس کے باوجود میں نے جی میں فوراً کہا 'یہ میرا فرض ہے۔ مجھے اپنے باپ سے سب کچھ کہہ دینا چاہئے اور ان

کے کان تک پہنچا دینا چاہئے'۔ چنانچہ میں نے زبان کھولی۔ جو کہنا تھا کہہ ڈالا۔ اور انہوں نے پوری طرح سن لیا۔،،

''مگر کیا؟ ٹھیک سے بتاؤ، تم نے ان سے کیا کہہ دیا؟،، نتاشا نے بےتابی سے پوچھا۔

''یہی کہ بس اب مجھے کسی اور سے شادی کرنی نہیں ہے۔ جس کو چننا تھا چن چکا — یعنی تم کو۔ البتہ یہ بات ہے کہ میں نے ان سے یوں دوٹوک نہیں کہہ دیا بلکہ ان کو اس کے لئے تیار کر دیا اور اب کل کہہ بھی دوں گا — میں نے جی میں ٹھان لی ہے۔ ابتدا یوں کی، میں نے ان سے کہا کہ روپے کے لئے شادی کرنا بڑی شرم‌ناک اور ملامت‌انگیز بات ہے اور یہ کہ ہم جو خود کو خاندانی امیرزادوں میں شمار کریں اس سے بڑھ کر بےوقوفی کیا (میں نے ان سے ایسی بےتکلفی سے کہاجیسے ایک بھائی دوسرے بھائی سے کہتا ہے)۔ پھر میں نے انہیں سمجھایا کہ دیکھئے میں tiers-état ہوں اور یہ کہ tiers-état c'est l'essentiel* یعنی مجھے اس پر فخر ہے کہ میں بھی دوسروں کی طرح ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ کسی سے بھی خود کو برتر سمجھوں... میں نے بہت جوش و خروش اور قائل کرنے والے انداز سے بات‌چیت کی۔ خود مجھے اپنے اوپر حیرت ہو رہی تھی۔ اور ان کے اپنے نقطۂ نظر سے ہی میں نے سب ثابت کیا... میں نے ان سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ہم لوگ کس قسم کے پرنس ہیں۔ صرف خاندانی پرنس ہیں ورنہ حقیقت میں کہاں کی شہزادگی رکھی ہے ہمارے پاس؟ اول تو یہی کہ ہم کوئی خاص دولت‌مند نہیں اور دولت ہی اصلی چیز ہے۔ فی‌الحال تو سب سے بڑا پرنس ہے روتشیلڈ۔ اور پھر دوسرے یہ کہ ایک زمانہ ہوا اعلی سوسائٹی میں ہمارا کوئی بڑا کارنامہ سننے میں نہیں آیا۔ ہمارے آخری بزرگ چچا سیمیون والکوفسکی تھے۔ ان کا نام بھی صرف ماسکو تک محدود تھا اور وہ بھی اس وصف کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی رعایا کے آخری تین سو آدمی بھی بیچ کھوچ ڈالے۔ اور اگر خود ابا جان نے رقم پیدا نہ کی ہوتی تو ان کے

---

* سماج کا تیسرا درجہ... تیسرا درجہ سب سے اہم ہے (فرانسیسی)۔

ہوتے خود ہل چلا رہے ہوتے۔ اس طرح کے پرنس رہ گئے ہیں اب تو۔ بھلا کیا ہے ہمارے پاس جس کا غرور کریں۔ مختصر یہ کہ میں نے وہ ساری باتیں کہہ ڈالیں جو بہت دنوں سے میرے دماغ میں پک رہی تھیں۔ بس، سبھی کچھ سنا دیا — صاف دوٹوک طریقے سے بلکہ حقیقت میں کچھ اور بھی کہا میں نے۔ وہ تو چپ ہی رہے۔ جواب تک نہ دیا انہوں نے۔ الٹا اور مجھے ڈانٹنے لگے کہ میں نے کاؤنٹ نائنسکی کے ہاں آنا جانا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اور پھر بولے کہ مجھے کوشش کرکے پرنسس 'ک، کی نظر میں چڑھنا چاہئے جو میری دھرم ماتا کا درجہ رکھتی ہیں، کیونکہ اگر ان کے حضور میں میری پذیرائی ہوگی تو پھر ہر جگہ آؤبھگت ہوگی اور زندگی بن جائے گی۔ پھر وہ اسی کے بارے میں کہتے سنتے رہے اور سب سے زیادہ اسی بات پر زور دیتے رہے۔ ہر بات میں اسی طرف اشارہ تھا کہ جب سے نتاشا، میرا تمہارا ساتھ ہوا ہے، میں نے سب سے ترک تعلق کر لیا اور یہ تمہارا اثر ہے جو ایسا ہو رہا ہے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک تمہارے بارے میں سیدھے طریقے سے کچھ نہیں کہا۔ دراصل وہ خود کتراتے ہیں۔ ہم دونوں بڑی چالاکی سے ایک دوسرے کی تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ موقع ملے اور دھر لیں لیکن تم یقین کرنا نتاشا کہ جشن ہماری ہی گلی میں رہے گا۔“

”اچھا، بہت خوب۔ یہ کہو کہ آخر میں ہوا کیا؟ انہوں نے کیا کہا؟ اصلی بات یہ ہے۔ تم بھی الیوشا کس قدر باتونی ہو...“

”خدا ہی جانے۔ ان کے دل کی بات سمجھنا بالکل کسی کے بس کی نہیں ہے۔ میں بالکل باتونی نہیں ہوں۔ میں سمجھ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ بس میری ساری بحث پر مسکرا دئے، مسکراہٹ بھی کیا تھی جیسے انہیں میری حالت پر افسوس ہو۔ میں جانتا ہوں کہ واقعی یہ زہرخند توہین آمیز ہے لیکن میں کیوں شرماؤں اس پر۔ بولے کہ تم سے مجھے اتفاق ہے لیکن چلو، ہم کاؤنٹ صاحب نائنسکی کے ہاں چلیں۔ اور دیکھو خیال رکھنا، اس قسم کی کوئی بات وہاں پر منہ سے نہ نکلے۔ میں تو تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ وہ لوگ نہیں سمجھتے، انہوں نے اتنا کہا۔ میرے خیال میں انہیں خود وہاں

اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ لوگ ان سے کسی بات پر خوش نہیں ہیں۔ اب سوسائٹی میں غالباً ان کا مان نہیں رہا۔ کاؤنٹ صاحب شروع میں تو مجھ سے شان و شکوہ سے ملے، بہت آن بان دکھائی گئی۔ ایسے بظاہر جیسے انہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں بھی اسی خانوادے میں پلا بڑھا ہوں۔ وہ کچھ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے لگے، ہاں واقعی! مطلب یہ ہوا کہ وہ میرے ناشکرے پن پر ناراض ہیں کسی قدر۔ اگرچہ سچ پوچھو تو میری طرف سے کوئی ناشکراپن نہیں ہوا ہے۔ ان کے محل میں عجب بے کیفی ہے — صرف اسی لئے میں نے وہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ میرے ابا جان کا وہاں بڑا رسمی سا خیرمقدم ہوا۔ اس قدر رسمی کہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ وہاں جاتے ہی کیوں ہیں۔ مجھے سخت ناگوار گزرا۔ بیچارے ابا جان وہاں خود کو نیچ بنائے لے رہے ہیں۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ سب میری بدولت ہے۔ مگر مجھے خود تو کچھ نہیں چاہئے۔ میں نے سوچا تھا کہ جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں وہ بعد میں ابا جان سے کہہ دوں گا لیکن ضبط کرکے رہ گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کہنے سے حاصل بھی کیا؟ انہوں نے اپنی جگہ جو سوچ رکھا ہے اسے تو میں بدلنے سے رہا۔ کہہ کر صرف ان کی فکر و پریشانی میں ہی اضافہ کروں گا، ویسے بھی وہ آجکل پریشانیوں میں رہتے ہیں۔ خیر، تو میں نے سوچا — کوئی بات نہیں، میں چالاکی سے کام لوں گا اور ان سب کے چھکے چھڑا دوں گا۔ کاؤنٹ صاحب کو میری عزت کرنی پڑے گی۔ اور کیا سمجھے تم لوگ؟ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ دن بھر کے اندر فوراً ہر چیز بدل گئی۔ اب جناب کاؤنٹ کی عقل شریف میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کہاں اٹھائیں، کہاں بٹھائیں۔ یہ سب میرا کیا دھرا تھا۔ صرف میرا۔ محض میری چالاکی کی بدولت یہ نوبت پہنچی کہ خود ابا جان حیران تھے اور ہاتھ پھیلا کر رہ گئے!..“

”سنو، الیوشا، اچھا ہو کہ تم اصل معاملے کے بارے میں ہی بات کرو!“ نتاشا بے صبری سے چیخی۔ ”میں سمجھی تھی کہ تم کچھ ہمارے متعلق بتاؤ گے لیکن تم ہمیں صرف یہ سنانے پر تلے ہوئے ہو کہ کاؤنٹ نائنسکی کے یہاں تم نے کیا کمال دکھائے۔ بھلا مجھے تمہارے کاؤنٹ صاحب سے کیا لینا۔“

"کیا لینا؟ سنتے ہیں آپ ایوان پتروویچ، وہ کہتی ہیں 'کیا لینا؟ جی ہاں، اسی میں تو اصل بات ہے۔ تم خود دیکھ لوگی ابھی۔ آخر میں پہنچ کر سب کھل جائے گا۔ ذرا مجھے کہہ لینے دو ... اور آخر (آدمی صاف کھل کر کیوں نہ کہے!) بات یہ ہے کہ نتاشا اور آپ بھی ایوان پتروویچ، ممکن ہے کہ میں دراصل بہت ہی، یعنی بہت ہی نامعقولیت سے کام لے رہا ہوں، بلکہ یوں فرض کریں کہ حماقت سرزد ہو رہی ہے (کیوں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے)۔ تاہم اس قصے میں آپ یقین کیجئے گا کہ میں نے بڑی ہی ہوشیاری دکھائی ہے... بلکہ سچ پوچھو تو اصل میں عقلمندی کا کرشمہ۔ یہاں تک کہ میں تو جانوں آپ خود بہت خوش ہوں گے اس بات سے کہ میں سدا کا... بےوقوف نہیں ہوں۔"

"ارے نہیں — کیا بات کرتے ہو الیوشا، بس کرو۔ میری جان!.."

نتاشا کو یہ برداشت نہیں ہو سکا کہ الیوشا کو بےوقوف سمجھا جائے۔ بارہا ایسا ہو چکا تھا کہ وہ مجھ سے خفا ہو جاتی تھی اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہتی تھی، جب کبھی میں بلاتکلف اور بےاحتیاط طریقے سے الیوشا کے سامنے ثابت کرنے لگتا کہ بھئی، تم سے بےوقوفی سرزد ہوئی ہے۔ اس کی یہ دکھتی رگ تھی۔ اسے گوارا نہ ہوتا تھا کہ الیوشا کی توہین ہوتے دیکھے اور غالباً محسوس زیادہ اس لئے ہوتا تھا کہ وہ خود بھی الیوشا کی معذوریوں کو سمجھتی تھی۔ لیکن نتاشا نے اس پر کبھی اشارے میں بھی یہ بات ظاہر نہ کی تھی اس خیال سے کہ کہیں الیوشا کی خودپسندی کو ٹھیس نہ لگے۔ بہرحال وہ خود اس خاص معاملے میں بہت حساس تھا اور ہمیشہ نتاشا کی دلی کیفیت کا اندازہ کر لیتا تھا۔ نتاشا یہ دیکھتی اور اسے صدمہ پہنچتا اور پھر وہ اسی وقت الیوشا کی تعریفیں کر ڈالتی اور اس سے لاڈ کرنے لگتی۔ اسی لئے الیوشا کے الفاظ نے نتاشا کے دل میں ٹیس پیدا کی...

"بکواس ہو چکی۔ الیوشا، تم صرف من موجی آدمی ہو۔ تم بالکل اس قسم کے نہیں ہو،" نتاشا نے ٹوک کر کہا۔ "تم آخر خود کو گرا کیوں رہے ہو؟"

"اچھا تو خیر، یہ بھی ہوا۔ اب ذرا مجھے پورا قصہ کہہ

لینے دو۔ جب کاؤنٹ صاحب کے یہاں یوں استقبال ہوا تو ابا جان بھی شاید مجھ پر ناراض ہوئے۔ میں نے سوچا، کوئی بات نہیں، دیکھتے جاؤ۔ وہاں سے ہم پرنسس صاحبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے بہت زمانے سے سن رکھا تھا کہ وہ اتنی بوڑھی ہیں کہ قریب قریب سٹھیا گئی ہیں اور اونچا بھی سنتی ہیں، اس کے علاوہ انہیں پلوں کا بڑا شوق ہے۔ کتوں کا ایک اچھا خاصا گلہ پال رکھا ہے اور انہیں جان سے پیارا رکھتی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود سماج میں وہ بہت بااثر ہیں۔ یہاں تک کہ اور تو اور خود کاؤنٹ نائنسکی دی گریٹ ان کے آگے سر تعظیم خم کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے راستے میں منصوبہ گانٹھ لیا کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ اور آپ کیا سمجھے، بھلا میں نے اس کی بنیاد کس چیز پر رکھی؟ اس پر کہ کتے ہمیشہ میرے گرد ہو جاتے ہیں۔ خدا بچائے۔ میں نے خود اندازہ کیا ہے۔ یا تو یہ اس وجہ سے ہوگا کہ میری ذات میں کوئی مقناطیسی کشش موجود ہے یا پھر اس لئے کہ مجھے سب طرح کے جانور پسند ہیں۔ پتہ نہیں، کتے ہی مجھے پیار کرتے ہیں یا کیا، ہے کوئی ایسی ہی بات۔ اور ہاں، اب یہ مقناطیسی کشش کا جو ذکر آیا تو میں نے نتاشا تم سے اب تک اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ ابھی حال کی بات ہے کہ ہم نے روحوں کو بلایا تھا، میں ایک آدمی کے پاس تھا جو روحوں کو بلانے کا عمل کرتا ہے۔ کس قدر عجیب لگتا ہے۔ ایوان پتروویچ، واقعی مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ میں نے کہا، اچھا جولیس سیزر* کو بلوائیے۔"

"اف۔ خدایا، تمہیں جولیس سیزر کی کیا ضرورت آ پڑی تھی؟" نتاشا قہقہوں میں ڈوب کر چلائی۔ "یہی رہ گیا تھا ہونے کو!"

"کیوں، کیا ہے۔ میں کوئی بھلا وہ ہوں کہ... مجھے جولیس سیزر کو بلوانے کا حق نہیں پہنچتا؟ اور اس سے جولیس سیزر کا کیا حرج ہوتا؟ اوپر سے ہنس رہی ہیں!"

"خیر، کچھ نہیں، کوئی حرج نہیں تھا اس کے بلوانے میں... میری جان۔ اچھا یہ بتاؤ، تم سے جولیس سیزر نے کیا کہا؟"

* سیزر، ھائی جولیس (تقریباً ۱۰۰ تا ۴۴ ق م) — روم کا بادشاہ اور مشہور سپہ‌سالار۔ (ایڈیٹر)

"ہائے، اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نے بس ہاتھ میں پنسل تھام لی اور پنسل خود بخود کاغذ پر لکھتی چلی گئی۔ بتایا گیا کہ جولیس سیزر لکھ رہے ہیں۔ مجھے تو اس کا یقین نہیں۔"

"مگر جولیس سیزر نے لکھا کیا؟"

"ہاں تو انہوں نے کوئی ایسی چیز لکھی جیسے وہ گوگول کے ہاں ہے کہ 'اندر ڈیوؤ...' * بس بہت ہو چکا، ہنسی ٹھٹھا۔"

"اچھا اب تم وہ پرنسس والی بات تو بیان کرو۔"

"تم تو بیچ بیچ میں رخنہ ڈال رہی ہو۔ خیر، ہم پہنچے پرنسس کے ہاں۔ اور میں نے پہنچتے ہی ممی کو چمکارنا شروع کر دیا۔ یہ ممی نہایت بےہودہ اور خوفناک قسم کی بوڑھی کتیا ہے۔ بڑی لیچڑ اور منہ مارنے کی شوقین۔ پرنسس کو اس کتیا سے جنون کی حد تک پیار ہے بلکہ اس پر دل و جان سے فدا ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مالکن اور کتیا دونوں کی ایک ہی عمر ہوگی۔ شروع میں نے یوں کیا کہ ممی کو مٹھائی کی گولیاں کھلانے لگا اور دس منٹ کے اندر اندر میں نے اسے ہاتھ ملانا سکھا دیا جو یہ لوگ اب تک نہیں سکھا سکے تھے۔ پرنسس خوشی سے پھولی نہیں سمائیں بلکہ فرط مسرت میں ان کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے: 'ارے ممی، ممی، ممی کو دیکھو، ہاتھ ملا رہی ہے! کوئی شخص اندر آیا: 'دیکھو تو ممی ہاتھ ملا رہی ہے! میرے منہ بولے بیٹے نے اسے ہاتھ ملانا سکھا دیا'، کاؤنٹ نائنسکی صاحب بھی آ پہنچے: 'اقوہ، ممی ہاتھ ملا رہی ہے!'، پرنسس صاحبہ نے میری طرف شکرگزار نگاہوں سے قریب قریب آنسو بھر کر دیکھا۔ وہ بذات خود حد سے زیادہ اچھی خاتون ہیں۔ مجھے ان کے حال پر بڑا ترس بھی آیا۔ مگر میں نے موقع کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا اور ان کی تعریف میں قصیدے شروع کر دئے۔ ایک ان کے پاس نسوار کی ڈبیہ ہے جس پر ان کی شبیہ بنی ہوئی ہے۔ یہ شبیہ اس وقت کی ہے جب وہ دلہن بنی تھیں، کوئی ساٹھ سال

* گوگول کے منظر "مقدمہ" کا ایک کردار بتاتا ہے کہ اس کی ایک بیمار رشتہ‌دار نے اپنے وصیت‌نامے کے آخر میں اپنے نام کی بجائے لفظ "اندر ڈیوؤ" لکھ دیا تھا۔ (ایڈیٹر)

پہلے۔ ان سے وہ ڈبیہ گر گئی۔ میں نے فوراً اٹھالی اور حیرت سے چیخا جیسے پہلے مجھے معلوم نہ تھا: Quelle charmante peinture!* واہ کیا بےمثال حسن ہے!، بس، اس سے تو وہ بالکل ہی پگھل گئیں اور مجھ سے کبھی ادھر کی، کبھی ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں تعلیم پائی ہے، کس کس کے ہاں آنا جانا ہے؟ بولیں کہ میرے سر کے بال بہت خوب ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے کو بڑھانے کے لئے میں نے انہیں ایک اسکینڈل سنا ڈالا جس پر انہیں ہنسی آئی۔ انہیں اس قسم کی چیزیں بہت پسند ہیں۔ انہوں نے یوں تو میری جانب انگلی اٹھائی (یعنی بری بات!) مگر اس کے باوجود انہیں ہنسی بہت آئی۔ جب انہوں نے مجھے رخصت کیا تو پیار کیا، دعائیں دیں اور وعدہ لیا کہ دیکھو روزانہ آیا کرو تاکہ جی بہلتا رہے۔ کاؤنٹ صاحب نے بھی میرا ہاتھ دبایا، ان کی آنکھوں میں چکنائی پیدا ہو گئی۔ اور ابا جان جو یوں بھی بہت شریف، نیک‌دل، مہربان اور باعزت آدمی ہیں، لیکن آپ یقین کیجئے، نہ کیجئے، اس روز جب ہم دونوں گھر واپس آئے تو وہ خوشی کے مارے روتے روتے سنبھل گئے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور کھل کر بات کرنے پر اتر آئے، مگر ذرا رازداری کے ساتھ کھل کر بات کی۔ مجھے سمجھانے لگے کہ کیریئر یعنی آدمی کا مستقبل، تعلقات، شادی اور روپیہ کتنی ضروری چیزیں ہیں۔ بہت سی ایسی باتیں انہوں نے کہیں کہ میں سمجھا بھی نہیں۔ اور اس کے بعد ہی انہوں نے مجھے یہ روپیہ بھی دیا۔ کل کا ذکر ہے یہ۔ اب مجھے پھر کل وہاں پرنسس صاحبہ کے ہاں جانا ہے۔ کچھ بھی ہو، میرے ابا جان بےحد باعزت آدمی ہیں۔ کوئی برا خیال مت رکھنا ان کے بارے میں۔ یہ اور بات ہے کہ نتاشا، وہ مجھے تم سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ محض اس وجہ سے ہے کہ ان کی آنکھوں میں چکاچوندھ ہو گئی ہے اور وہ کاتیا کے لاکھوں کی رقم پر دانت لگائے ہوئے ہیں اور تمہارے پاس رقم ہے نہیں۔ وہ رقم بھی چاہتے ہیں تو صرف میرے خیال سے۔ تمہارے ساتھ ان کی ناانصافی اس لئے ہے کہ وہ تمہارے بارے میں علم نہیں رکھتے۔

* واہ کیا لاجواب نقاشی ہے! (فرانسیسی)

کیا سبب ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی خوشی نہیں دیکھنا چاہتا؟ اور یہ ان کی خطا نہیں ہے جو وہ خوشی اور مسرت کو لاکھوں کی رقم سے ناپتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک ہی قسم کے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ ان کو انہی کے نقطۂ نظر سے جانچے تب کہیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ نہیں، وہ راستی پر ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر تمہارے پاس آنے کی جلدی مچائی نتاشا، صرف اس لئے کہ تمہیں اطمینان دلا دوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے ابا جان کی طرف سے تمہارا دل صاف نہیں ہے اور اس میں تمہاری بھی کیا خطا... میں کوئی تمہیں الزام نہیں دیتا...،،

"تو معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ اس قدر کہ تم نے پرنسس کی نظر میں اپنی حیثیت بنا لی؟ تو تمہاری ساری ہوشیاری کا حاصل یہی کچھ ہوا نا؟،، نتاشا نے سوال کیا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ میں کہوں گا کہ ایسا نہیں ہے۔ ابھی تو صرف آغاز ہے... میں نے تمہیں پرنسس کا قصہ صرف اس خیال سے سنایا کہ بتا سکوں کہ انہی کے ذریعے سے ابا جان پر میری گرفت ہوگی۔ لیکن اصل قصہ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔،،

"اچھا تو وہ بھی کہو۔،،

"آج میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ بہت ہی عجیب واقعہ ہے۔ ابھی تک میں حیرت‌زدہ ہوں،، الیوشا نے بیان جاری رکھا۔ "میں آپ کو یہاں پر یہ بتا دوں کہ اگرچہ میرے ابا جان اور کاؤنٹیس صاحبہ کے درمیان میری منگنی طے ہو چکی ہے لیکن ابھی تک کوئی باضابطہ اعلان اس بات کا نہیں ہوا ہے اس لئے کسی لمحے بھی یہ رشتہ توڑا جا سکتا ہے اور کوئی ہنگامہ یا کوئی بات نہیں ہوگی۔ صرف ایک کاؤنٹ نائنسکی صاحب ہیں جنہیں اس بات کی خبر ہے۔ مگر وہ پھر بھی ہمارے اپنے عزیز اور محسن سمجھے جاتے ہیں۔ اچھا اس سے بڑھ کر یہ کہ اگرچہ کاتیا سے میری اچھی خاصی ملاقات پچھلے دو ہفتوں سے چل رہی ہے لیکن ہم دونوں نے آج شام تک ایک بار بھی مستقبل یعنی شادی وغیرہ کے بارے میں — یعنی یوں کہو کہ محبت کا ایک لفظ اپنے منہ سے نہیں نکالا۔ اس کے علاوہ قاعدے کی بات ہے کہ پہلے ہمیں پرنسس 'ک' کی رضامندی حاصل کرنی چاہئے، کیونکہ وہی ہیں جن سے امید ہے

کہ سرپرستی کا ہاتھ رکھیں گی اور زر و زیور کی بارش کریں گی۔ جو وہ کہہ دیں گی دنیا وہی کہے گی — ان کا اثر و رسوخ بڑا ہے... اور سب سے زیادہ جو چیز مقصود ہے انہیں وہ یہ کہ پرنسس 'ک' ہی مجھے سماج میں آگے بڑھا سکتی ہیں۔ لیکن زیادہ‌تر یہ اصرار کاتیا کی سوتیلی ماں کاؤنٹیس کی طرف سے ہو رہا ہے جو اس معاملے کو طے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ غالباً بڑی پرنسس کو غیرملکوں میں ان کے کرتوت سے شکایت ہے اس لئے وہ اپنے خاندان میں کاتیا کی ماں کو لینے کے لئے تیار نہیں اور بڑی پرنسس نہ مانیں، تو پھر کوئی بھی منہ نہیں لگائے گا شاید۔ چنانچہ کاتیا سے میرا رشتہ گویا انہیں ایک اچھا بہانہ مل گیا ہے۔ چنانچہ وہی کاؤنٹیس جو اس رشتے کے سخت خلاف رہی ہیں، اب اس سے بہت خوش ہوئیں کہ مجھے پرنسس کے ہاں خاص عزت نصیب ہوئی۔ مگر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات جو مجھے کہنی تھی وہ یہ ہے کہ اگرچہ کاتیرینا فیودوروونا سے میری ملاقات پچھلے سال سے ہے، پھر بھی میں اس وقت تک محض لڑکا تھا، نہ تو کچھ سمجھ سکتا تھا اور نہ کچھ دیکھ سکتا تھا اس لڑکی میں...،،

"یوں سمجھو کہ اس وقت تک تم مجھ سے زیادہ محبت کرتے تھے،، نتاشا بیچ میں بول پڑی۔ "اور اسی لئے تم اس لڑکی میں کچھ دیکھ نہ سکے۔ اور اب...،،

"بولو مت نتاشا!،، الیوشا گرم ہوکر بولا "تم غلطی پر ہو، اور میری توہین بھی کر رہی ہو!.. میں تمہاری بات کا جواب تک نہیں دوں گا۔ تم سنتی جاؤ۔ خود مان لوگی... اور کاش تمہیں خبر ہوتی کہ کاتیا کیا ہے! کاش تمہیں اندازہ ہوتا کہ کیا نازک، نفیس، فاختہ جیسی روح اس نے پائی ہے! مگر تمہیں معلوم ہوجائے گا، ذرا مجھے اپنی بات ختم کر لینے دو۔ کوئی دو ہفتہ پہلے جب میرے ابا جان مجھے ان لوگوں کے ہاں لے کر پہنچے، وہ لوگ ابھی ابھی سفر سے لوٹے تھے، تو میں نے غور سے اس لڑکی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں نے تاڑ لیا کہ وہ بھی مجھے توجہ سے دیکھتی ہے۔ اس پر میرا تجسس بڑھ گیا۔ اور اس کے بارے میں کیا کہنا کہ اس لڑکی کے متعلق زیادہ جاننے کی طرف ایک خاص توجہ تھی ہی میری۔ اور اس وقت سے تھی جب سے مجھے ابا جان کا وہ خط ملا تھا جس کا مجھ پر اتنا اثر ہوا۔ میں اس لڑکی کے

بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اس کی تعریف نہیں کرنے والا۔
البتہ صرف ایک بات کہوں گا — وہ کیا کہ اپنے حلقے والوں کی وہ
بالکل ضد واقع ہوئی ہے۔ اس قدر اچھوتی طبیعت اس نے پائی ہے،
ایسی جاندار اور راست‌باز روح ہے، صداقت اور پاکیزگی میں اس قدر
پختہ‌کار مزاج ہے کہ میں تو اس کے سامنے بالکل بچہ لگتا ہوں،
قطعی چھوٹا بھائی اگرچہ اس کی عمر صرف سترہ برس کی ہے۔ ایک
اور بات جس کا مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک نہایت مغموم
کیفیت بسی ہوئی ہے، کوئی درپردہ سی شے۔ بہت کم‌سخن ہے
وہ۔ گھر پر بھی بولتی چالتی نہیں جیسے بولتے ڈرتی ہو... لگتا
ہے کہ اپنے ہی کسی خیال میں غرق ہے۔ مجھے خیال آتا ہے
کہ شاید میرے ابا جان سے وہ گھبرائی ہوگی۔ اسے اپنی سوتیلی ماں
بھی پسند نہیں ہیں۔ میرا اندازہ ہے یہ۔ خود کاؤنٹیس ہی نے اپنے
کسی مطلب سے یہ خبر پھیلائی ہے کہ میری سوتیلی بیٹی مجھے
بہت چاہتی ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ
کاتیا بےچون و چرا اس کا کہنا مانتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ ان دونوں ماں بیٹی میں اس بارے میں کوئی سمجھوتہ ہے۔
چار دن ہوئے تمام مشاہدوں کے بعد میں نے طے کیا کہ اب اپنے
ارادے کو عمل میں لانا چاہئے۔ چنانچہ آج شام میں نے وہی کیا۔
میرا منصوبہ یہ تھا کہ کاتیا سے سب کچھ کہہ ڈالوں گا، اس کے سامنے
پورا اعتراف کر لوں گا اور اسے اپنا طرفدار بنا لوں گا اور اس طرح یہ
سارا قصہ ختم ہو جائے گا...،،

،،کیا مطلب تمہارا؟ کیا کہنا تھا، کس بات کا اعتراف کرنا
تھا؟،، نتاشا نے بےچینی سے سوال کیا۔

،،سب کچھ قطعی طور سے، ہر بات،، الیوشا نے جواب دیا۔

،،خدا کا شکر کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا کی اور میری ہمت
بندھائی۔ لیکن پھر کیا ہوا، سنو! چار دن ہوئے کہ میں نے طے
کر لیا کہ تم دونوں سے الگ رہوں اور آپ سے ہی آپ اس قصے
کا خاتمہ کر دوں۔ اگر میں آپ لوگوں کے پاس ہوتا تو مجھے
یہ سب کرنے میں جھجک ہوتی رہتی۔ صرف آپ کی باتیں سنتا رہتا
اور خود کچھ کرنے کی جرأت کبھی نہ ہوتی۔ لیکن جب میں اکیلا
رہ گیا اور خود کو اس پوزیشن میں کر لیا جس میں ہر منٹ اپنے
آپ کو یاد دلاتا رہوں کہ مجھے یہ کرنا ہے، یہ قصہ ختم کر دینا

ہے، ختم کر ہی ڈالنا ہے، تو بہرحال میں نے جی کڑا کر لیا اور
اسے ختم کر ڈالا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے اس وقت آؤں
جب سارا قصہ نمٹ چکا ہو اور وہ اب نمٹ چکا ہے!،،

،،کیا؟ کیسے آخر؟ کیا صورت ہوئی؟ جلدی سے بتاؤ!،،

،،بڑی سیدھی سی بات ہے۔ میں نے کاتیا سے ہی نہایت صفائی،
جرأت اور ایمان‌داری کے ساتھ رجوع کیا... لیکن پہلے میں آپ کو
ایک اور بات بتا دوں جو اس سے ذرا پیشتر واقع ہوئی اور اس سے
میں کافی چونک گیا۔ گھر سے باہر نکلنے کے منٹ بھر پہلے
ابا جان کو ایک خط ملا۔ میں ان کے مطالعے کے کمرے میں
جا رہا تھا، جاتے جاتے دروازے میں رک گیا۔ ان کی نظر مجھ پر
نہیں پڑی۔ اس خط کا ان پر ایسا جادو ہوا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں
کرنے لگے، آپ ہی آپ منہ سے ہاں، ہوں کرتے گئے، اور کمرے
میں اکیلے بےخبر ٹہلتے رہے۔ اور ایک دم سے ہنسی چھوٹ گئی۔
خط اس وقت ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں اندر قدم رکھتے گھبرایا
اور منٹ بھر باہر ہی ٹھیرا رہا۔ ابا جان کسی بات پر ایسے مزے
میں آئے ہوئے تھے، اس قدر لطف لے رہے تھے کہ بس، وہ مجھ سے
کچھ عجب طرح مخاطب ہوئے، ایک دم بات توڑی اور کہا کہ
جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اگرچہ ابھی ہمارا باہر جانے کا وقت
نہیں ہوا تھا۔ آج ان کے ہاں گھر میں کوئی باہر کا آدمی
بھی نہ تھا، بس ہم دو ہی تھے اور ہاں، نتاشا، تمہارا اندازہ غلط
ہے کہ دعوت تھی وہاں، کسی نے تمہیں غلط اطلاع دی۔،،

،،افوہ، اصل بات سے مت بھٹکو الیوشا، مہربانی کرکے یہ بتاؤ
کہ تم نے کاتیا سے کیسے کہا؟،،

،،خوش‌قسمتی سے کاتیا کے ساتھ دو گھنٹے تنہائی کے مل
گئے۔ اور میں نے اس سے کہا کہ اگرچہ لوگ میرا تمہارا رشتہ
ٹھیرا رہے ہیں لیکن ہماری شادی ممکن نہیں ہے۔ میرے دل میں
تمہاری بڑی جگہ ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ تم ہی چاہو
تو مجھے بچا سکتی ہو۔ پھر میں نے اس کے سامنے ہر ایک بات
کا اعتراف کر لیا۔ ذرا خیال تو کرو کہ اسے ہمارے معاملے کا
کچھ بھی پتہ نہیں تھا، نتاشا! میرے تمہارے قصے کا کوئی علم
نہ تھا۔ کاش تم دیکھتیں کہ اس پر کس قدر اثر ہوا۔ شروع
میں تو وہ چونک ہی پڑی تھی۔ چہرے سے لہو اڑ گیا۔ بالکل

سفید پڑگئی۔ میں نے اسے سارا قصہ سنایا کہ کیسے تم نے میری خاطر اپنا گھربار چھوڑا، کیسے ہم دونوں تب سے ایک ساتھ رہتے ہیں اور اب ہم دونوں کس درجہ پریشان ہیں۔ ہر طرف سے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ آخری اپیل آپ سے کر رہے ہیں کہ (میں نے اسے تمہارا نام بھی بتا دیا، نتاشا) آپ ہماری حمایت کیجئے۔ اور اپنی سوتیلی ماں سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ مجھ سے آپ شادی نہیں کریں گی۔ بس اسی میں ہمارا چھٹکارا ہے اور کسی اور سے کوئی توقع نہیں کرنی ہے۔ اس لڑکی نے اس قدر دلچسپی اور ہمدردی سے ساری باتیں سنیں۔ اس لمحے اس کی آنکھیں، کیا کہوں کہ کیسی لگ رہی تھیں۔ ساری روح سمٹ آئی تھی ان آنکھوں میں تم جانو۔ آنکھیں اس کی قطعی نیلی ہیں۔ اول تو اس نے شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس پر کسی قسم کا شک و شبہ نہ کیا، پھر یہ قول دیا کہ اچھا، جتنا مجھ سے ہو سکے گا مدد کروں گی۔ پھر وہ تمہارے بارے میں پوچھنے لگی۔ کہنے لگی کہ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ مجھ سے کہا کہ تم تک یہ پیغام پہنچا دوں کہ وہ تم سے ٹھیک بہن کی طرح محبت کرتی ہے اور تم سے بھی اسی کی خواہاں ہے۔ جب اس نے میری زبانی سنا کہ میں تم سے پانچ دن سے ملنے نہیں آیا ہوں تو فوراً اصرار کرنے لگی کہ جاؤ۔ ملنے جاؤ...،،

نتاشا پر اثر ہوا۔

”اور تم تھے کہ اتنی دیر سے کسی بھری پرنسس کا قصہ سنانے میں وقت ضائع کئے چلے جا رہے تھے۔ ہائے، الیوشا، الیوشا!،، نتاشا اسے ملامت بھری نظر سے دیکھ کر چلائی۔ ”اچھا تم مجھے کاتیا کے بارے میں بتاؤ۔ خوش خوش تھی وہ؟ جب اس نے تمہیں رخصت کیا تو اچھے موڈ میں تھی؟،،

”ہاں وہ اس پر تو خوش تھی کہ ایک نیک کام کیا لیکن خود رو پڑی۔ کیونکہ وہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے، نتاشا۔ اس نے اپنی زبان سے کہہ دیا کہ اسے ابھی مجھ سے محبت شروع ہی ہوئی ہے۔ عام طور سے وہ لوگوں سے ملتی ملاتی نہیں ہے اور یہ کہ بہت عرصے سے اس کی چشم توجہ میری طرف تھی۔ اس کی نگاہ مجھ پر خاص طور پر اس لئے پڑی کہ چاروں طرف مکاری اور فریب ہی فریب نظر آتا ہے، اور میں اس کے خیال میں ایک مخلص

اور ایمان‌دار آدمی ٹھیرا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی ’اچھا تو الکسئی پترووچ، خدا کا سایہ رہے آپ پر، میں نے تو سوچا تھا کہ...، جملہ پورا کئے بغیر ہی اس کے آنسو ابل پڑے اور وہ کمرے سے چل دی۔ ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کل وہ اپنی سوتیلی ماں سے کہہ ڈالے گی کہ اسے مجھ سے شادی نہیں کرنی ہے اور میں بھی کل ابا جان سے صاف صاف دلیری سے دوٹوک کہہ دوں گا۔ کاتیا نے مجھے اس پر ٹوکا کہ پہلے ہی میں نے ابا جان سے کیوں نہ کہہ دیا۔ ’باعزت شریف آدمی کو کسی بات سے ڈرنا نہ چاہئے!، کس قدر اچھے دل کی لڑکی ہے واقعی! وہ بھی میرے ابا جان کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ کہتی ہے کہ وہ زیادہ چالاک ہیں اور روپے کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ میں نے ابا جان کی طرفداری کی۔ لیکن اسے میری بات کا یقین نہ آیا۔ اگر کل ابا جان سے میں منوا نہ سکا (اور کاتیا کا تو خیال ہے کہ میں کامیاب نہ رہوں گا) تو اس کی بھی رائے یہی ہے کہ پھر مجھے پرنسس ’ک، کی حمایت حاصل کرنی چاہئے۔ وہ مان جائیں تو کسی کی مجال نہیں جو مخالفت کرے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو قول دیا کہ بہن بھائی کی طرح رہیں گے۔ کاش تمہیں اس کی کہانی معلوم ہوتی۔ اس کا بھی دل کس قدر دکھا ہوا ہے۔ سوتیلی ماں کے ساتھ وہ اپنی زندگی کو، اپنے ماحول کو کس قدر بےزاری کے ساتھ دیکھتی ہے... اس نے صاف صاف تو مجھ سے کچھ نہیں کہا ایسے گویا مجھ سے بھی اسے اندیشہ ہو، لیکن اس کی زبان سے جو الفاظ نکلے ان سے مجھے اس کا اندازہ ہو ہی گیا۔ نتاشا جان! وہ تم کو اگر دیکھ لے تو مل کے کتنی خوش ہوگی! کیا نرم اور شریف دل اس نے پایا ہے! اس سے مل کر ایسا اپنا پن لگتا ہے کہ بس! تم دونوں کو قسمت سے ایک دوسرے کی بہن ہونا اور ایک دوسرے سے محبت کرنا بدا ہے۔ سارے وقت میں بس یہی سوچتا رہا۔ اور واقعی میرا دل چاہتا ہے کہ تم دونوں کو ملا دوں اور پاس کھڑا دونوں کو پیار سے دیکھتا رہوں۔ نتاشا پیاری اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہ لانا، اور مجھ سے اس کا ذکر سنے جانا۔ میرا یہی جی چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے اس کا اور اس کے سامنے تمہارا ذکر کرتا رہوں۔ تم

جانتی ہو کہ میں تمھیں اتنا چاہتا ہوں کہ کسی کو نہیں چاہتا، اس کو بھی اتنا نہیں چاہتا... تم میری سب کچھ ہو!،،

نتاشا ٹک ٹک اسے دیکھتی رہی، اس کی نظر میں پیار بھی تھا اور کوئی ملال بھی۔ الیوشا کے لفظوں سے گویا اسے راحت بھی مل رہی تھی اور ساتھ ساتھ نہ جانے کس قسم کی اذیت بھی۔

''اور بہت دن کی بات ہے، کوئی دو ہفتے کی کہ کاتیا مجھے بہت ہی شاندار لگتی تھی،، وہ کہتا چلا گیا۔ ''میں ہر شام ان لوگوں کے ہاں جایا کرتاتھا، سمجھیں تم! اور جب میں گھر واپس آتا تو اسی کا خیال رہتا، تم دونوں کا خیال۔ میں سوچتا رہتا اور تم دونوں کا مقابلہ کرتا رہتا۔،،

''اچھا تو، ہم دونوں میں سے کون بہتر ٹھہرا؟،، نتاشا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کبھی تم، کبھی وہ۔ لیکن آخر میں تم ہی بہتر نکلتی تھیں۔ اور دوسری طرف یہ کہ جب میں کاتیا سے باتیں کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں نہ جانے کیسے کچھ زیادہ دانش‌مند، کچھ زیادہ نیک‌سیرت ہوجاتا ہوں۔ لیکن کیا ہے۔ کل، بس کل کے دن سب کچھ طے ہو جائے گا۔،،

''تو کیا تمھیں اس پر ترس نہیں آتا؟ وہ تم سے پیار کرتی ہے، ہے نا؟ تم کہتے ہو کہ خود تم نے محسوس کیا۔،،

''ہاں، دل تو دکھتا ہے نتاشا۔ مگر ہم تینوں ایک دوسرے سے پیار کریں گے اور پھر...،،

''اور پھر خدا حافظ!،، نتاشا دبی زبان سے بول پڑی جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ الیوشا ہکا بکا رہ گیا۔

لیکن ہماری گفتگو میں نہایت اچانک طور پر کھنڈت پڑ گئی۔ باورچی‌خانے میں، جو ساتھ ساتھ ڈیوڑھی بھی تھا، ہلکا سا شور سنائی دیا جیسے کوئی اندر داخل ہوا ہو۔ منٹ بھر بعد ماورا نے دروازے کا پٹ کھولا اور الیوشا کو آہستہ سے سر کا اشارہ کیا۔ ہم سب اس کی طرف مڑ گئے۔

''کوئی تمھیں بلا رہا ہے۔ ذرا تکلیف کرو،، اس نے پراسرار آواز میں کہا۔

''مجھے اس وقت کون بلانےوالا ہو سکتا ہے؟،، الیوشا نے بھونچکے ہوکر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا جاتا ہوں۔،،

باورچی‌خانے میں اس کے باپ پرنس کا باوردی اردلی کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ پرنس نے گھر واپس جاتے ہوئے نتاشا کے مکان کے سامنے گاڑی روکی اور اوپر آدمی بھیجا کہ پتہ لگائے، الیوشا یہاں موجود ہے یا نہیں۔ اردلی یہ بتا کر الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

''عجیب بات! پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا،، الیوشا نے الجھن میں پڑتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آخر اس کا مطلب کیا؟،،

نتاشا نے فکرمند نظر سے اسے دیکھا۔ اتنے میں ماورا نے دوبارہ دروازہ کھولا۔

''خود پرنس آ پہنچے ہیں!،، ماورا نے جلدی جلدی زیرلب کہا اور فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

نتاشا پیلی پڑ گئی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ میز کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی اور اضطراب کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھا جس سے ناخواندہ مہمان داخل ہونےوالا تھا۔

''نتاشا، گھبراؤ نہیں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ میں تمھاری ذلت نہ ہونے دوں گا،، الیوشا نے کھسر پھسر کے انداز میں کہا۔ وہ خود بھی الجھن محسوس کر رہا تھا مگر ثابت‌قدم تھا۔

دروازہ کھلا اور چوکھٹ پر پرنس والکوفسکی بہ نفس نفیس نمودار ہوئے۔

دوسرا باب

اس نے ہم سب پر ایک پھرتیلی اور ٹوہ لینے والی نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ سے یہ قیاس کرنا ممکن نہ تھا کہ آیا وہ دوست کی طرح داخل ہوا ہے یا دشمن کی طرح۔ لیکن ذرا یہاں پر میں اس کی وضع قطع تفصیل سے بیان کرتا چلوں۔ اس شام خاص طور سے میرے ذہن پر اس کا نقش پڑا۔

میں نے اس شام کوئی پہلی بار اسے نہیں دیکھا تھا۔ عمر ہوگی یہی پینتالیس برس، اس سے زیادہ نہیں۔ خد و خال سانچے میں ڈھلے اور دلکش۔ تیور حالات کے مطابق ڈھلنے والے۔ لیکن تیوروں کے بدلنے میں ایک اچانک‌پن تھا۔ فوراً بدلتے تھے، بالکل بدل جاتے

تھے اور غیرمعمولی تیزی سے بدلتے تھے کہ ابھی ابھی ان پر رضامندی طاری تھی اور دم کے دم میں انتہائی ناگواری — ایسے جیسے کمانی دب گئی ہو۔ اس کے کسی قدر زیتونی چہرے کی بیضاوی تراش، اس کے بےعیب دانت، پتلے، نازک، کشیدہ ہونٹ، ذرا زیادہ ستواں ناک، کشادہ پیشانی جس پر کہیں شکن کا پتہ نہ تھا، خوب بڑی بڑی بھوری آنکھیں — یہ سب اوصاف ایسے تھے جو اسے کافی دلکش بناتے تھے مگر ان سب کے ہوتے بھی اس کے چہرے کا اثر خوشگوار نہ پڑتا تھا۔ چہرے کو دیکھ کر اس سے ایک طرح کی بیزاری پیدا ہوتی تھی، کیونکہ اس کی کیفیت گویا اپنی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ ہی مانگے کی، بناوٹی اور جان بوجھ کر پیدا کی ہوئی لگتی تھی اور دیکھنے والے کو اس بات کا پکا یقین دلاتی تھی کہ آپ کو اصلیت کی کبھی ہوا نہیں لگ سکتی۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھیں تو آپ کو یہ شبہ پیدا ہونے لگےگا کہ ان تیوروں پر سدا کی پڑی ہوئی نقاب کے پیچھے کوئی نہایت کینہ‌پرور، مکار اور حد سے زیادہ خودغرض شے چھپی ہوئی ہے۔ آپ کی توجہ خاص طور سے اس کی آنکھیں اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں جو دیکھنے میں نہایت خوب، بھوری بھوری اور کشادہ تھیں۔ صرف آنکھیں تھیں جنہوں نے لگتا تھا اس کے منشا کے مطابق پوری طرح عمل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مثلاً پرنس چاہے کہ مہربان اور خوش‌خلق نظر سے دیکھے، مگر اس کی آنکھوں کی روشنی دوغلی ہوتی تھی کہ ایک طرف ان میں نرمی اور شفقت کی چمک ہے اور اسی کے ساتھ سختی، درشتی، بےاعتباری، تجسس اور بدطینتی جھلک رہی ہے... وہ ذرا دراز قامت واقع ہوا تھا، اچھے چھریرے بدن کا آدمی اور اپنی اصلی عمر سے کم کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے نرم بھورے بالوں میں ابھی تک سفیدی نے اپنے نشان نہیں گاڑے تھے۔ کان، ہاتھ اور پاؤں واقعی داد طلب تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ باتیں نسلی ورثے میں اسے ملی ہوں‌گی۔ لباس میں بھی ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، تازگی اور جاذبیت تھی۔ ذرا نوجوانی کا رنگ لئے ہوئے جو کسی نہ کسی طرح اس پر پھبتی بھی تھی۔ وہ دیکھنے میں الیوشا کا بڑا بھائی لگتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو شاید ہی کوئی بھی یہ خیال کرتا کہ یہ شخص اتنے خاصے بڑے بیٹے کا باپ ہے۔

وہ سیدھا نتاشا کے پاس تک بڑھتا ہوا پہنچا اور اس کو مستعد نظر سے دیکھ کر بولا:

”میری حاضری آپ کے پاس ایسے وقت اور بغیر اطلاع کے عجیب بھی ہے اور خلاف اصول بھی۔ لیکن امید کرتا ہوں کہ آپ میری بات کا یقین کریں‌گی کہ کم از کم مجھے اپنی اس حرکت کے نامناسب ہونے کا احساس ضرور ہے۔ اور یہ بھی اندازہ ہے کہ کس سے مجھے واسطہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ دانش‌مند اور نیک‌دل ہیں۔ مجھے صرف دس منٹ عنایت کیجئے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری بات سمجھیں‌گی اور مجھے قصوروار نہیں ٹھیرائیں‌گی۔“

اس نے نہایت اخلاق کے ساتھ لیکن زور دےکر اس طرح یہ جملے ادا کئے جیسے اصرار کر رہا ہو۔

”تشریف رکھئے“، نتاشا نے کہا۔ ابھی تک وہ حواس‌باختہ اور کسی قدر سہمی ہوئی تھی۔

اس نے ذرا تعظیماً سر جھکایا اور بیٹھ گیا۔

”پہلے تو مجھ کو دو ایک لفظ ان سے کہنے کی اجازت ہو“، اس نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”الیوشا، جیسے ہی تم وہاں سے میرا انتظار کئے بغیر یا ہم لوگوں کو اطلاع دئے بغیر چل دئے تو کاؤنٹیس صاحبہ کو خبر کی گئی کہ کاتیرینا فیودوروونا کی طبیعت ناساز ہے۔ کاؤنٹیس صاحبہ انہیں دیکھنے دوڑنے ہی والی تھیں، کہ اتنے میں کاتیرینا فیودوروونا خود بہت ہی پریشان اور بےقرار آ پہنچیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے صاف صاف کہہ ڈالا کہ وہ تم سے شادی نہیں کر سکتیں۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ جوگ لے لیں‌گی، ترک دنیا کرکے کسی خانقاہ میں جا بیٹھیں‌گی، تم نے خود ان سے مدد طلب کی ہے اور ان کے سامنے اقرار کیا ہے کہ تمہیں نتالیا نکولائیونا سے محبت ہے... کاتیرینا فیودوروونا کی زبان سے اس قسم کا عجیب و غریب بیان، اور وہ بھی ایسے لمحے میں، لازمی طور سے نتیجہ ہے اس انتہا درجے کی عجیب اور نامناسب گفتگو کا جو تم نے ان سے کی تھی۔ وہ قریب قریب آپے سے باہر تھیں۔ سمجھتے ہو تم، میں کس قدر حیرت‌زدہ اور سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اب یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے آپ کی کھڑکی میں روشنی دیکھی“، اس نے نتاشا کی طرف رخ

کرتے ہوئے کہا۔ ''تو فوراً وہ خیال جو ایک زمانے سے میرے ذہن پر طاری رہا ہے، اس نے پھر مجھے اپنی گرفت میں اس طرح لے لیا کہ انکار کرتے، جان چھڑاتے نہ بنی۔ اور میں گاڑی سے اتر آیا کہ آپ کی طرف ہوتا چلوں۔ کس لئے؟ میں ابھی بتائے دیتا ہوں۔ لیکن پہلے میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر میرے بیان میں کسی قدر سختی آئے تو اس پر حیران نہ ہوں۔ کیونکہ یہ سب کچھ ناگہانی ہو گیا ہے...''

''مجھے امید ہے کہ سمجھوں گی اور کماحقہ اس کی قدر کروں گی... آپ جو فرمائیں گے،'' اندر سے مضطرب نتاشا نے کہا۔

پرنس نے نہایت گمبھیر نظر سے نتاشا کو دیکھا، ایسے جیسے ایک ہی لمحے میں اس کے سارے وجود کو آنکھوں میں اتار لینا چاہتا ہو۔

''مجھے آپ کی معاملہ فہمی پر کافی اعتماد ہے۔ اور میں نے جو یہاں اس وقت آنے کی جرأت کی تو صرف اسی بنا پر کہ مجھے معلوم تھا کہ کس سے میرا سابقہ ہوگا۔ بہت زمانے سے میں آپ کو جانتا ہوں اگرچہ ایک وقت ایسا بھی گزرا جب میں نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی اور اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ آپ میری پوری بات سن لیجئے — آپ جانتی ہیں کہ میرے اور آپ کے والد کے درمیان پرانی رنجش چلی آ رہی ہے۔ میں خود کو حق بجانب نہیں ثابت کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ جتنا میں اب تک خود کو سمجھتا رہا ہوں اس سے کہیں زیادہ مورد الزام ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس کی وجہ یہ کہ میں خود دھوکے میں رکھا گیا۔ میں وہمی شکی انسان ہوں، مانتا ہوں۔ مجھے نیکی کی بہ نسبت بدی کا زیادہ شک گزرتا ہے — یہ ایک بری خصلت ہے جسے سنگدلی کی خصوصیت کہنا چاہئے۔ لیکن میری یہ عادت نہیں کہ اپنی کمزوریوں کو چھپاؤں۔ مجھے آپ کے خلاف افواہوں کا یقین تھا اور جب آپ اپنے والدین کو چھوڑ کر نکلیں تو الیوشا کی طرف سے مجھے سخت فکر ہو گئی۔ لیکن تب تک میں آپ کو نہیں جانتا تھا۔ جو تھوڑی بہت خبر آپ کے بارے میں ملتی رہی ہے اس سے رفتہ رفتہ میرا دل صاف ہو گیا ہے اور شک وشبہ دور ہو چکا ہے۔ میں آپ پر نظر رکھتا رہا ہوں اور خوب غور سے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا ہوں اور آخر اب مجھے اس بات کا اطمینان ہو

گیا ہے کہ میرے تمام شکوک و شبہات بےبنیاد تھے۔ اب مجھ کو معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے گھروالوں سے جھگڑا کیا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی اطلاع مل چکی ہے کہ آپ کے والد اس کے خلاف ہیں کہ آپ کی میرے بیٹے سے شادی ہو جائے۔ اور تمام باتوں کے علاوہ خود یہ بات کہ آپ کا الیوشا پر اتنا گہرا اثر ہے اور بالفاظ دیگر اتنا زور ہے لیکن اس وقت تک آپ نے اس اثر سے کام لے کر الیوشا کو شادی پر مجبور نہیں کیا، یہی ایک ایسی بڑی بات ہے جو آپ کی طرف سے پوری وکالت کر لیتی ہے۔ اب میں آپ کے سامنے پوری طرح اعتراف کرتا ہوں کہ تب تک میں نے اپنے جی میں ٹھان رکھی تھی کہ آپ کی اپنے بیٹے سے شادی کے ہر امکان کی سخت مخالفت کروں گا۔ میں خود سمجھ رہا ہوں کہ میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ہے کہ میری جانب سے اس وقت صاف گوئی سب سے زیادہ درکار ہے۔ آپ خود مجھ سے اتفاق کریں گی جب آپ میری پوری گفتگو آخر تک سن لیں گی۔ جب آپ نے اپنا گھربار چھوڑا اس کے کچھ دن بعد میں پیٹرسبرگ سے باہر چلا گیا۔ لیکن اس وقت مجھے الیوشا کی جانب سے کچھ اور پریشانی نہیں تھی۔ آپ کی شرافت پر کافی بھروسہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ خود اس وقت تک شادی پر اصرار نہ کریں گی جب تک کہ ہمارے پرانے خاندانی قصے قضیے پاک نہ ہو جائیں۔ اور آپ خود اس کے لئے تیار نہ تھیں کہ میرے اور الیوشا کے درمیان باپ بیٹے کا جو خوشگوار رشتہ ہے اسے مٹا ڈالیں۔ کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ میں اس شادی کے قصور کو کبھی دل سے معاف نہ کرتا، اور پھر آپ یہ بھی پسند نہ کرتیں کہ بعد میں آپ کے متعلق کہا جائے کہ آپ نے ایک پرنس کو شوہر بنانے کی چال چلی اور اسے پنجے میں لے لیا تاکہ آپ کا ہمارے خاندان سے ناطہ جڑ جائے۔ بلکہ اس کے برخلاف آپ نے ہم کو نظر انداز ہی کر دیا اور غالباً آپ اس لمحے کے انتظار میں رہیں جب میں خود آپ کے پاس آؤں اور درخواست کروں کہ میرے بیٹے کا رشتہ قبول کیجئے۔ مگر اس کے باوجود میں اپنی ہٹ پر قائم رہا اور آپ کی بدخواہی میرے دل میں باقی رہی۔ میں خود کو حق بجانب ثابت نہیں کر رہا ہوں لیکن جو بات برحق ہے اسے چھپانا بھی نہیں چاہتا۔ اور وہ یہ ہے کہ اول تو آپ کے پاس

نہ دولت ہے نہ پوزیشن ۔ اگرچہ میرے پاس کچھ جائداد وغیرہ موجود ہے لیکن وہ ناکافی سمجھئے، ہمیں اس سے زیادہ کی ضرورت ہے ۔ ہمارا خاندان اپنے مقام سے گرتا جا رہا ہے ۔ ہمیں روپیے کی بھی ضرورت ہے اور اثرورسوخ کی بھی ۔ اگرچہ کاؤنٹیس زینائیدا فیودوروونا کی سوتیلی بیٹی کا بڑے لوگوں میں کچھ زیادہ رسوخ نہیں ہے تاہم دولت تو ہے ۔ اگر ہم نے دیر کی تو اتنے میں دوسرے رشتہ مانگنے والے پہنچ جائیں گے اور اسے اچک لے جائیں گے ۔ اس طرح کا زریں موقع آدمی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے ۔ اور اگرچہ ابھی الیوشا کم‌عمر ہے لیکن اس کے باوجود میں نے اس رشتے کا فیصلہ کیا ۔ آپ دیکھتی ہیں کہ میں آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا ۔ ممکن ہے آپ کی نظر میں اس باپ کی حیثیت گر جائے جو خود اپنی زبان سے یہ اعتراف کر رہا ہے کہ کسی تعصب سے اور روپیے کی خاطر وہ اپنے بیٹے کو ایسے عمل کی جانب لے جانا چاہتا ہے اور اسے ایک ایسی نیک طینت عالی‌ظرف لڑکی کو چھوڑ دینے کے لئے کہہ رہا ہے جس نے اپنا سب کچھ اس کی محبت پر قربان کر دیا اور جس پر اس کے اس قدر احسانات ہیں ۔ یہ ایک نامناسب حرکت ہے ۔ لیکن میں اس کے جواب میں اپنی صفائی دینا نہیں چاہتا ۔ دوسرا سبب جو رشتے کی اس تجویز پر مجھے مجبور کرتا ہے، یہ ہے کہ وہ لڑکی واقعی محبت اور عزت کی انتہائی مستحق ہے ۔ وہ خوبصورت بھی ہے، نہایت اعلی درجے کی تعلیم و تربیت بھی ملی ہے، دلکش عادات بھی پائی ہیں اور نہایت ذہین بھی ہے اگرچہ ابھی کئی باتوں میں بچی ہے ۔ الیوشا کی طبیعت میں ذرا بھی استقلال نہیں ۔ وہ ایک ناسمجھ نوجوان ہے ۔ اس میں قوت فیصلہ نام کو نہیں ۔ ۲۲ برس کی عمر ہونے آئی لیکن اس پر بھی وہ بچہ ہی ہے ۔ ہاں، البتہ اگر کوئی خوبی ہے اس میں تو وہ یہ کہ الیوشا دل کا اچھا ہے ۔ لیکن دوسری کوتاہیوں کو نظر میں رکھئے تو یہ خوبی خطرناک ہو جاتی ہے ۔ میں کافی دنوں سے یہ بات دیکھ رہا ہوں کہ اس پر سے میرا اثر کافور ہوتا جا رہا ہے اور نوجوانی کا جوش اور شوخی اس پر غالب آتی جاتی ہے اور جو بعض فرائض عائد ہوتے ہیں ان پر بھی یہ خصوصیات حاوی ہوتی جاتی ہیں ۔ میں اس سے بہت ہی والہانہ محبت کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی اب یہ بھی محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اکیلے کا اثر

کافی نہیں ہے ۔ کوئی نہ کوئی اور بھی ہونا چاہئے جو مستقل طور سے اپنے اثر میں اسے رکھے ۔ اس کی طبیعت میں سپردگی، کمزوری اور محبت‌بھرا ایثار ہے جو محبت کرنا اور حکم ماننا بہ‌نسبت حکم چلانے کے زیادہ پسند کرتی ہے ۔ وہ ساری عمر ایسے کا ایسا ہی رہے گا ۔ اب آپ ذرا سوچئے کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی جب کاتیرینا فیودوروونا جیسی بےمثال لڑکی مجھ کو ملی جسے میں اپنی بہو بنانے کی آرزو کر سکوں ۔ لیکن میری خوشی کی بیل چڑھنے میں دیر ہو گئی ۔ الیوشا اس سے پہلے ہی ایک ایسے اثر میں پوری طرح جکڑا جا چکا تھا جس کو اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا ۔ یعنی آپ کا اثر ۔ ایک مہینہ ہوا جب میں پیٹرسبرگ واپس آیا تبھی سے میں نہایت نزدیک سے اس پر نظر رکھتا رہا ہوں اور مجھے اس میں ایک خوشگوار تبدیلی دیکھ کر حیرت ہوئی ۔ غیرذمہ‌داری اور بچپن تو خیر جوں کے توں ہیں ۔ شاید ہی ذرا تبدیلی ہوئی ہو لیکن کچھ شرافت کے جذبات نے اس میں گہری جڑیں پکڑی ہیں ۔ اب وہ صرف کھیل تماشے سے ہی دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ ان چیزوں کی طرف بھی راغب ہونے لگا ہے جو شاندار ہیں، شریفانہ اور درحقیقت دیانت‌داری کی چیزیں ہیں ۔ اس کے خیالات عجیب، بےتکے، ڈانواڈول اور کبھی کبھی تو واہیات ہوتے ہیں مگر اس کی خواہشات، اس کے فطری رجحانات اور اس کا دل نہایت پاکیزہ ہیں ۔ اور یہی اصل بنیاد ہے ہر چیز کی ۔ الیوشا میں جو اعلی اوصاف ہیں وہ یقیناً آپ کی ہی طرف سے اس کو ملے ہیں ۔ آپ نے اس کی کایاپلٹ دی ہے ۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ خیال مجھے تبھی آیا تھا کہ غالباً اکیلی آپ کی ذات ہے جو اسے مسرت عطا کر سکے گی ۔ لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا ۔ میں دیر تک اس خیال سے لطف‌اندوز نہیں ہو سکتا تھا ۔ میں نے محسوس کیا کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن الیوشا کو آپ سے جدا کرنا ہی ہوگا ۔ چنانچہ میں نے اسی کے مطابق عمل کیا اور میرا خیال تھا کہ اپنے مقصد میں مجھ کو کامیابی ہوئی ہے ۔ صرف ایک گھنٹہ پہلے تک میں اسی گمان میں تھا کہ فتح میرے ہاتھ ہے ۔ لیکن ابھی ابھی کاؤنٹیس صاحبہ کے ہاں جو واقعہ پیش آیا اس نے میرے سارے اندازے الٹ کر رکھ دئے ۔ اور سب سے بڑھ کر جس چیز نے مجھ پر ضرب لگائی وہ ایک غیرمتوقع چیز تھی، مطلب یہ کہ آپ

کی محبت میں اس کا یہ استقلال اور شدت کے ساتھ مبتلا رہنا اور اس جذباتی شدت میں یہ پائداری اور قوت، جو اس جیسے انسان میں ایک عجیب چیز ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ آپ نے اس کی کایاپلٹ دی ہے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ الیوشا میں جو تبدیلی آئی ہے وہ خود میرے اندازے سے کہیں دور رس ہے۔ آج الیوشا نے ہوشیاری کا ایک ایسا عجوبہ ثبوت دیا ہے کہ اس کی ذات سے مجھے اس قسم کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اسی کے ساتھ غیرمعمولی باریک نظری اور احساس کی تہہ‌داری۔ اس نے خود کو اس پوزیشن سے نکال لے جانے کا، جسے وہ دشوار سمجھ رہا تھا، ایک پکا اور اچوک راستہ اختیار کیا۔ انسان کے دل میں جو سب سے نازک اور پاکیزہ تار ہوتا ہے، الیوشا نے اسے چھیڑ دیا، یعنی معاف کر دینا اور برائی کے بدلے میں نیکی برتنا۔ اس نے خود کو اسی وجود کے قدموں میں ڈال دیا جسے وہ دکھ دے رہا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسی وجود یعنی کاتیرینا فیودوروونا سے ہمدردی اور مدد بھی چاہی۔ وہ لڑکی جو اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی، اسی سے کھلم کھلا یہ کہہ کر کہ میں دوسری کو چاہتا ہوں، عورت کا غرور اس میں جگا دیا اور پھر ساتھ ساتھ رقیب لڑکی کے لئے ہمدردی اور معافی کی بھی درخواست کر دی اور یہ وعدہ کر لیا کہ میں تم سے بےلوث محبت، بہنوں کی سی محبت کرتا رہوں گا۔ توہین کئے یا دکھ دئے بغیر اس قسم کی صفائی پیش کرنے کی جرأت کر جانا ایسی بات ہے کہ بڑے سے بڑا ہوشیار اور تہہ‌دار آدمی بھی ہمیشہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو صرف تازہ، پاکیزہ اور ایسے ہی دل والے کر سکتے ہیں جن کو نہایت دانائی سے راہ دکھائی جا رہی ہو جیسے الیوشا کو۔ نتالیا نکولائیونا، مجھے یقین ہے کہ آج جو واقعہ پیش آیا اس میں زبانی یا اشارتاً بھی آپ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ آپ نے تو شاید یہ بات خود اسی کی زبانی ابھی ابھی سنی ہوگی۔ میرا اندازہ غلط نہیں ہے غالباً ہے نا؟،،

''جی‌ہاں۔ آپ نے غلط نہیں فرمایا،، نتاشا کے چہرے پر آب و تاب آگئی تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب والہانہ روشنی تھی۔ پرنس والکوفسکی کا زور بیان اس پر اثر دکھانے لگا تھا۔ ''پانچ دن ہو گئے کہ میں نے الیوشا کو دیکھا تک نہیں،، نتاشا بولی۔ ''اس نے یہ سب کچھ خود ہی سوچا اور خود ہی اس پر عمل بھی کیا۔،،

''بالکل درست،، پرنس نے تصدیق کر دی۔ ''لیکن اس کے باوجود یہ جو کچھ حیرت‌انگیز معاملہ‌فہمی، قوت فیصلہ اور احساس فرض اور قابل داد جوان مردی اس نے دکھائی ہے۔ یہ سب آپ ہی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ مکان جاتے ہوئے واپسی میں یہی بات میں سوچتا رہا۔ میں نے خوب اچھی طرح اس کو سمجھ لیا اور مجھے محسوس ہوا کہ فوراً قطعی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ کاؤنٹیس کی سوتیلی بیٹی سے جو رشتہ ہونا تھا وہ ٹوٹ چکا ہے، اب اسے پھر سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ اور فرض کیجئے پھر سے جوڑنا ممکن بھی ہوتا تب بھی حاصل کچھ نہ تھا۔ خیر، تو اب مجھے بالکل اطمینان ہو چکا ہے کہ صرف آپ ہی وہ عورت ہیں جو اسے مسرت عطا کر سکتی ہیں، آپ ہی اس کی صحیح رہنما ہیں اور آپ نے اس کی آئندہ مسرت کی بنیاد ڈال دی ہے۔ میں نے اب تک آپ سے کچھ نہیں چھپایا اور نہ اب آپ سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ مجھے کامیابی سے، ترقی سے، روپے سے، شہرت و عزت سے یہاں تک کہ عہدے سے محبت ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے اکثر چیزیں محض رسمی ہیں۔ لیکن یہ رسمی چیزیں مجھے پسند ہیں اور میں ان کے خلاف رخ اختیار کرنے کو قطعی پسند نہیں کروں گا۔ لیکن حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب کچھ دوسری چیزیں درپیش ہوتی ہیں اور عام باٹوں سے تولا نہیں جاتا... اس کے علاوہ مجھے اپنے بیٹے سے بہت والہانہ محبت ہے۔ قصہ مختصر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ الیوشا کو آپ سے جدا نہ کیا جائے کیونکہ آپ سے الگ ہوکر وہ بالکل غارت ہو جائے گا۔ کیا مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے؟ غالباً ایک مہینے سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں لیکن اب جا کر مجھے پکا یقین ہوا ہے کہ ہاں، یہ نتیجہ صحیح ہے۔ یہ کہتا چلوں کہ میں یہی باتیں کل بھی آپ سے آکر کر سکتا تھا بجائے اس کے کہ آج ہی آدھی رات کو آپ کا وقت خراب کروں۔ لیکن میری بےصبری ہی آپ کو یہ جتانے کے لئے کافی ہے کہ میں کس قدر شدت سے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ کس قدر خلوص سے اس معاملے کو سوچ رہا ہوں۔ میں لڑکا نہیں ہوں اور اب اس عمر میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جسے پہلے سے اچھی طرح جانچ تول نہ لیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں نے آپ کے ہاں قدم رکھا ہے ہر بات کو خوب اچھی طرح غور و فکر کے ساتھ طے کیا ہے۔ تاہم میں سمجھتا

ہوں کہ مجھے آپ کو اپنے خلوص کا یقین دلانے میں ابھی کافی وقت لگے گا... خیر، تو اب ہمیں اصل موضوع کی طرف آنا چاہئے۔ کیا یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ میں یہاں اپنا فرض ادا کرنے آیا ہوں اور نیک نیتی کے ساتھ دل کی گہرائی سے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے بیٹے کو یہ عزت بخشئے کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیجئے۔ آپ ہرگز اپنے دل میں یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں کوئی بےرحم باپ تھا جس نے آخر میں تھک کر اپنی اولاد کو معاف کر دینے کا فیصلہ کیا اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ لینے پر مجبور ہو گیا۔ جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر آپ نے مجھ سے ایسا خیال وابستہ بھی کیا تو میرے ساتھ ناانصافی کریں گی۔ آپ یہ بھی نہ سمجھئے کہ مجھے پہلے سے آپ کے رضامند ہو جانے کا یقین تھا کیونکہ آپ اس قدر قربانیاں میرے بیٹے کی خاطر کر چکی ہیں۔ جی یہ بھی نہیں۔ میں باآواز بلند یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کروں گا کہ میرا بیٹا الیوشا آپ کے قابل نہیں ہے اور خود وہ بھی... (شریف اور عالی‌ظرف ہوتے ہوئے) اس حقیقت کا اپنی زبان سے اعتراف کرے گا۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ صرف اتنی بات کہنے کی بےتابی مجھے یہاں اس وقت نہیں لائی ہے... میں یہاں اس لئے آیا ہوں...،، (یہ کہتے ہوئے وہ اپنی نشست سے نہایت وقار، احترام اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ سیدھا کھڑا ہوا) ،،میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ آپ کا خیرخواہ بن جاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا بلکہ حقیقت اس کے برخلاف رہی ہے۔ لیکن مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہ حق حاصل کروں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی توقع رکھوں!،،

وہ نتاشا کے جواب کا انتظار کرنے لگا اور ادب و احترام کے انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ جتنے عرصے وہ بولتا رہا تھا میں اس کو خوب غور سے دیکھتا رہا اور اسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ میں دیکھتا رہا ہوں۔

اس نے اپنی تقریر بالکل جذبات کے بغیر پوری کی۔ اس میں کہیں کہیں استدلال بھی تھا اور بعض موقعوں پر یوں ہی بےدلی سی۔ اس کی پوری تقریر کا لب و لہجہ اکثر جگہ اس جذبے سے میل نہیں کھاتا تھا جو ایسے ناوقت اسے یہاں مجبور کر کے لایا

تھا۔ ناوقت خاص طور سے پہلی ملاقات کے لئے اور وہ بھی اس قسم کی رشتہ‌داری میں۔ اس کے بعض جملے تو صاف طور سے بنائے سنوارے لگتے تھے اور اس طول طویل تقریر کے بعض حصوں سے جس کا طول بھی عجیب لگتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ ایک ایسا بےتکا آدمی بن رہا ہے جو جملہ‌بازی، لاپروائی اور مذاق میں کوئی گہرا اندرونی جذبہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر یہ سب باتیں مجھے اس واقعے کے بعد سوجھیں۔ واقعے کے وقت مجھ پر دوسرے قسم کا اثر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو کے آخری الفاظ ایسا خلوص طاری کر کے، اتنا جذبہ اور نتاشا کی نہایت سچی پکی عزت دکھا کر ادا کئے کہ ہم سب اس کی تاثیر میں گرفتار ہو گئے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس کی پلکوں پر قطرۂ‌اشک بھی اس وقت لرزا تھا۔ نتاشا کا کھلا دل تو پوری طرح جیتا جا چکا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نہایت متاثر ہو کر اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ہاتھ تھاما اور نہایت نرمی اور دل‌دوزی سے اسے بوسہ دیا۔ الیوشا خوشی کے مارے جامے میں نہیں سما رہا تھا۔

،،دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا، نتاشا؟،، وہ چیخ پڑا۔ ،،تم کو میری بات کا یقین نہ تھا۔ تم ہی نہیں مانتی تھیں کہ میرے ابا دنیا میں شرافت کا جواب نہیں رکھتے۔ اب دیکھ لو۔ خود دیکھ لو!..،،

وہ تیزی سے باپ کی طرف بڑھا اور جوش و خروش میں ان سے لپٹ گیا۔ باپ نے بھی اسی تپاک کا اظہار کیا لیکن اس جذباتی منظر کو مختصر کرنے میں تیزی دکھائی گویا اسے اپنے دل کی حالت دکھاتے شرم آ رہی ہو۔

،،بس،، اس نے کہا اور اپنا ہیٹ اٹھا لیا۔ ،،اب مجھے چلنا چاہئے۔ میں نے تو آپ سے صرف دس منٹ کی اجازت چاہی تھی اور اب ایک گھنٹہ ہونے آیا،، اس نے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کیا۔ ،،اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں اس بےتابی کے ساتھ کہ جتنی جلد ممکن ہوگا پھر ملیں گے۔ کیا آپ اس کی اجازت دیں گی کہ میں آپ کے ہاں بار بار آ سکوں؟،،

،،جی، ضرور، ضرور!،، نتاشا نے جواب دیا۔ ،،جتنی زیادہ بار آپ تشریف لا سکیں۔ میری آرزو ہے کہ جلد سے جلد... آپ سے

محبت کر سکوں،، اس نے اضطراب کی حالت میں جواب دیا۔
''آپ کس قدر مخلص ہیں، کتنی سچی!،، پرنس نے اس کے لفظوں پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ انکسار کی خاطر بھی تو چالاکی نہیں برت سکتیں۔ مگر آپ کا خلوص اس تمام مصنوعی انکسار سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے۔ جی ہاں، میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بہت وقت، بہت وقت لگے گا اس میں کہ آپ کی محبت کا حقدار بن سکوں۔،،
''نہیں، نہیں، آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے... بہت ہوا!،، نتاشا نے الجھ کر زیرلب کہا۔ اس لمحے وہ کیسی پیاری لگ رہی تھی!
''خیر، یوں ہی سہی،، پرنس نے آخری بات کہی۔ ''اچھا اب دو لفظ کام کے اور کہہ دوں۔ کیا آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ میں کس قدر بدبختی کا شکار ہوں۔ آپ کو معلوم ہے، میں کل بھی آپ کے ہاں حاضر نہیں ہو سکتا، اور پرسوں بھی حاضری نہیں ہوگی۔ کیونکہ آج شام ہی مجھے خط ملا ہے، بہت اہم خط ہے (مجھے فوراً ایک کام میں لگ جانا ہے) اور میں کسی طرح اس سے غفلت نہیں کر سکتا۔ کل صبح میں پیٹرسبرگ سے باہر جا رہا ہوں۔ آپ براہ مہربانی یہ خیال نہ فرمائیے کہ میں رات گئے اس وقت آپ کے ہاں اسی وجہ سے آیا کہ کل یا پرسوں مجھے آنے کی فرصت نہ ملتی۔ یقیناً آپ نے ایسا سوچا بھی نہ ہوگا لیکن یہ بھی میری شکی طبیعت کا ایک نمونہ ہے۔ بھلا یہ گمان ہی کیوں گزرا کہ آپ نے ایسا سوچا ہوگا۔ واقعی، میری اس بےاعتمادی نے زندگی میں بارہا نقصان پہنچایا ہے اور آپ کے خاندان والوں سے جو جھگڑا چل رہا ہے، اس سارے جھگڑے کی جڑ! میں بھی غالباً میرے اس منحوس مزاج کا ہی قصور ہوگا!.. آج منگل ہے، بدھ، جمعرات اور جمعہ، ان تین دن میں پیٹرسبرگ میں نہیں رہوں گا۔ اتوار تک بہرحال لازمی طور پر شہر میں واپس آجاؤں گا اور اسی روز آپ کے ہاں پہنچوں گا۔ ابھی سے بتا دیجئے، اس روز آدھی رات تک کا وقت کیا میں آپ کے ہاں گزار سکوں گا؟،،
''ضرور، ضرور، بےشک!،، نتاشا چیخ پڑی۔ ''میں ہفتے کی شام کو آپ کی منتظر رہوں گی۔ بےچینی سے آپ کا انتظار کرتی رہوں گی!،،
''مجھے اس کی بڑی خوشی ہے! اور آپ سے زیادہ سے زیادہ

قربت ہوتی جائے گی۔ لیکن... اب مجھے چلنا چاہئے۔ میں آپ سے ہاتھ ملائے بغیر نہیں جا سکوں گا اگرچہ،، اس نے ایک دم میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجئے گا کہ ہم اس طرح بےربطی سے باتیں کرتے رہے... آپ کے کئی موقعوں پر دیدار ہو چکے ہیں اور ایک بار تو کم از کم تعارف بھی ضرور کرایا گیا ہے۔ یہ عرض کئے بغیر رخصت لینا میرے لئے دشوار ہوگا کہ آپ سے ملاقات تازہ کرکے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔،،
''ہم مل چکے ہیں، یہ تو درست فرمایا آپ نے،، میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہمارے تعارف کی نوبت نہیں آئی۔،،
''پرنس 'ک' صاحب کے ہاں، پچھلے سال۔،،
''معاف کیجئے گا، میں بھول گیا تھا۔ لیکن اس بار آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہرگز نہیں بھولوں گا۔ آج کی شب ہمیشہ میری یاد میں محفوظ رہے گی۔،،
''جی ہاں۔ صحیح کہتے ہیں آپ۔ میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔ بہت دنوں سے مجھ کو معلوم ہے کہ آپ نتالیا نکولائیونا کے اور میرے بیٹے کے اچھے اور سچے دوست ہیں۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ تینوں مجھ کو چوتھے دوست کی حیثیت سے اپنا شریک بنا لیں گے۔ بنائیں گے نا؟،، اس نے نتاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''جی ہاں۔ صحیح معنوں میں یہ ہمارے دوست ہیں۔ اور ہم سب کو یکجا ہونا چاہئے!،، نتاشا نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ بیچاری لڑکی! وہ خوشی کے مارے چمکنے لگی کہ آخر پرنس نے مجھے نظرانداز نہیں کیا۔ کتنا چاہتی تھی مجھ کو نتاشا!
''میں بہت سے ایسے لوگوں سے مل چکا ہوں جو آپ کی لیاقت کے مداح ہیں،، پرنس نے گفتگو جاری رکھی۔ ''اور ان میں سے دو خاص قدردانوں کو تو میں خود جانتا ہوں۔ کاؤنٹیس صاحبہ جو میری سب سے قریبی دوست ہیں اور ان کی سوتیلی بیٹی کاتیرینا فیودوروونا فیلیمونووا۔ ان دونوں کو ذاتی طور پر آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔ کیا میں آپ سے یہ امید کروں کہ آپ مجھے اس شرف سے محروم نہ کریں گے کہ میں ہی ان دونوں معزز خواتین سے آپ کا تعارف کراؤں۔،،

”مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے۔ اگرچہ آجکل بہت کم لوگوں سے ملتا ہوں....“

”خیر آپ مجھے اپنا پتہ تو دے دیں گے۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟ میں خود ہی یہ شرف حاصل کر لوں گا....“

”اپنے ہاں تو میں کسی سے ملتا نہیں، جناب والا، کم از کم آجکل۔“

”خیر میں اس اصول سے مستثنا ہونے قابل نہ سہی.... پھر بھی....“

”ضرور، شوق سے، کیونکہ آپ کا اصرار ہے، مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں وہاں رہتا ہوں فلاں گلی، کلوگن بلڈنگ میں۔“

”کلوگن بلڈنگ میں!“ حیرت کے مارے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ”کیا معنی؟ کیا آپ وہاں... میرا مطلب ہے کہ کیا بہت زمانے سے رہتے ہیں؟“

”جی نہیں، بہت زمانہ تو نہیں ہوا“ میں نے جواب دیا اور بے اختیار اسے دیکھتا رہ گیا۔ ”میں نمبر ۴۴ میں رہتا ہوں۔“

”۴۴ نمبر؟ آپ وہاں... اکیلے رہتے ہیں — کیا؟“

”بالکل تنہا۔“

”اچھا، اچھا، میں نے آپ سے یہ سوال اس... لئے کیا کہ میں غالباً اس مکان سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ اور بھی اچھا ہوا... میں ضرور آؤں گا، آپ کے ہاں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ سے تو۔ اور آپ سے مجھے بڑی امیدیں ہیں۔ آپ میرے بڑے کام آسکتے ہیں۔ دیکھئے تو — چھوٹتے ہی میں نے غرض بیان کر دی۔ خیر، رخصت، پھر ایک بار ہاتھ ملائیے!“

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، الیوشا سے ہاتھ ملایا، نتاشا کے ہاتھ کو ایک بار پھر بوسہ دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ الیوشا سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے نہیں کہا۔

ہم تینوں کے تینوں بھونچکے بیٹھے رہ گئے۔ سب کچھ اس قدر اچانک، اتنا ایکدم سے ہو گیا تھا۔ ہم سب کو ایسا لگا کہ لو، پلک جھپکتے میں سب کچھ بدل گیا اور اب کوئی نئی اور قطعی انجانی بات شروع ہوتی ہے۔ الیوشا دم مارے نتاشا کے پہلو میں بیٹھ گیا اور آہستہ سے اس کے ہاتھ کو چوما۔ ذرا ذرا وقفے سے وہ اس کا منہ تکتا تھا کہ دیکھے وہ کیا کہتی ہے۔

”الیوشا، پیارے، تم کل جاؤ اور کاتیرینا فیودوروونا سے مل آؤ“ آخر وہ بولی۔

”میں خود ہی یہ سوچ رہا تھا“ الیوشا بولا ”ضرور جاؤں گا۔“

”لیکن تم سے مل کر شاید اسے دکھ ہوگا... تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“

”پتہ نہیں کیا کرنا چاہئے۔ مجھے خود بھی اس بات کا خیال آیا تھا... خیر میں سوچوں گا... ذرا دیکھتا ہوں کیسا رہتا ہے... پھر فیصلہ کروں گا۔ اچھا تو نتاشا، اب تو سب کچھ بدل گیا نا؟“ الیوشا بولا۔ اس سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

وہ مسکرا دی اور اسے دیر تک پیار بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

”اور دیکھو، شائستہ کتنے ہیں۔ خود دیکھا کہ تمہارے مکان کی حالت کیسی خستہ ہے۔ مگر اس کے بارے میں ایک لفظ بھی...“

”کس کے بارے میں؟“

”یہ کہ... یہاں سے دوسرے مکان میں منتقل ہو جانے کے... یا اور کچھ“ کہتے ہوئے الیوشا کے منہ پر سرخی دوڑ گئی۔

”فضول بات! الیوشا بھلا اس کی ضرورت کیا تھی؟“

”یہی تو میں کہتا ہوں۔ ان میں اس قدر نفاست ہے۔ اور تمہاری کتنی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے تو تم سے کہا تھا... کہہ چکا تھا میں۔ واقعی وہ ہر چیز کو سمجھ سکتے ہیں اور خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ مگر میرا ذکر ایسے کرتے تھے جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ یہ سب لوگ مجھے بالکل بچہ سمجھتے ہیں۔ مگر میں جانوں کہ ہوں بھی بچہ ہی۔“

”ہاں تم بچے تو ہو ہی لیکن ہم سب سے زیادہ تیز ہو۔ الیوشا، تم بہت اچھے ہو!“

”اور انہوں نے کہا کہ میری نیکدلی نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ بھلا کیا مطلب ہوا اس کا؟ میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا خیال ہے نتاشا — میں ابھی لپک کر ان کے ساتھ نہ چلا جاؤں؟ کل دن کا اجالا ہوتے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

”ہاں، جاؤ۔ چلے جاؤ پیارے۔ اچھا ہوا کہ تمہیں اس کا خیال آیا۔ اور ہاں، سنتے ہو — ان سے مل ضرور لینا۔ اور کل

جتنی جلدی ممکن ہو، آجانا۔ اب تم پانچ دن کے لئے مجھ سے بھاگ نہیں سکتے، سمجھے!،، بن کر اس نے کہا۔ مگر آنکھوں میں الیوشا کے لئے پیار بھرا تھا۔

ہم سب ایسے عالم میں تھے کہ خاموشی اور پرسکون مسرت طاری تھی۔

''تم بھی آتے ہو میرے ساتھ، وانیا؟،، الیوشا نے باہر جاتے ہوئے چلا کر پوچھا۔

''نہیں، یہ ابھی ٹھیریں گے۔ وانیا، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اچھا دیکھو، کل دن نکلتے ہی۔،،

''دن نکلتے ہی۔ اچھا رخصت ماورا!،،

ماورا بری طرح بے تاب تھی۔ اس نے پرنس کی ساری گفتگو باہر سے ہی سن لی تھی۔ اس تقریر میں ایسی بہت باتیں تھیں جو وہ نہیں سمجھی۔ اسے یہ بےچینی تھی کہ کچھ تو خود قیاس دوڑائے اور کچھ پوچھ پاچھ کر سمجھ لے۔ اس کی صورت پر ایسی سنجیدگی برس رہی تھی بلکہ فخر نظر آ رہا تھا۔ اسے بھی یہ ضرور اندازہ ہو گیا تھا کہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔

ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ نتاشا نے میرا ہاتھ پکڑا اور تھوڑی دیر بالکل خاموش رہی، جیسے کچھ کہنے کی تلاش میں ہو۔

''میں تھک گئی،، آخر اس نے بہت نقاہت ماری آواز میں کہا۔

''سنو، کل تم جاؤ گے نا ہمارے گھروالوں کے ہاں؟،،

''ضرور۔،،

''اماں کو تو بتا دینا مگر ان سے مت کہنا کچھ۔،،

''اور ویسے بھی تمہارے بارے میں ان سے بات نہیں کرتا ہوں میں۔،،

''ہاں یہ تو ہے۔ مگر اس کے بغیر ہی انہیں پتہ چل جاتا ہے۔ ذرا خیال رکھنا کیا کہتے ہیں وہ اور ان پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اف توبہ ہے پروردگار، وانیا! کیا واقعی وہ سچ مچ اس شادی کی بنا پر مجھے مردود ٹھیرا دیں گے؟ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا!،،

''پرنس صاحب کو پورا معاملہ چکانا پڑے گا،، میں نے جلدی سے اسے لقمہ دیا۔ ''انہیں چاہئے کہ تمہارے والد سے جو جھگڑا چل رہا ہے اسے نمٹائیں۔ اور پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔،،

''اف خدایا! کاش یوں ہی ہو، کاش!،، وہ التجاآمیز انداز میں چلائی۔

''فکر مت کرو نتاشا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یقیناً ایسے ہی آثار نظر آتے ہیں۔،،

اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا۔

''وانیا، کیا خیال ہے تمہارا پرنس کے بارے میں؟،،

''جو کچھ اس نے آج کہا ہے اگر خلوص دل کے ساتھ کہا ہے تو میری رائے میں وہ خاصا شریف آدمی ہے۔،،

''اگر — اگر وہ مخلص ہے؟ کیا مطلب؟ یقیناً انہوں نے خلوص سے ہی کہا ہوگا۔،،

''میں بھی کچھ یہی سوچتا ہوں،، میں نے جواب دیا۔ ''اور گویا اس کے ذہن میں بھی ایسا ہی خیال آیا،، میں نے سوچا۔ ''عجیب بات ہے یہ!،،

''تم لگاتار ان کی طرف تکتے ہی رہے... غور سے...،،

''ہاں، وہ ذرا عجیب سے لگ رہے تھے۔،،

''میں بھی یہی سوچتی تھی۔ وہ ایسے بولتے چلے گئے... میرے دوست، میں تو تھک گئی۔ میں جانوں — اب تم آرام کرو گھر جا کے۔ اور کل ہمارے گھروالوں سے مل کر جتنی جلدی ہو سکے آجانا۔ ہاں، ایک بات اور ہے، بتاؤ تو — کیا میری جانب سے بدتمیزی نہیں تھی جو میں نے کہا کہ میں بھی چاہتی ہوں کہ آپ سے محبت کرنے لگوں؟،،

''نہیں... اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے؟،،

''تو کیا... یہ بےوقوفی نہیں تھی؟ دیکھو نا — یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے میں نے کہہ دیا کہ ابھی تک تو میں آپ کو پسند نہیں کرتی تھی۔،،

''بالکل نہیں۔ اس کے برعکس۔ یہ تو بہت خوبصورت، سادہ اور بے اختیار جملہ تھا۔ اس لمحے تم ایسی پیاری لگ رہی تھیں۔ اگر وہ اپنے اونچے گھرانے کی تربیت کی بدولت اس بات کو سمجھ نہیں سکے تو خود بےوقوف ہیں!،،

''تم ان سے ناراض معلوم ہوتے ہو، وانیا۔ لیکن کس قدر حواس باختہ ہوں میں بےوقوف، کیسے شکوک میں گھری ہوئی ہوں اور اپنی ہی فکر میں پڑی ہوں! مجھ پر ہنسنا نہیں۔ تم جانتے

ہو، میں تم سے کچھ چھپا کے نہیں رکھتی۔ ہائے وانیا، میرے عزیز، سب سے پیارے دوست! اگر پھر دوبارہ مجھ پر بپتا پڑی، اگر پھر مصیبت بھوگنی ہوئی تو میں جانتی ہوں تم میرے ساتھ ہوگے بلکہ شاید تم اکیلے ہی میرا ساتھ دوگے، بھلا میں تمہارے احسان کیسے چکاسکتی ہوں! مجھے کبھی ٹھکرانا نہیں، وانیا!،،

گھر واپس آتے ہی میں نے فوراً کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہوگیا۔ کمرے میں ایسی تاریکی اور سیلن تھی جیسے تہہ‌خانہ ہو۔ عجیب طرح کے خیالات اور وسوسے مجھ پر ٹوٹنے لگے اور دیر تک آنکھ نہیں لگی۔

لیکن عین اسی وقت ایک شخص جب اپنے آرام‌دہ بستر پر ٹانگیں پھیلاکر سونےوالا ہوگا تو ہم پر کتنا ہنسا ہوگا۔ وہ بھی تب جب اس نے ہمیں اس قابل سمجھا ہو کہ ہماری ہنسی اڑائی جائے۔ کیا عجب کہ ہمیں اس قابل بھی نہ سمجھا ہو!

تیسرا باب

دوسرے دن صبح کو کوئی دس بجے جب میں اپنے گھر سے نکلنےوالا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ پہلے واسی لیفسکی جزیرے میں اخمنیف گھرانے کے یہاں جاؤں گا، پھر وہاں سے نتاشا کے ہاں، تو اچانک کل‌والی ملاقاتی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہی اسمتھ مرحوم کی نواسی دروازے پر ٹکرائی۔ وہ مجھے دیکھنے آئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں، لیکن اتنا یاد ہے کہ اسے دیکھ کر مجھے بےحد خوشی ہوئی۔ کل تو اتنا بھی موقع نہ مل سکا تھا کہ اسے نظر بھر کے دیکھ ہی لوں لیکن دن کی روشنی میں جو نظر پڑی تو اور بھی حیرت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکی سے زیادہ عجیب اور اچھوتی صورت کی ہستی کم از کم ظاہرا حلیے میں تو ملنا مشکل تھی۔ چھوٹا سا جثہ، چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں جو کچھ غیرروسی لگتی تھیں، سر پر بھاری الجھے ہوئے بالوں کا گچھا، بالکل خاموش، ایک جگہ گڑی ہوئی اور مبہم نظریں۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر سڑک پر کوئی بھی راہ‌گیر ٹھٹک سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت واقعی کھٹک پیدا کرتی تھی — ان میں ذہانت

کی چمک سی تھی اور ساتھ ساتھ تجسس کی بےاعتمادی بھی بلکہ کہنا چاہئے شک وشبہ پایا جاتا تھا۔ دن کی روشنی میں اس کی پرانی میلی کچیلی فراک اور بھی زیادہ خستہ‌حال دکھائی دی۔ دیکھ کر مجھ کو ایسا لگا جیسے کوئی پرانی بیماری ہے اسے جو اندر ہی اندر گھلائے دے رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کا جسم کھائے جا رہی ہے۔ اس کے زرد اور سوکھے چہرے پر ایک طرح کی غیرفطری سانولے رنگ کی زردی لئے ہوئے بجھی بجھی کیفیت تھی۔ لیکن غریبی اور بیماری کی اس تمام پھٹکار کے باوجود وہ ذرا دیدہ زیب لگتی تھی۔ اس کی بھویں بڑی تیکھی، کھنچی ہوئی اور خوبصورت تھیں۔ لیکن ناک نقشے میں سب سے بڑھ کر جو چیز نمایاں تھی وہ تھی اس کی کشادہ اور ذرا جھکی ہوئی پیشانی اور ہونٹ۔ ہونٹوں کی نہایت نفیس تراش جس میں فخر وخودداری کے ساتھ دلیری پائی جاتی تھی۔ لیکن تھی بالکل پیلی۔ بس نام کو چہرے پر رنگ تھا۔

''اوہو۔ تو پھر تم آگئیں!،، میں چیخ پڑا۔ ''اچھا، مجھے معلوم تھا کہ تم آؤگی۔ آ جاؤ اندر۔،،

وہ اندر چلی آئی۔ اور جیسے کل دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے بڑھی تھی، اسی طرح اب کے بھی دھیرے قدموں سے اپنے چاروں طرف بے اعتماد نظروں سے دیکھتی ہوئی آ گئی۔ اس نے کمرے میں' ہر طرف' نظر اٹھاکر غور سے دیکھا جہاں اس کے نانا ابا رہا کرتے تھے گویا وہ پتہ چلانا چاہتی ہو کہ اب نئے کرایہ‌دار کی آمد سے یہاں کیا کیا تبدیلی ہوئی ہے۔ ''خیر تو جیسے نانا تھے ویسی نواسی، کہیں اس کی عقل میں بھی فتور تو نہیں ہے!،، میں نے سوچا۔ وہ چپ رہی اور میں بھی انتظار کرتا رہا کہ وہ بولے۔

''کتابیں لینے!،، اس نے آخر نگاہیں جھکاکر آہستہ سے زبان کھولی۔

''ہاں، ہاں، تمہاری کتابیں، یہ رہیں کتابیں۔ اٹھا لو۔ میں نے تمہارے لئے ہی خاص طور سے رکھ چھوڑی تھیں۔،،

اس نے مجھ پر ٹوہ لینےوالی نظر ڈالی اور اس کے ہونٹ ایسے عجیب طرح سے سکڑے کہ گویا اب بےاعتباری کی مسکراہٹ ان پر پھیل جائےگی۔ لیکن مسکراہٹ پھیلتے پھیلتے رک گئی

اور اس کی جگہ وہی سخت اور مبہم آثار ظاہر ہوئے۔

"تو کیا، نانا ابا نے میرے متعلق آپ سے کچھ کہا تھا؟"، اس نے سوال کیا اور طنز کی نگاہ سے سر سے پیر تک مجھے دیکھا۔

"نہیں، انہوں نے تو کچھ نہیں کہا تھا، لیکن..."

"تو پھر آپ کیسے سمجھے کہ میں آؤں گی۔ کس نے بتایا آپ کو؟"، لڑکی نے جلدی سے میری بات کاٹ کر سوال کیا۔

"کیونکہ میں نے اندازہ لگایا کہ تمہارے نانا ابا اکیلے نہیں رہتے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ سب سے الگ تھلگ پڑے ہوں۔ وہ اس قدر بوڑھے اور کمزور تھے کہ مجھے خیال گزرا کہ کوئی نہ کوئی ضرور ان کی دیکھ بھال کرتا ہوگا... یہ رہیں تمہاری کتابیں۔ اٹھا لو۔ کیا ان ہی سے سبق پڑھتی ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم ان کتابوں کا کیا کروگی؟"

"نانا ابا مجھے پڑھایا کرتے تھے، جب میں ان کے پاس آتی تھی..."

"پھر تم نے آنا چھوڑ دیا؟"

"بعد میں... پھر میں نہیں آئی۔ بیمار ہو گئی تھی"، اس نے کہا جیسے اپنی صفائی دے رہی ہو۔

"اچھا، یہ بتاؤ — تمہارا گھر ہے؟ ماں باپ ہیں تمہارے؟"

اس نے ایک دم تیوری چڑھالی اور مجھے ایسے دیکھا جیسے کوئی اندیشہ ہو۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں، خاموشی سے مڑی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر چل دی، اسے جواب دینے کی بھی فکر نہ تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے کل کر چکی تھی۔ میں حیرت سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ لیکن وہ ڈیوڑھی میں دم بھر کو رکی۔

"کاہے سے ان کا انتقال ہو گیا؟"، اس نے مجھ سے اچانک سوال کیا اور میری جانب ذرا سا مڑی، ٹھیک اسی طرح اور اسی انداز سے جیسے کل مڑی تھی جب اس نے ازورکا کتے کے بارے میں جاتے جاتے منہ دروازے کی طرف کئے ہوئے پوچھا تھا۔

میں اس کی طرف بڑھا اور پاس جاکر جو کچھ مجھے بڑے میاں کی موت کے بارے میں معلوم تھا اسے بتا دیا۔ خاموشی اور

تجسس کے ساتھ وہ سنتی رہی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور پیٹھ میری طرف تھی۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتا دیا کہ بڑے میاں نے مرتے وقت سڑک نمبر ۶ کا کس طرح ذکر کیا تھا۔

"ان کے اس ذکر سے مجھے یہ خیال ضرور گزرا تھا کہ ہو نہ ہو سڑک نمبر ۶ پر ان کا کوئی بہت عزیز قریب رہتا ہے اور اسی وجہ سے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی آئے گا اور ان کے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا۔ انہیں تم سے بڑی محبت ہوگی جو اس طرح آخری وقت تمہیں یاد کیا۔"

"نہیں"، اس نے دبی زبان سے کہا گویا یہ لفظ منہ سے بے سوچے سمجھے نکل گیا ہو۔ "انہیں مجھ سے قطعی محبت نہیں تھی۔"

اس کے تن بدن میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جب میں بڑے میاں کی موت کا واقعہ بیان کر رہا تھا تو ذرا جھک کر میں نے اس کے چہرے پر نگاہ کی۔ دیکھا کہ وہ اس بات کی انتہائی کوشش کر رہی تھی کہ شدید جذبے کو اندر ہی اندر دبا لے جیسے اسے حیا آ رہی ہے کہ کہیں میں دیکھ نہ لوں۔ وہ پیلی پڑتی چلی گئی اور اپنا نچلا ہونٹ چباتی رہی۔ لیکن جس چیز نے مجھے خاص طور سے حیرت‌زدہ کیا وہ اس کے دل کی دھڑکن تھی۔ دل کی دھڑکن اتنے زور کی تھی کہ اس کی آواز برابر بڑھتی جا رہی تھی اور دو تین قدم کے فاصلے سے بھی سنی جا سکتی تھی جیسے انیورزم (اعصابی بیماری) میں ہوتا ہے۔ میں ڈرا کہ بس اب وہ پھوٹ پڑے گی جیسے کل ایک دم رو پڑی تھی۔ لیکن نہیں روئی۔ ضبط کئے رہی۔

"اور وہ جنگلہ کہاں ہے؟"

"کون سا جنگلہ؟"

"جس کے نیچے ان کا انتقال ہوا۔"

"دکھا دوں گا... جب ہم باہر چلیں گے۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"کیا ضرورت ہے..."

"'کیا ضرورت ہے' کا کیا مطلب؟"

"کوئی ضرورت نہیں... کچھ نہیں... میرا کوئی نام نہیں" اس نے رک رک کر کہا جیسے تنگ ہو رہی ہو اور باہر نکلنے کے لئے بڑھی۔ میں نے اسے روک لیا۔

"ذرا ٹھیرو، کیسی عجیب لڑکی ہے! میں تو تمہارا بھلا چاہتا تھا۔ کل سے مجھے تم پر ترس آ رہا ہے جب میں نے تمہیں سیڑھیوں پر ایک کونے میں روتے دیکھا تھا۔ مجھ سے تو وہ منظر یاد بھی نہیں کیا جاتا... پھر اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ تمہارے نانا ابا نے میرے بازوؤں میں دم توڑا ہے۔ اور یقین ہے کہ جب ان کے منہ سے سڑک نمبر ۶ کا لفظ نکلا ہے تو وہ تمہارے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ اس لئے مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں میری ہی نگرانی میں دے گئے ہیں۔ مجھے وہ خوابوں میں نظر آتے ہیں... تمہارے لئے میں نے یہ کتابیں بھی اٹھا رکھی تھیں۔ لیکن تم پر ایسی وحشت سوار ہے کہ جیسے مجھ سے ڈر رہی ہو۔ میرے خیال میں تم بہت تکلیف سے بسر کر رہی ہو اور تمہارے والدین بھی نہیں ہیں اور غیروں میں تمہاری زندگی کٹ رہی ہے۔ کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

میں نے اس بچی کو ہموار کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں خود بھی نہیں بتا سکتا کہ اس کا میرے دل و دماغ پر اتنا زبردست اثر کیوں تھا۔ میرے دل میں اس بچی کے لئے جو جذبہ بھرا تھا اس میں رحم یا ترس کے علاوہ کچھ اور بھی ضرور تھا۔ ممکن ہے کہ اس پورے واقعے کے یوں پراسرار ہونے کا دخل ہو۔ ممکن ہے اسمتھ کا جو میرے ذہن پر اثر تھا، وہ دخیل ہو، یا خود میرا وہمی موڈ اس کا سبب ہو، میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن کوئی بات تھی جو مجھے اس بچی کی طرف بےحد کھینچتی تھی۔ معلوم ہوا کہ میرے الفاظ اس کے دل کو لگے۔ اس نے مجھے ایک اور ہی نظر سے دیکھا۔ نظر عجیب تھی مگر اس میں اب کرختگی نہیں تھی بلکہ نرمی تھی، وہ دیر تک دیکھتی رہی، پھر نظریں جھکائیں جیسے کچھ سوچ میں پڑ گئی ہو۔

"یلینا"، اس نے ایک دم آہستہ سے کہا اور بےحد نرمی سے۔

"تمہارا نام ہے یلینا؟"

"جی ہاں..."

"اچھا تو کیا اب تم میرے یہاں آیا کروگی؟"

"مناسب نہیں... مجھے نہیں معلوم... آؤں گا"، اس طرح اس نے زیرلب کہا جیسے اندر ہاں اور نہیں کی کشمکش جاری ہو اور وہ سوچ میں پڑ گئی ہو۔ عین اسی وقت کہیں دیواری گھنٹہ

بجا۔ وہ ایک دم چونک سی گئی اور دل مسوس کر رہ جانے والی درد بھری کیفیت میں ڈوب کر اس نے آہستہ سے پوچھا "اب کیا بجا ہے؟"

"ہو نہ ہو، ساڑھے دس بجے ہیں۔"

خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

"اف خدایا!"، بےاختیار اس کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھی مگر میں نے اسے پھر ڈیوڑھی میں روک لیا۔

"میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا"، میں نے کہا۔ "تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟ کیا دیر ہو گئی؟"

"جی ہاں — میں چپکے سے کھسک آئی تھی۔ اب مجھے جانے دیجئے، وہ ماریں گی مجھے!"، اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو وہ کہنا چاہتی تھی اس سے زیادہ کہہ گئی ہے۔ اور فوراً مجھ سے جان چھڑانے لگی۔

"مگر سنو، بھاگو مت۔ تم وہیں جاؤگی نا واسی‌لیفسکی؟ میں بھی وہیں جا رہا ہوں، سڑک نمبر ۱۳ پر۔ مجھے بھی دیر ہو گئی ہے اور گاڑی لوں گا۔ ساتھ چلنا چاہتی ہو؟ میں تمہیں پہنچا دوں گا۔ پیدل جانے سے پہلے پہنچ جاؤگی۔ سمجھتی ہو؟"

"آپ میرے ساتھ نہ چلئے۔ میرے ساتھ نہیں!"، وہ ایسے بولی جیسے اور زیادہ ڈر گئی ہو۔ محض اس خیال سے ہی کہ کہیں میں اس کے ساتھ وہاں نہ پہنچ جاؤں جہاں وہ رہتی ہے اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"مگر میں نے تم سے کہا کہ مجھے اپنے کام سے سڑک نمبر ۱۳ پر جانا ہے۔ میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا۔ تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔ گاڑی سے چلیں گے تو ذرا جلدی پہنچ جائیں گے۔ آؤ، چلو ساتھ!"

ہم جلدی جلدی زینہ اتر گئے۔ پہلا ہی کوچوان جو مجھے اپنی خستہ‌حال گھوڑا گاڑی لئے ہوئے ملا اس کو میں نے پکار لیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یلینا چونکہ میرے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی تھی تو اسے اضطراب تھا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ میں نے اس سے پوچھ گچھ کرنے کی جرأت بھی نہیں کی کیونکہ جیسے ہی میں نے پوچھا کہ گھر پر کون ہے جس سے تمہیں اتنا ڈر لگتا ہے تو اس نے اپنے ہاتھ ہلائے اور گھبراہٹ

کے مارے گاڑی سے بالکل کودنے لگی۔ میں نے جی میں سوچا ''آخر یہ راز کیا ہے؟،،

گھوڑا گاڑی میں بیٹھنا اس کے لئے ایک مصیبت ہو گیا تھا۔ ہر ایک جھٹکے پر وہ اپنے ننھے سے بائیں ہاتھ سے میرا کوٹ مضبوط تھام لیتی تھی۔ میلے کھرونچ پڑے ہاتھ سے وہ میرا کوٹ پکڑکے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے کتابیں تھامے ہوئے تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ کتابیں اس کے لئے بڑی بیش قیمت چیز تھیں۔ جب اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تو اتفاق سے اس کی ٹانگ سامنے آ گئی اور اس وقت یہ دیکھ کر میں حیرت‌زدہ رہ گیا کہ بچی کی ٹانگوں میں موزے تک نہ تھے، بس سوائے پھٹے جوتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ اگرچہ میں نے جی میں ٹھان لی تھی کہ اس سے کسی چیز کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں گا لیکن پھر بھی تاب ضبط نہ رہی اور میں پوچھ بیٹھا۔

''کیا واقعی تمہارے پاس موزے نہیں ہیں؟ ایسے پانی بارش کے موسم میں اور اتنی ٹھنڈ میں تم ننگے پاؤں باہر کیسے نکل آئیں؟،،

''میرے پاس ہیں ہی نہیں،، اس کے منہ سے بےسوچے سمجھے نکل گیا۔

''اف توبہ، مگر تم کسی نہ کسی کے ساتھ ہی تو رہتی ہوگی۔ جب باہر نکلنا ہوا کرے تو کسی سے تھوڑی دیر کو مانگ لیا کرو، کیا ہے!،،

''نہیں، میں خود یہی چاہتی ہوں۔،،

''اور ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤگی، مر جاؤگی۔،،

''مر جانے دو۔،،

ظاہر تھا کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی اور میرے سوالوں سے اسے دکھ ہوا۔

''دیکھو، یہ ہے جگہ، جہاں وہ مرے تھے،، میں نے اس مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے نزدیک اسمتھ کا انتقال ہوا تھا۔

اس نے کڑی نگاہ سے دیکھا اور ایک دم میری طرف رخ کرکے التجا کرنے لگی:

''خدارا، آپ میرا پیچھا نہ کیجئے۔ میں آؤں گی۔ پھر آؤں گی آپ کے ہاں۔ جیسے ہی موقع ملے گا، آؤں گی!،،

''بہت اچھا، میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ پیچھا نہیں کروں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ، کس چیز سے اس قدر ڈری ہوئی ہو؟ کوئی بات ہے جس سے تم دکھی ہو۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے...،،

''مجھے کسی کا ڈر نہیں،، اس نے جواب دیا مگر آواز میں ایک طرح کا چڑچڑاپن تھا۔

''مگر ابھی ابھی تو تم نے کہا: وہ مجھے ماریں گی!،،

''مارنے دو!،، وہ بولی۔ اور اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ''مارنے دو، بلا سے!،، اس نے تلخی سے یہی جملہ پھر دہرایا۔ اس کا اوپر کا ہونٹ ناگواری سے مڑا اور لرز گیا۔

آخر ہم واسی‌لیفسکی جزیرے میں پہنچ گئے۔ اس نے چھٹی سڑک کے نکڑ پر گاڑی رکوائی اور وہیں سے چھلانگ لگاکر اتر گئی۔ اترتے ہوئے اس نے فکرمندی سے چاروں طرف دیکھا۔

''اب آپ بڑھ جائیے۔ میں آؤں گی، آؤں گی ضرور!،، اس نے دہرایا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس کا گھر تک پیچھا نہ کروں۔ ''جائیے، جلدی سے چلے جائیے!،،

میں نے گاڑی آگے بڑھوائی۔ لیکن دریا کنارے کنارے چند گز آگے بڑھنے کے بعد میں نے گاڑی رکوائی اور اسے چکاکر سڑک نمبر ۲ کی طرف چل دیا۔ میں سڑک تیزی سے پار کر رہا تھا کہ پھر میں نے اسے دیکھا، اگرچہ تیز قدموں سے جا رہی تھی تاہم ابھی وہ دور نہیں گئی تھی اور بار بار پیچھے دیکھتی جا رہی تھی۔ بلکہ وہ رک گئی اور پیچھے مڑکر دیکھا کہ کہیں میں تعاقب میں تو نہیں ہوں۔ لیکن میں ایک پھاٹک کی آڑ میں ہو گیا اور اسے نظر نہیں آیا۔ وہ پھر آگے چل دی اور میں بھی سڑک کی دوسری پٹری پر پیچھے پیچھے ہو لیا۔

میرے دل کو انتہا درجے کی کرید لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ میں سوچ چکا تھا کہ گھر کے دروازے تک پیچھا نہیں کروں گا پھر بھی یہ جاننے کی بےتابی رہی کہ ذرا اتنا تو پتہ چلا ہی لوں کہ وہ آخر کس مکان میں رہتی ہے۔ مجھے پھر ایک بار عجیب قسم کا ناگوار دھڑکا ہو رہا تھا۔ اور یہ کیفیت اس سے بہت مختلف نہیں تھی جو اس کے نانا نے مجھ پر چھوڑی تھی اس وقت جب مٹھائی والے کی دکان میں ازورکا مرا ہے...

ہم دور تک چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مالی پراسپکٹ (چھوٹی سڑک) آگئی۔ وہ قریب قریب دوڑ رہی تھی۔ آخر وہ ایک چھوٹی سی دکان میں چلی گئی۔ میں وہیں ٹھہر گیا اور تاک میں رہا کیونکہ میں نے سوچا ''یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ اس دکان میں رہتی ہو،،۔

واقعی، کوئی منٹ بھر بعد وہ دکان سے نکل آئی۔ لیکن اب اس کے پاس کتابیں نہیں تھیں۔ کتابوں کے بجائے ہاتھوں میں مٹی کا برتن تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر وہ ایک بھونڈی شکل کی عمارت کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ مکان بڑا نہیں تھا۔ اینٹوں کا بنا ہوا، پرانا اور دو منزلہ، میلے پیلے رنگ سے لپا ہوا۔ نیچے کی منزل کی تین کھڑکیوں میں سے ایک پر کسی معمولی سے تابوت‌ساز کا تجارتی اشتہار بنا ہوا تھا یعنی ایک چھوٹا سا لال تابوت۔ اور اوپر کی منزل کی کھڑکیاں بہت ہی چھوٹی چھوٹی اور قطعی چوکور تھیں جن پر بھدے سبز رنگ کے ٹوٹے ہوئے شیشے لگے تھے۔ ان میں سے مجھے گلابی رنگ کی چھینٹ کے پردے جھلکتے نظر آئے۔ میں نے سڑک پار کی، مکان تک گیا اور دروازے پر لوہے کی تختی پر یہ نام لکھا ہوا دیکھا: ''مکان بینووا بیگم،،۔

مگر ابھی میں نے بمشکل اس تحریر کے حرفوں کو پڑھا تھا کہ اتنے میں بینووا بیگم کے مکان کے احاطے سے ایک عورت کے دھاڑنے کی آواز آئی اور اسی کے بعد فوراً گالی کوسنے کی بوچھار۔ دروازے کے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لکڑی کے زینے پر ایک دھرے بدن کی ادھیڑ عورت، بیگماتی لباس میں، سر پر ٹوپی لگائے اور سبز شال ڈالے کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ ایسے گہرے لال رنگ کا تھا کہ دیکھ کے گھن آئے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ابلی ہوئی سرخ آنکھیں غصے سے دہک دہک رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ پیے ہوئے ہے حالانکہ ابھی دن شروع ہوا تھا۔ غریب بلینا پر اس کے گالی کوسنے پڑ رہے تھے اور بلینا اس کے سامنے ہاتھوں میں مٹی کا برتن لئے سہمی کھڑی تھی۔ اس کٹھور بیگم کی پیٹھ کے پیچھے سیڑھی پر سے لالی پوڈر تھوپے

ہوئے ایک عورت جھانک رہی تھی جس نے ابھی کنگھی چوٹی بھی نہیں کی تھی۔ ذرا دیر بعد تہہ‌خانے کی طرف اترنے والی سیڑھیوں کے پاس ایک دروازہ کھلا اور خستہ حال لباس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت جو دیکھنے میں شریف اور تمیزدار لگتی تھی، سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔ غالباً شور پکار نے اسے متوجہ کیا ہوگا۔ تہہ خانے‌والی منزل کے دوسرے رہنے‌والے، ایک بہت بوڑھا مرد اور جوان لڑکی، بھی ایک پٹ سے جھانکنے لگے۔ ایک بڑے تن و توش کا دیہاتی جو غالباً چوکیدار ہوگا، احاطے کے بیچوں بیچ جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا تھا اور اس تماشے کو یوں ہی بےپرواہی اور بےدلی سے دیکھ رہا تھا۔

''اری تو بڑی حرافہ ہے، جونک! گوہ کا کیڑا!،، وہ عورت پھٹ پڑی، جتنے گالی کوسنے اسے یاد تھے، سب ایک سانس میں انڈیلنے شروع کر دئے۔ بےنقط اور بےتحاشا سنا رہی تھی۔ ''میرا کلیجہ کھا جائےگی تو خصم کھانی! میں نے اسے کھیرے لینے بھیجا اور یہ کھسک گئی! بھیجتے وقت ہی میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ دیکھنا یہ چمپٹ ہو جائےگی، وہی ہوا نا۔ کلیجہ پکا دیا اس نے! کل شام اسی بات پر جھونٹے پکڑکے دو دو گھڑی کی مار دی ہے، مگر آج پھر یہ اڑ گئی! کہاں جاتی ہے تو، چھنال؟ کون دھگڑا بیٹھا ہے تیرا، جس کے پاس چھپ چھپ کے پہنچتی ہے؟ شیطان کی بچی، سانپ کی جنی، کس کے پاس جاتی ہے؟ بول، اب، منہ پھوٹے سے کچھ بول تو سہی۔ دلدل کی سڑانڈ! بول، نہیں تو گلا گھونٹ دوں‌گی!،،

اور طیش میں بھری ہوئی سنڈی اس بچی پر ٹوٹ پڑی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ نیچے کی کرایہ‌دار عورت نکل کر باہر دوباری میں آ گئی ہے، اور وہاں سے دیکھ رہی ہے وہ ایک دم رک گئی، اس عورت کی طرف رخ کرکے اور بھی اونچی آواز سے چیخ پڑی، ہاتھ ہلانے لگی گویا اپنے اس بےبس شکار کے خوفناک جرم کے لئے گواہ طلب کر رہی ہو۔

''دیکھنا بہن، اس کمبخت کی ماں مر گئی۔ بھلے آدمیو، تم تو جانتے ہو — اب یہ دنیا جہان میں اکیلی ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے پاس پڑی ہے اور آپ کو خود ہی روٹی کے ٹوٹے ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ حضرت نکولاس کے نام پر میں ہی ایک کارخیر

کر دوں اور اس بن ماں باپ کی بچی کو لے لوں۔ لے تو لیا میں نے۔ اور آپ نے کیا سمجھا؟ دو مہینے سے اسے اپنے پاس رکھے ہوئے ہوں۔ ان دو مہینے میں اس نے میرا لہو پی لیا اور ہڈیوں کا ڈھنڈار کرکے رکھ دیا مجھے۔ جونک کہیں کی! سنپولیا! شیطان کی انگلی! اب کیسی دم سادھے ہوئے ہے۔ مارو، چاہے نکال باہر کرو، دم سادھے رہےگی۔ جیسے منہ میں گھنگھنیاں بھر رکھی ہوں۔ بولتی نہیں! اس کے دم سادھنے سے میرا دل الٹا جاتا ہے۔ اب تو کس کا دم بھر رہی ہے، چھنال کہیں کی؟ ہرے منہ کی بندریا؟ تو سڑک پر پڑی پڑی بھوکوں مر گئی ہوتی اگر میں نہ ہوتی تو۔ تجھے تو چاہئے تھا کہ میرے پاؤں دھو دھوکے پیتی، چڑیل، کالی چمٹی۔ میرے بغیر تو دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی!،،

”مگر آپ کو کیا ہو گیا؟ اپنا جی کیوں جلا رہی ہیں، آتنا تریفونوونا؟ کیا بات ہو گئی جو اس نے پھر آپ کو غصہ دلا دیا؟،، اس عورت نے احترام کے ساتھ پوچھا جسے اس بھوتنی نے مخاطب کیا تھا۔

”کیا بتاؤں، نیک بخت، تم سے کیا کہوں! مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری مرضی کے خلاف کام کیا جائے۔ اپنی مرضی کا اچھا بھی ہو تو مت کرو، مگر میری مرضی کا برا بھی ہو تو کرو۔ میں اس مزاج کی عورت ہوں۔ آج تو اس نے مجھے قبر میں ہی اتار دیا تھا۔ میں نے اسے دکان پر کھیرے لانے بھیجا تھا اور اب وہ لوٹی ہے تین گھنٹے میں۔ جب میں نے اسے باہر بھیجا تھا تبھی میرے دل کو دھڑکا ہوا تھا۔ دل کھرچا جا رہا تھا، ہوک اٹھ رہی تھی۔ کہاں رہ گئی؟ کہاں چلی گئی؟ کون سے اسے اپنے ہوتے سوتے مل گئے؟ میں نے اس کے ساتھ کون‌سی بھلائی نہیں کی تھی؟ کیا کسر رکھی بتاؤ، اس چھنال کی اماں کے کفن دفن پر اپنی گانٹھ سے چودہ روبل لگائے، اور اب اس شیطان کی بچی کی پال پوس اپنے ذمے لی۔ تم تو جانتی ہو بہن۔ تمہیں تو سب خبر ہے۔ تم سے کیا پردہ! اب اس کے بعد بھی میرا اس پر کوئی حق نہیں رہا؟ اسے خود سمجھنا ماننا چاہئے۔ احسان ماننا تو رہا ایک طرف اور الٹی میری مرضی کے خلاف چلتی ہے۔ میں تو اس کا بھلا چاہتی ہوں! میں نے تو اس چڑیل کے لئے ململ کا فراک بنوایا۔

گوستینی دوور* سے میں نے اس کے لئے بوٹ خریدے۔ مور کی طرح بنانے سنوارنے کی سوچی جیسے کوئی تہوار میں بن ٹھن کے نکلتا ہے۔ اور آپ کو یقین آئےگا، بھلے آدمیو! دیکھئے، اس نے دو دن میں کپڑوں کے چیتھڑے لگا دئے۔ پرزے پرزے کرکے رکھ دئے۔ اور اب یوں گھومتی پھرتی ہے، ایسے گھوم رہی ہے۔ اور آپ کو کیا خبر، آپ کیا سمجھتے ہیں۔ اس لونڈیا نے جان بوجھ کے کپڑوں کے پرزے کئے ہیں! میں کوئی آپ سے جھوٹ کہوں‌گی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مطلب یہ کہ میں تو چیتھڑوں میں ہی پھروں‌گی۔ مجھے ململ وائل نہیں چاہئے۔ اچھا تو پھر میں نے دو چوٹ کی مار دی۔ اس کی طبیعت صاف کر دی۔ بعد میں مجھی کو دوادارو کرنی پڑی اور اس پر جیب سے روپیہ خرچ ہوا۔ کمینی کہیں کی! تجھے جوں کی طرح اگر پیس ڈالوں تو میرا کیا بگڑےگا! یہی کہ ہفتے بھر دودھ کے خرچ کا نقصان ہو جائے۔ تیرا خون کرنے کی اس سے زیادہ کیا سزا ملنی ہے! میں نے کہا، اچھا تو فرش دھو۔ یہ تیری سزا ہے۔ اور آپ کیا سمجھتے ہیں۔ فرش دھونے پر جو لگی ہے، تو بس دھوئے چلی جا رہی ہے۔ میرے دل میں چنگاریاں اٹھنے لگیں۔ فرش دھو رہی ہے۔ اب یہ ٹھہرےگی نہیں۔ میں نے سوچا۔ بھاگ لےگی یہاں سے۔ ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ مڑکر جو دیکھتی ہوں تو نکل بھاگی۔ آپ نے بھلے آدمیو سنا ہی ہوگا کہ کل میں نے اس کو بھاگ جانے پر کیا مار دی ہے۔ مارتے مارتے میرے ہاتھ دکھ گئے۔ اس کے موزے جوتے سب اتروا لئے کہ اب ننگے پاؤں باہر کیسے نکلےگی۔ پھر دیکھوں تو آج پھر غائب ہے۔ کہاں تھی؟ بتا مجھ سے! کس سے میری شکایت کرنے گئی تھی؟ پاجی کہیں کی! اب بتا تو سہی، کس کے کان بھرنے گئی تھی؟ بتا، اٹھائی گیری؟ بےہنگم ھدو، بول نا؟،،

اور غضبناک بیگم اس خوف سے تھرتھر کانپتی ہوئی بچی پر جھپٹی اور اس کے جھونٹے پکڑکے زمین پر گرا دیا۔ کھیروں کے اچار کا مرتبان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور تڑاک سے ٹوٹا۔ اس سے مست ہتھنی کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس نے بچی کے منہ اور

* گوستینی دوور — پیٹرسبرگ کا بازار جس میں لباس، کپڑوں، جوتوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ (ایڈیٹر)

سر پر دوہتڑوں کی بوچھار کر دی۔ لیکن یلینا کی زبان اس پر بھی بند رہی۔ ایک بھی آواز اس کے منہ سے نہ نکلی۔ وہ چیخی چلائی تک نہیں۔ جب دوہتڑوں، گھونسوں، طمانچوں کی بوچھار ہو رہی تھی تب بھی اس نے آہ نہیں بھری۔ غصے اور نفرت کے مارے مجھے اپنے آپے کی خبر نہیں رہی، اور میں سیدھا اس بےقابو بیگم کی طرف لپکا۔

’’یہ کیا کرتی ہو؟ ایک غریب بےماں باپ کی بچی پر یوں ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی!،، میں زور سے بولا اور اس ابلتی ہوئی جوالا کا بازو پکڑ لیا۔

’’یہ کیا حرکت ہے اور تم کون بولنے والے؟،، یلینا کو ایک طرف چھوڑ کر وہ زور سے بولی۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لئے اور چلائی ’’تم کون میرے گھر میں دخل دینے والے؟،،

’’دخل یہ دیتا ہے کہ تم بےدرد عورت ہو۔ بیچاری بچی کو مار مار کے ادھ موا کئے دے رہی ہو۔ تمہاری اولاد نہیں ہے یہ۔ ابھی ابھی میں اپنے کانوں سے سن چکا ہوں کہ بیچاری بن ماں باپ کی بچی کو تم نے رکھ لیا ہے۔ بس...،، میں نے ڈانٹ کر کہا۔

’’اوف، یسوع مسیح!،، وہ بلا چیخی۔ ’’مگر میں پوچھتی ہوں، تم کون بیچ میں ٹانگ اڑانے والے! تم کیا اس لڑکی کے ساتھ آئے ہو، کیا بات ہے آخر؟ میں ابھی پولیس میں رپٹ کر دوں گی۔ آندرون تیموفیئچ بھی مجھ سے تمیز سے پیش آتے ہیں۔ کیا یہ تمہارے ہی پاس جاتی ہے؟ تم ہو کون؟ دوسرے کے گھر میں بن بلائے دخل دینے آ پہنچے۔ ہائے دوڑیو!،،

وہ مجھ پر گھونسے تان کر جھپٹی۔ عین اسی لمحے ایک غیرانسانی ہولناک چیخ بلند ہوئی۔ میں نے مڑ کے دیکھا — یلینا جو اس وقت تک بےسدھ بنی کھڑی تھی، ایک دم زمین پر دھڑام سے گر پڑی۔ گرتے وقت اس کے حلق سے خوفناک، غیرانسانی چیخ نکلی اور بدن بری طرح تڑپنے لگا۔ چہرہ بگڑ گیا۔ اس پر مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ یہ بپھری ہوئی حرافہ اور وہ عورت جو تہہ‌خانے والی منزل سے نکلی تھی دونوں دوڑیں۔ انہوں نے یلینا کو زمین پر سے اٹھایا اور افراتفری میں اسے اوپر لے چلیں۔

’’جہنم رسید ہو جا، چڑیل!،، پیچھے سے بیگم چیخی۔ ’’مہینے

میں اسے یہ تیسرا دورہ پڑا ہے... نکل جا یہاں سے، بھڑوے!،، اور ڈانٹ کر پھر وہ مجھی پر جھپٹی۔ ’’کھڑا منہ کیا تک رہا ہے، چوکیدار! تجھے تنخواہ کس کام کی ملتی ہے؟،،

’’چل یہاں سے! چلتا بن! نہیں تو گدی سہلا دی جائے گی،، چوکیدار نے مری ہوئی آواز میں بھبکی دی جیسے صرف دکھاوے کو کہہ رہا ہو۔ ’’دو کے بیچ میں تیسرے کی صحیح نہیں۔ سلام کر اور دفان ہو!،،

اب کیا ہوتا۔ میں مجبوراً پھاٹک سے نکل آیا۔ مجھے احساس تھا کہ دخل اندازی بیکار ثابت ہوئی۔ لیکن غصے اور نفرت کی لو اٹھ رہی تھی مجھ میں۔ مکان کے سامنے جو فٹ پاتھ تھا میں وہاں ٹھیر گیا اور پھاٹک میں سے دیکھنے لگا۔ میرے وہاں سے ہٹ جانے پر وہ بلا زینے سے اوپر چلی گئی اور چوکیدار اپنا کام کر کے کسی طرف غائب ہو گیا۔ منٹ بھر بعد میں نے دیکھا کہ تہہ خانے والی منزل کی وہ عورت جس نے یلینا کو اوپر لے جانے میں ہاتھ بٹایا تھا، تیز قدموں سے اترنے لگی۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹھک گئی اور تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے پرسکون مہربان چہرے کو دیکھ کر میری ہمت پڑی۔ میں پھر احاطے میں داخل ہوا اور سیدھا اس کے پاس پہنچا۔

’’معاف کیجئے گا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں — یہ بچی کون ہے؟ اور اس ذلیل عورت کا اس سے کیا واسطہ ہے؟ آپ ہرگز یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں محض جاننے کی خاطر پوچھ رہا ہوں۔ جی نہیں۔ میں اس بچی سے مل چکا ہوں اور خاص وجوہ سے مجھے بچی کے معاملے سے دلچسپی بھی ہو گئی ہے۔،،

’’اگر آپ کو ایسی ہی دلچسپی ہے تو اچھا ہے کہ اسے یہاں سے لے جائیں یا اس کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈھ دیجئے۔ یہاں تو وہ بالکل خاک میں مل جائے گی،، عورت نے بظاہر بےنیازی سے کہا اور اس طرح اشارہ کیا کہ اب وہ چلی۔

’’لیکن اگر آپ مجھے بتائیں گی ہی نہیں، تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ غالباً یہی مالکہ مکان ہے بینووا؟،،

’’جی ہاں، مالکہ مکان۔،،

"تو یہ بچی اس کے ہاتھ کیسے پڑ گئی؟ کیا اس کی ماں یہیں اسی کے پاس مری تھی؟"

"بس اس کے ہاتھ پڑ گئی۔ ہمیں اس سے کیا واسطہ؟" پھر وہ چلنے لگی۔

"آپ ایک عنایت کیجئے مجھ پر۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اس معاملے سے خاص دلچسپی ہے۔ شاید میں کچھ کام آسکوں۔ یہ بچی کون ہے؟ اس کی ماں کون تھی؟ آپ کو معلوم ہے؟"

"کچھ پردیسی سی لگتی تھی۔ یہیں نیچے ہمارے ساتھ کے حصے میں رہتی تھی۔ اتنی بیمار تھی کہ بس۔ کچھ ہی دن میں تپ‌دق کے مارے دنیا سے سدھار گئی۔"

"تو مطلب غریب رہی ہو اگر وہ تہہ خانے کے ایک کمرے میں کرایہ‌دار تھی؟"

"غریب بھی کیسی غریب۔ دل چھلنی ہو گیا۔ ہمیں خود روٹی کے ٹوٹے ہیں۔ لیکن پھر بھی پانچ مہینے میں اس پر ہمارے چھ روبل قرض چڑھ گئے۔ مری تو کفن دفن بھی ہم نے کیا۔ میرے شوہر نے ہی تو تابوت بنایا تھا۔"

"مگر بینووا تو کہتی تھی کہ کفن دفن کا انتظام اس نے کیا تھا۔"

"وہ کیا کرتی کفن دفن!"

"اس کا خاندانی نام کیا تھا؟"

"میں ادا نہیں کر سکتی بھائی، ذرا کہنا مشکل ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ جرمن نام ہوگا۔"

"اسمتھ؟"

"نہیں، یہ تو نہیں تھا۔ اور بعد میں آننا تریفونوونا نے اس لاوارث بچی کو لے لیا، بقول اپنے، سرپرستی میں دیکھ بھال کے لئے لے لیا۔ مگر یہ کچھ ٹھیک نہ رہا۔"

"ممکن ہے کسی خاص غرض سے اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو؟"

"ہاں، اس کے رنگ ڈھنگ تو اچھے نہیں ہیں"، وہ عورت ایسے بولی جیسے کچھ سوچ میں پڑ گئی ہو کہ منہ سے کہے یا نہ کہے۔ "مگر ہمیں کیا، ہم باہر کے لوگ..."

"بس بہتر ہے کہ ذرا زبان کو قابو میں رکھو"، پشت پر سے ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گھریلو چوغہ پہنے اور اس پر سے بھاری کوٹ ڈاٹے نکلا۔ دیکھنے میں دستکار لگتا تھا، اس عورت کا شوہر تھا۔

"بھائی صاحب، آپ سے اسے بات چیت کرنے کی کیا ضرورت بھلا۔ اس معاملے سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں"، وہ میری طرف کچھ اکتائے ہوئے انداز میں دیکھ کر بولا۔ "جا، ری، گھر میں جا۔ معاف کیجئے گا۔ خدا حافظ، جناب! ہم تو تابوت‌ساز ہیں۔ اگر اس لائن میں آپ کی کوئی خدمت کر سکیں تو خوشی سے حاضر ہیں... لیکن دیکھئے، اس کے علاوہ ہمارا آپ کا کیا لینا دینا؟"

میں وہاں سے اپنے خیال میں غرق اور نہایت پیچ و تاب کھاتا چل دیا۔ مجھ سے کچھ کرتے تو بن نہیں پڑی لیکن اس طرح چل دینا بھی طبیعت پر سخت گراں گزرا۔ اس تابوت‌ساز کی بیوی کی زبان سے جو کچھ تھوڑا بہت پتہ لگا اس نے اور دکھ پہنچایا۔ اس تمام قصے کی تہہ میں کوئی بری بات ضرور تھی۔ مجھے آپ ہی آپ ایسا محسوس ہونے لگا۔

میں سر نیچے جھکائے اپنی ادھیڑبن میں لگا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں کسی نے تیز آواز میں میرا خاندانی نام لے کر پکارا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص میرے سامنے کھڑا ہے، نشے میں بالکل دھت اور ڈگمگانے سے خود کو سنبھالے ہوئے۔ کپڑے اندر سے صاف ستھرے لیکن اوپر ملا دلا اوورکوٹ اور چکٹی میل کھائی ٹوپی منڈھے۔ صورت دیکھنے سے بہت جانی پہچانی لگتی تھی۔ میں نے اور قریب سے دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری اور چھیڑخانی کے طور پر مسکرا دیا۔

"پہچانتے بھی نہیں ہو!"

پانچواں باب

"ارے یہ تو تم ہو، مسلوبویف!" میں پکارا۔ فوراً میں نے پہچان لیا کہ یہ تو میرا اسکول کا پرانا ساتھی ہے۔ ضلع کے مڈل اسکول تک اس کا میرا ساتھ تھا۔ "ارے، واہ، کیا ملاقات ہوئی ہے!"

"ہاں، خوب ملاقات ہوئی۔ کوئی چھ برس تو ہو گئے ہوں گے ملے ہوئے۔ مطلب ملاقات تو ہوئی تھی۔ مگر حضوروالا، عالی جناب تو نظر بھی ڈالنے کو تیار نہ تھے۔ پتہ نہیں جناب کہیں کے جنرل ہو گئے، بڑی کوئی ادبی شخصیت ہو گئے، کیا ہو گیا،" طنز کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

"اچھا تو یار مسلوبویف، بکواس شروع کر دی تو نے،" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "اول تو بات یہ ہے کہ جنرل چاہے وہ ادبی ہی کیوں نہ ہو جائے، دیکھنے میں ایسا نہیں ہوتا ہے جیسے میں۔ اور دوسرے یہ بتا دوں کہ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ سڑک پر تم دو تین بار نظر آئے مگر تم ہی، میرے خیال میں کترا گئے۔ اور میں بھلا کسی کے پاس کیوں جاؤں اگر میں سمجھوں کہ وہ مجھ سے بچ کر نکلنا چاہتا ہے۔ اور جانتے ہو میں کیا سوچتا ہوں؟ اگر کہیں تو اس وقت پیئے ہوئے نہ ہوتا تو اس وقت بھی مجھے پکارتا نہیں۔ بتا سچ کہا کہ نہیں؟ اچھا بول، کیا حال ہے تیرا؟ یار، مجھے بہت بس بہت ہی خوشی ہو رہی ہے کہ تجھ سے ملاقات ہو گئی۔"

"سچ کہنا — تمھاری آبرو کو بٹہ تو نہیں لگے گا اس بات سے کہ اپنا... اپنا ایسا حلیہ ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ یار تجھ سے کیا تکلف — مجھے تو ہمیشہ وہ یاد آتا ہے کہ وانیا، تو کیسا شریف چھوکرا تھا۔ یاد ہے تجھے کہ ایک دفعہ میری وجہ سے تیری مرمت ہو گئی تھی؟ تو بالکل زبان بند کئے رہا اور میرا نام نہیں بتایا اور میں تھا کہ تیرا احسان ماننے کے بجائے بعد میں ہفتے بھر تک تجھے چھیڑتا اور مذاق اڑاتا رہا۔ یار تو نے بڑا ہی شریف دل پایا ہے! تجھ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی، خوش رہو، میرے اچھے دوست، خوش رہو!" (ہم نے ایک دوسرے کو پیار کیا۔) "یار کتنے سال سے میں زندگی کو خود ہی گھسیٹ رہا ہوں — صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔ پرانا زمانہ دل سے بھولتا نہیں۔ بھلایا نہیں جاتا! اچھا یہ تو بتا، کر کیا رہا ہے تو آجکل؟"

"میں، ارے میں کیا، بس میں بھی زندگی کو خود ہی گھسیٹ رہا ہوں۔"

اس نے مجھے دیر تک دیکھا ایسے طاقتور جذبے کے ساتھ

جو عام طور سے شراب کے ہاتھوں بےطاقت آدمی میں پایا جاتا ہے۔ اتنا کہہ دوں کہ وہ نشے کے بغیر بھی نہایت ہی نیک‌دل انسان تھا۔

"نہیں، نہیں، وانیا، تو ایسا آدمی نہیں ہے۔ میں بھلا کیا،" اس نے آخر ایک درد بھرے لہجے میں کہا۔ "یار، میں پڑھ چکا ہوں۔ میں نے پڑھا ہے وانیا، پڑھی تمھاری کتاب!.. اچھا، سن تو، آ، دل کھول کے باتیں کریں۔ تجھے کیا جلدی ہے؟"

"ہاں، جلدی تو ہے۔ تیرے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ ایک معاملے میں بری طرح الجھا ہوا ہوں۔ اچھا تو یہ بتا کہ تیرا بسیرا کہاں ہے؟"

"بتاؤں گا۔ مگر یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ بتاؤں کیا رہے گا؟"

"ہاں، کیا؟"

"یہ رہا وہ، دیکھتا ہے؟" اور اس نے وہاں سے دس قدم پر ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا "دیکھتا ہے، یہ مٹھائی والے کی دکان بھی ہے اور رستوران بھی یعنی یوں کہہ لو کہ کھانا وغیرہ ملتا ہے۔ مگر جگہ اچھی ہے یہ۔ میرے خیال میں تو نہایت معقول جگہ ہے۔ اور پھر وادکا کی تو بس پوچھو مت! سیدھی کیئف شہر سے پیدل چل کے آتی ہے برخوردار۔ پی چکا ہوں کئی بار۔ مجھے خوب معلوم ہے۔ یہ لوگ گھٹیا مال دے کر نہیں ٹال سکتے۔ فلپ فلپیچ کو خوب پہچانتے ہیں — یہ خاکسار ہے فلپ فلپیچ۔ کیا بات؟ منہ کیوں بناتا ہے؟ خیر، ذرا مجھے بات پوری کر لینے دے۔ اب سوا گیارہ بج رہے ہیں — ابھی ابھی میں نے دیکھا ہے۔ تو جب بارہ بجنے میں پچیس منٹ رہ جائیں گے، ٹھیک اس وقت میں تجھے چھوڑ دوں گا۔ بس اتنی دیر کو ذرا ہونٹ تر کر لیں۔ صرف بیس منٹ کی بات ہے۔ پرانے دوست کے لئے بیس منٹ کی کیا حقیقت! چلے گا؟"

"اگر صرف بیس منٹ کی بات ہے تو خیر، ٹھیک ہے۔ کیونکہ میرے پیارے، قسم کھا کے کہتا ہوں، کام ہے مجھے..."

"چلے گا، سب چلے گا۔ ہاں تو بات کہوں تجھ سے۔ اول کے دو لفظ کہہ دوں — آج تیری صورت بگڑی ہوئی ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تیرے ساتھ۔ سچ بتا!"

"ہاں، ہے تو۔"

''تو میں ٹھیک ہی سمجھا۔ یار، میں اب قیافہ شناسی کے چکر میں پڑ گیا۔ خیر، یوں بھی جی بہلتا ہے۔ اچھا تو اب چلو، باتیں کریں۔ اس بیس منٹ میں پہلے تو میں اڈمرل چائنسکی کے بارے میں ذرا غور کرنے کا وقت نکالوں گا*، پھر ذرا برج کی شراب کا ایک گلاس انڈیلا جائے گا، پھر ایک روح افزا پیالہ ہو جائے گا اور تیسرا گلاس اورینج کا، پھر Parfait Amour اور اس کے بعد کچھ نہ کچھ اور زیر غور آئے گا۔ پیسے رہتا ہوں یار۔ صرف تہوار کے دن عبادت سے پہلے تک ہوش میں ہوتا ہوں۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ تم نہ چاہو تو مت پینا۔ صرف تمہارا موجود رہنا ضروری ہے۔ اور اگر پی لوگے تو اپنی عالی‌ظرفی اور شرافت کا ثبوت دوگے۔ چلو، چلیں، ذرا گپ رہےگی اور اس کے بعد پھر دس سال کی جدائی۔ یار، وانیا، معاف کیجئو، میں تیری جوڑ کا نہیں ہوں!،،

''...اچھا، اچھا، بس، زیادہ بکواس نہ کر۔ جلدی چلنا چاہئے۔ یہ بیس منٹ تیرے رہے، مگر ہاں، اس کے بعد مجھے چھٹی۔،،

رستوران میں پہنچنے کے لئے ہمیں لکڑی کے ایک زینے پر چڑھنا پڑا۔ یہ ایک دو منزلہ زینہ تھا اور سڑک سے سیدھا عمارت کی دوسری منزل پر پہنچتا تھا۔ زینے پر اتفاق سے دو صاحبوں سے ہماری مٹھ بھیڑ ہوئی۔ یہ دونوں بہت بری طرح پیے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی یہ دونوں جھومتے جھامتے ایک طرف کو ہو گئے۔

ان میں سے ایک تو بالکل نوعمر لڑکا تھا صورت سے عنفوان شباب لیکن چہرے بشرے سے حماقت کی پوٹ۔ مونچھوں کی جگہ صرف ہلکا سا سبزہ آغاز، اور سبزۂ خط غائب۔ چھیلوں کے سے کپڑے پہنے، مگر دیکھنے میں ایسے کہ ہنسی آئے — جیسے مانگے کے ہوں۔ انگلیوں پر نہایت قیمتی انگوٹھیاں چڑھائے، ٹائی میں بیش قیمت پن لگائے اور بال انتہا درجے کے احمقانہ بنا رکھے تھے، پتہ نہیں کس طرح کا سنگار کیا گیا تھا۔ وہ برابر مسکرائے اور کھی کھی کئے جاتا تھا۔ اس کے ساتھ کا آدمی کوئی پچاس برس سے اوپر کا تھا۔ موٹا

* مذاق میں — مطلب یہ کہ چائے پیوں گا۔ (ایڈیٹر)

تازہ، توندیل، لباس میں بے پروائی، مگر ٹائی میں بڑا پن وہاں بھی موجود، چہرہ پھولا ہوا، نشے میں دھت، چیچک‌زدہ۔ بھلکی جیسی ناک پر چشمہ۔ اور گنجی چندیا کے گرد جگہ جگہ اڑے ہوئے بالوں کی جھالر۔ اس کے چہرے کی کیفیت بتاتی تھی کہ بدطینت بھی ہے اور عیاش بھی۔ اس کی کینہ‌ور اور بےاعتماد آنکھوں کو چربی نے ڈھک رکھا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ چلمن میں سے جھانک رہی ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ مسلوبیف سے ان دونوں کی ملاقات تھی۔ لیکن توندوالے کی نظر جو ہم پر پڑی تو اس نے صورت دیکھتے ہی لمحہ بھر کو برا سا منہ بنایا اور نوجوان ایسا پگھلا کہ اس کے چہرے پر ایک قسم کی خوشامدانہ میٹھی مسکراہٹ آئی۔ بلکہ اس نے تعظیماً ٹوپی بھی اتاری۔ وہ ٹوپی پہنے تھا۔

''معاف کیجئے گا، فلپ فلیپچ،، چکنے چپڑے انداز سے دیکھتے ہوئے وہ نوجوان بدبدایا۔

''کیوں کیا ہوا؟،،

''جی، معاف کیجئے گا۔ وہ میں...،، (اس نے گلے پر چٹکی ماری۔ مطلب یہ کہ پی گیا ہوں۔) ''میتروشکا بیٹھا ہے وہاں۔ بڑا ہی پاجی ہے وہ، فلپ فلیپچ...،،

''مگر بات کیا ہے؟،،

''جی ہاں، وہ دیکھئے نا کہ وہ... اس کے ساتھ،، (اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا) ''پچھلے ہفتے... میتروشکا کی بدولت اس کی تھوتھنی پر کالک لگ چکی ہے۔ کھی کھی...،،

اس کے ساتھی نے برا مان کر کہنی ماری۔

''ہمارا ساتھ کیوں نہ رہے، فلپ فلیپچ؟ ہم تو چل کے ایک آدھی درجن شمپین ہی ڈالتے، دیوسو* کے ہاں، ہے نا۔ پھر ہو جائے حکم!،،

''نہیں، بھئی، اس وقت نہیں،، مسلوبیف نے جواب دیا۔ ''ابھی ذرا کام ہے۔،،

* دیوسو — پیٹرسبرگ میں ایک مہنگے رستوران کا مالک۔ (ایڈیٹر)

"کبھی کبھی، مجھے بھی ذرا سا کام ہے... وہ آپ سے...،"
اس کے ساتھ والے نے پھر کہنی کا ٹھوکا مارا۔

"اچھا تو پھر سہی، پھر سہی۔"

مسلوبویف بظاہر ان لوگوں سے آنکھ چار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خیر، جیسے ہی ہم نے پہلے کمرے میں قدم رکھا، دیکھتے کیا ہیں کہ پورے کمرے کی لمبائی میں ایک صاف ستھری کاؤنٹر لگی ہے، اس پر بڑی تعداد میں شراب کے ساتھ گزک کی پلیٹیں دھری ہیں — کیک، پھلیاں اور رنگ برنگی شرابوں سے بھری شیشے کی صراحیاں — مسلوبویف جلدی سے مجھے ایک کونے میں لے گیا اور بولا:

"جانتے ہو اس لڑکے کو، یہ سیزوبریوخوف کا بیٹا ہے، وہ جو اناج کا مشہور بیوپاری تھا۔ باپ کے مرنے پر اسے کوئی پانچ لاکھ روبل کی رقم ہاتھ آئی تھی اور اب لٹا رہا ہے۔ پیرس گیا تھا وہاں دونوں ہاتھوں سے خوب دولت لٹائی۔ دامن جھاڑ چکا ہوگا وہاں کہ اتنے میں چچا مر گئے اور ان کا ورثہ بھی اسی کو ملا۔ وہ پیرس سے لوٹ آیا۔ اب جو بچا ہے اسے یہاں اڑائے گا۔ کوئی سال بھر میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ بالکل الو کی دم فاختہ ہے — اعلی درجے کے ہوٹلوں میں، تاڑی خانوں اور شراب‌خانوں میں، ایکٹریسوں میں اڑا پھرتا ہے۔ اب **اس** نے خاص شاہی رسالے میں بھرتی کی درخواست دے رکھی ہے۔ دوسرا جو تھا، عمر رسیدہ آدمی، وہ ہے ارخی‌پوف، یہ صاحب، پتہ نہیں کچھ لین دین کرتے ہیں یا ایجنٹی میں ہیں، پہلے لگان پر زمین لے کر کاشت بھی کرایا کرتا تھا۔ ذلیل، کمینہ، بگڑا ہوا، آجکل سیزوبریوخوف کا یار غار بنا پھرتا ہے۔ بیہوداہ بھی ہے اور فالسٹاف* بھی — ایک ساتھ دونوں۔ دو بار تو دیوالیہ ہونے کا اعلان کر چکا ہے۔ نفرت‌انگیز حد تک بگڑے ہوئے کیرکٹر کا آدمی ہے۔ طرح طرح کے عیب اس میں بھرے ہیں۔ اس کی لائن میں مجھے ایک مجرمانہ حرکت کا پتہ ہے جس سے ان صاحب کا خاص واسطہ تھا۔ مگر اس سے یہ بچ نکلا۔ ایک وجہ سے مجھے بہت خوشی ہوئی اس وقت کہ

* شیکسپیر کے ڈراموں کا مشہور کردار، شوقین اور شیخی‌باز۔ (ایڈیٹر)

اس سے یہاں اس جگہ ملاقات ہوئی۔ میں اس کی تلاش میں ہی تھا... ارخی‌پوف ضرور اس نوجوان کو چاٹ جانے کی فکر میں ہے۔ بہت سی ایسی اندھیرے اجالے کی جگہیں اسے معلوم ہیں جس کی بنا پر اس قسم کے نوجوانوں میں قدر ہوتی ہے۔ بار، بہت زمانے سے اس آدمی پر میں دانت تیز کئے ہوئے ہوں۔ اور میتروشکا نے بھی اس پر دانت تیز کر رکھے ہیں، وہ کڑیل جوان، جو قیمتی اوورکوٹ میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہے، خانہ بدوشوں کی سی صورت کا۔ گھوڑوں کا لین دین کرتا ہے۔ آس پاس کے سارے سواروں میں مشہور ہے۔ میں تجھے بتاتا ہوں، یہ ایسا چلبلا اور چنٹ آدمی ہے کہ بس۔ آپ کے سامنے جعلی نوٹ بنائے گا اور آپ اپنی جیب سے اسے بھنا دیں گے۔ اوورکوٹ پہنتا ہے، بالکل اصلی مخمل کا۔ سلاویانوفیل* سے کس قدر ملتا ہے (میرے خیال میں یہ تشبیہ اس پر ٹھیک بیٹھتی ہے) لیکن ذرا اسے اچھا سا کوٹ ووٹ پہنا دیجئے، اور ٹھیک ٹھاک کرکے کسی انگریزی کلب میں لے جائیے اور کہہ دیجئے کہ جناب بہت بڑے تعلقہ‌دار ہیں، رئیس‌زادے برابانوف صاحب، وہاں دو گھنٹے تک سب اسے بڑا تعلقہ‌دار رئیس‌زادہ ہی سمجھے جائیں گے — وہ وہاں وہسٹ کھیلتا رہے گا، رئیس زادوں کی سی آن بان رکھے گا اور کسی کو جھوٹ موٹ بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس آدمی کا انجام برا ہونے والا ہے۔ تو یہ ہیں جناب میتروشکا۔ اس توند والے سے آجکل بہت پرخاش ہے اس کو کیونکہ سیزوبریوخوف سے پہلے اسی کی گاڑھی چھنتی تھی مگر ابھی وہ ٹھیک سے اس کی حجامت بھی نہ کرنے پایا تھا کہ توندیل اس لڑکے کو لے بھاگا۔ اگر وہ ابھی یہاں ہوٹل میں مل گئے ہوتے تو سچ کہتا ہوں، کچھ نہ کچھ ہو کر رہتا۔ یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ وہ کیا ہوتا کیونکہ میتروشکا ہی تھا، کوئی اور نہیں، جس نے مجھے خبر دی کہ ارخی‌پوف اور

* سلاویانوفیل — ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء کے زمانے میں روس کے ایک خاص سماجی نظریہ رکھنے والے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ روس ایک خاص تاریخی راہ سے آگے بڑھے گا جس میں اس کے سماجی نظام اور سلاف انداز (آرتھوڈکس چرچ) کو دخل ہے۔ یہ لوگ یورپی لباس کے مقابلے میں قومی لباس کو ترجیح دیتے تھے۔ (ایڈیٹر)

میزوبریوخوف یہاں موجود ہوں گے اور کسی گندے معاملے کے پھیر میں ادھر کا چکر کاٹتے پھرتے ہوں گے۔ میں بھی اس فکر میں ہوں کہ ارخی پوف اور میتروشکا کی باھمی عداوت سے فائدہ اٹھالوں کیونکہ میرے بھی دل میں ہے کچھ۔ اور اصل بات یہ ہے کہ میں یہاں آیا بھی تھا اسی فکر میں۔ میں نہیں چاہتا کہ میتروشکا کو اس کی بھنک پڑے اور تم بھی ادھر اس کی طرف مت دیکھے جاؤ۔ جب ہم یہاں سے چلنے لگیں گے تو وہ میرے خیال میں خود ہی دوڑا آئے گا اور جو میں جاننا چاہتا ہوں بتا جائے گا... اچھا چلیں، وانیا، وہ ہے، نا وہ ادھر کا کمرہ، اس میں چلتے ہیں۔ اچھا تو، استیپان!،، اس نے ایک بیرے کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ''سمجھے کیا چاہئے؟،،

''سمجھا صاف!،،

''تو پھر لاتے ہو؟،،

''لاتا ہوں صاب!،،

''اچھا تو لے آؤ۔ آؤ وانیا، بیٹھیں۔ تو مجھے یار ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟ دیکھتا ہوں کہ تو مجھے تکے جا رہا ہے۔ کیا کوئی تعجب کی بات ہے؟ تعجب نہ کر۔ آدمی کے ساتھ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہو جاتا ہے جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو۔ اور خاص طور سے اس وقت جب... ہاں اس وقت بھی جب میں اور تو بیٹھے ہوئے کارنیلی نیپوٹ* رٹا کرتے تھے۔ ہاں تو وانیا دوست، ایک بات مان جا — چاہے مسلوبویف سیدھے راستے سے پھر گیا ہو، لیکن اس کا دل نہیں پھرا — وہ راستی پر ہے۔ صرف حالات ہیں جو بدل گئے ہیں۔ میں اچھا آدمی نہ سہی، مگر دوسروں سے برا بھی نہیں ہوں۔ کیا سے کیا ہو جاتا ہے — ڈاکٹر بننے چلا، روسی زبان کے ادب کا استاد بننے کی تیاری کی، گوگول پر ایک مضمون لکھ مارا۔ پھر سوچا، سونے کی کان کھود دوں گا، پھر شادی کی تیاری کر ڈالی — جیتی جاگتی

---

* کارنیلی نیپوٹ (تقریباً سو سال قبل مسیح پیدا ہوا۔ ۳۷ سال قبل مسیح انتقال کیا) — قدیم روم کا مورخ اور اہل قلم، جس کی تصانیف کے مطابق روس کے اعلی اسکولوں میں لاطینی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ (ایڈیٹر)

روح اس روح میں مری جاتی ہے کہ جھولا جھولے۔ وہ راضی بھی ہو گئی تھی، مگر اپنی تنگ دستی کا یہ حال کہ بلی کے لئے چھیچھڑے تک نہ جڑیں۔ میں شادی کے موقع کے لئے کسی سے اچھے مضبوط سے جوتے تک مانگ لینے کو آمادہ ہو گیا تھا، کیونکہ تم جانو، میرے جوتوں کے تلے میں تو ڈیڑھ سال سے بھمبق کھلے تھے... مگر خیر، شادی ٹل گئی۔ لڑکی نے تو ایک ٹیچر سے بیاہ کر لیا، رہ گئے ہم، سو ہم نے دفتر میں نوکری کر لی — کسی فرم کا دفتر نہیں بلکہ یوں ہی معمولی سا دفتر۔ پھر ایک بار دھن بدل گئی، سال تہہ ہوتے چلے گئے۔ اب آجکل میں نوکری نہیں کرتا پھر بھی روپیہ آسانی سے بنا لیتا ہوں — جھوٹ سچ رشوت مارتا ہوں اور پھر بھی سچ کا دم بھرتا ہوں۔ بھاگنے کے آگے، مارنے کے پیچھے۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں: میں جانتا ہوں مثال کے طور پر کہ ایک اکیلا آدمی میدان نہیں مارتا ہے۔ مجھے تو اپنے کام سے کام ہے۔ میرا کام زیادہ‌تر چھپے چوری کے معاملوں میں چلتا ہے۔ سمجھے؟،،

''کہیں تم جاسوسی یا مخبری وغیرہ تو نہیں کرتے؟،،

''نہیں، بالکل مخبری تو نہیں خیر، مگر ہاں جس طرح کے کاموں میں لگا رہتا ہوں وہ کچھ تو پیشہ‌ورانہ ہوتے ہیں اور کچھ ایسے جو میں اپنے طور پر سنبھال لیتا ہوں۔ کچھ یوں ہے، وانیا — میں وادکا ضرور پیتا ہوں۔ لیکن ہوش کبھی نہیں کھوتا اور اپنا انجام جانتا ہوں۔ میرا وقت گزر چکا ہے۔ اب کالے گھوڑے کو مل مل کے کوئی سفید نہیں کر سکتا۔ ایک بات تجھ سے کہتا ہوں — اگر میرے اندر کا انسان جواب دے چکا ہوتا تو آج میں تیرے پاس نہ پھٹکتا۔ تو ٹھیک کہتا ہے — پہلے بھی کئی بار تجھے دیکھ چکا ہوں، ایک نہیں کئی بار، جی بھی چاہا کہ تجھ سے ملوں مگر ہمت نہیں پڑی۔ بس میں ٹالتا ہی رہا۔ میں تیرے قابل نہیں ہوں۔ اور تو نے سچ کہا وانیا، میں تیرے پاس صرف اس لئے آ پہنچا کہ پیے ہوئے تھا۔ ہے تو یہ خیر، بڑی واہیات سی چیز، مگر اب اپنے بارے میں ختم کئے دیتے ہیں۔ اچھا ہو کہ کچھ تیرے بارے میں بات ہو جائے۔ ہاں، تو جان‌من، میں نے پڑھا وہ۔ اور شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ دوست، میں تمھارے پہلوٹی کے بچے کا ذکر کر رہا ہوں۔

ہاں جب پڑھا تو میرے بھائی، مجھے ایسا لگا کہ بس شریف آدمی بن جاؤں گا، ذرا سی کسر رہ گئی۔ پھر ذرا میں نے سوچا تو نتیجہ نکلا کہ اچھا ہے، نامعقول آدمی ہی رہوں۔ تو وہی ہوں...،،

اس نے اور بہت سی باتیں کیں۔ اس پر نشہ برابر چڑھتا چلا گیا اور وہ برابر پگھلتا نرم پڑتا چلا گیا، بس قریب تھا کہ رو پڑے۔ مسلوبویف سدا کا بھلا آدمی تھا، لیکن تھا بڑا ہوشیار، اس کی ہوشیاری عمر سے آگے آگے چلتی تھی۔ اسکول کے زمانے سے ہی وہ نہایت تیز، چالاک، جوڑ توڑ کرنے والا، اور بڑوں کے کان کترنے والا بن چکا تھا مگر دل کا برا آدمی نہیں تھا پھر بھی بالکل تباہی کے راستے پر پڑ گیا تھا۔ روسیوں میں ایسے آدمی بہت ملیں گے، ان میں اکثر بڑی بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں مگر سب ایک دوسرے میں الجھی ہوئی۔ اور اس پر مزید یہ کہ خوب اچھی طرح سے جان بوجھ کر وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے بعض جانی پہچانی حالتوں میں ضمیر کے خلاف عمل کرتے ہیں اور اس کے انجام میں جو بربادی لکھی ہے وہ اس کا شکار ہی نہیں ہوتے بلکہ جو پہلے سے جان لیتے ہیں کہ انجام میں بربادی ہونی ہے۔ مسلوبویف کو ہی لے لیجئے، وہ خود کو شراب میں غرق کر رہا تھا۔

''اچھا، دوست، ایک بات اور کہوں،، اس نے بات جاری رکھی۔ ''میں نے سنا کہ شروع شروع میں تیری شہرت بہت زور سے ہوئی۔ پھر میں نے تیرے بارے میں کئی تنقیدیں پڑھیں۔ (بھئی، واقعی میں نے پڑھی تھیں، تو سمجھتا ہے کہ میں بالکل کچھ پڑھتا ہی نہیں۔) پھر میں نے دیکھا کہ تو ٹوٹے پھٹے جوتوں میں چلا جا رہا ہے اور کیچڑ میں پہننے کو تیرے پاس جوتاپوش تک نہیں ہے۔ مڑاتڑا سا ہیٹ ہے۔ اس سے میں نے اپنے طور پر کچھ قیاس کر لیا کہ تو ادھر ادھر سے تھوڑا بہت کما لیتا ہوگا اخباروں میں لکھ لکھا کر؟،،

''ہاں، یہ تو ہے، مسلوبویف۔،،

''مطلب یہ کہ ادبی سرپھروں میں نام لکھا لیا تو نے؟،،

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔،،

''اچھا، تو میں بتاؤں تجھے، سن — پینا زیادہ اچھا ہے! مجھے دیکھ، پی لیتا ہوں اور اس کے بعد صوفے پر ٹانگیں پسار دیتا ہوں

(میرے پاس عالی‌شان صوفہ ہے اسپرنگ‌دار)۔ پھر اپنے جی میں سوچ لیتا ہوں کہ لو، جی، ہم بھی وہ ہیں، کیا کہ کوئی ہومر* یا کوئی دانتے** یا سمجھو فریڈرک باربروسا***۔ اپنے آپ کو آدمی جو چاہے فرض کرلے۔ کیا ہے۔ مگر تو اپنے آپ کو نہ دانتے فرض کر سکتا ہے نہ فریڈرک باربروسا۔ اول تو اس لئے کہ تو اپنی جگہ پر خود کچھ بننا چاہتا ہے۔ اور دوسرے اس وجہ سے کہ تیرے لئے ساری خواہشیں منع ہیں کیونکہ ٹھہرا ادبی سرپھرا۔ میرے لئے خواب خیال کا عالم ہے اور تیرے لئے حقیقت کا۔ میری بات سن، مجھ سے صاف صاف دوٹوک کہہ دے، بالکل سگے بھائی کی طرح بتا (ورنہ دس سال تک مجھے تجھ سے شکایت رہے گی اور میں اسے اپنی توہین سمجھے جاؤں گا) تجھے روپے کی ضرورت ہے کیا؟ میرے پاس ہے کچھ۔ اب منہ مت بنا۔ روپیہ لے لے، پبلشر کی رقم ادا کر دے، اپنی گردن کا بوجھ اتار ڈال۔ اور جب تیرے پاس سال بھر کا اطمینان ہو جائے تو اپنے دل‌پسند خیال پر جم کر بیٹھ جا، نہایت شاندار کتاب لکھ ڈال۔ بتا، کیسی کہی؟،،

''سن دوست مسلوبویف، ویسے مجھے تیری برادرانہ پیش‌کش کی قدر ہے۔ مگر اس وقت میں کچھ بتا نہیں سکتا۔ وجہ کیا؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ حالات ہوتے ہیں آدمی کے۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ بعد میں تجھے سگے بھائی کی طرح سب کچھ بتا دوں گا ذرا ذرا۔ تیری پیش‌کش کا شکریہ — وعدہ رہا کہ میں تیرے ہاں آؤں گا اور اکثر آتا رہوں گا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تو نے مجھ سے کھل کر بات کی۔ اور میں نے بھی اب

---

* ہومر — قدیم یونانی شاعر جسے قبول عام اور شہرۂ دوام حاصل ہوا۔ ''ایلیڈ،، اور ''اوڈیسی،، جیسے رزمیہ شاہکاروں کا مصنف۔ (ایڈیٹر)

** دانتے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) — زبردست اطالوی شاعر ''ڈوائن کامیڈی،، (طربیہ خداوندی) کا شہرۂ آفاق مصنف۔ (ایڈیٹر)

*** فریڈرک باربروسا — جرمن شہنشاہ فریڈرک اول باربروسا (۱۱۵۲ء تا ۱۱۹۰ء)۔ (ایڈیٹر)

طے کرلیا ہے کہ تجھ سے مشورہ کروں گا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ تیرا ہاتھ ایسے معاملات میں بہت صاف لگتا ہے۔''

میں نے اسی وقت سسلوبویف سے اسمتھ کا اور اس کی نواسی کا سارا قصہ اس مٹھائی فروش کی دکان سے لے کر آخر تک کہہ ڈالا۔ عجیب بات! جب میں اس سے یہ واقعہ بیان کر رہا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں سے بھانپ لیا کہ اس قصے کا کچھ نہ کچھ اسے پتہ ہے۔ میں نے پوچھا اس کے بارے میں تو وہ بولا:

''نہیں، بالکل تو نہیں۔ البتہ اسمتھ کے بارے میں کچھ میرے کان میں پڑا ضرور تھا۔ وہ جو کوئی بوڑھا آدمی دکان کے اندر مر گیا تھا۔ مگر ہاں بہنووا بیگم کے بارے میں مجھے تھوڑا بہت ضرور معلوم ہے۔ ابھی دو مہینے کی بات ہے کہ میں نے ان بیگم صاحبہ سے کچھ رقم اینٹھی ہے۔ Je prends mon bien, oú je le trouve * اور اس معاملے میں سولیر سے میں ذرا ملتا ہوں۔ اگرچہ تب تو میں نے اس سے سو روبل اگلوا لئے تھے لیکن دل میں اسی وقت قسم کھا لی تھی کہ سو نہیں بلکہ پانچ سو روبل وصولوں گا۔ بڑی منحوس عورت ہے! ناجائز کاموں سے واسطہ ہے اس کا۔ خیر، یہ بھی کچھ نہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ کہیں تو یہ مت سمجھیو کہ میں کوئی ڈان کوئزوٹ** ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں خوب اچھی طرح اس پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔ اور ابھی آدھ گھنٹہ پہلے جو یہ صاحب‌زادے سیزوبریوخوف ملے تو میں بہت خوش ہوا۔ سیزوبریوخوف جان بوجھ کر یہاں لایا گیا تھا اور وہی توندیل اسے لایا تھا۔ اور چونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس توندیل کا خاص کاروبار کیا ہے اس لئے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ... میں یہ بات چھوڑوں گا نہیں۔ ہاتھ ڈالوں گا اس پر! مجھے بڑی خوشی ہے کہ تمہاری زبانی میں نے اس بچی کا قصہ سنا، اب مجھے ایک اور شوشہ ہاتھ آ گیا۔ بھائی میرے،

---

* سولیر کا پسندیدہ فرانسیسی مقولہ: ''میں وہیں سے اپنا حق وصول کرلیتا ہوں جہاں اسے پاتا ہوں''۔ (ایڈیٹر)

** ڈان کوئزوٹ ۔ ہسپانوی مصنف میگیل سیروانٹیس (۱۵۴۷ء تا ۱۶۱۶ء) کے ناول کا ہیرو ۔ انصاف کی خاطر جانثاری اور خلوص سے لڑنے والا ۔ (ایڈیٹر)

میں تو سب طرح کے پرائیویٹ دھندے اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ اور کیا بتاؤں، کیسے کیسے لوگوں سے میرا واسطہ رہتا ہے! ابھی کچھ دن پہلے ایک پرنس صاحب کے لئے میں نے کھوج نکالا۔ کیا معاملہ تھا وہ بھی۔ ان پرنس سے کسی کو اس بات کا گمان تک نہیں ہو سکتا۔ ہاں، سنتے ہو تو ایک اور کہانی سناؤں تمہیں ایک شادی‌شدہ عورت کی؟ تم آؤ اور مجھ سے ملو۔ میرے دوست، ایسے ایسے پلاٹ تمہارے آگے دھر دوں گا کہ تم لکھ دو تو لوگوں کو یقین نہ آئے کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے...''

''بھلا ان پرنس صاحب کا خاندانی نام کیا تھا؟'' میرا ماتھا ٹھنکا تو میں نے پوچھا۔

''تجھے اس سے کیا لینا۔ خیر، تو نام تھا والکوفسکی۔''

''پیوتر؟''

''یہی، کیا تیری جان پہچان ہے؟''

''معمولی سی۔ اچھا تو سسلوبویف، میں ان حضرت کے بارے میں جاننے کے لئے تیرے ہاں آؤں گا، اور ایک بار نہیں، کئی بار''، میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''تو نے تو غضب کی کرید پیدا کر دی!''

''خیر، دیکھ لو۔ میرے یار، جتنی بار ہو سکے آتے رہو، میں خوب خوب قصے سنا سکتا ہوں مگر ایک حد میں رہ کر، سمجھے میری بات؟ نہیں تو میری آبرو بھی جاتی رہے گی اور ساکھ بھی بگڑ جائے گی۔ بس سارا قصہ یہی ہے لے دے کے۔''

''اچھی بات ہے، جہاں تک تمہاری ساکھ بنی رہے وہاں تک سہی۔''

مجھ میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی اور اس نے یہ تاڑ لیا۔

''اچھا، اس قصے کے بارے میں جو میں نے ابھی ابھی تجھ سے بیان کیا ہے تجھے کچھ پتہ ہو تو بتا، کچھ تو نے خیال دوڑایا کہ نہیں؟''

''تمہارا قصہ؟ اچھا ذرا دو منٹ کو ٹھیرو، میں پیسے ادا کر آؤں۔''

وہ کاؤنٹر کی طرف گیا اور وہاں جیسے اتفاق سے ہو گیا ہو اس جوان سے اس کی مٹھ بھیڑ ہو گئی جسے یوں بے‌تکلفی سے میتروشکا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سسلوبویف نے جتنا مجھے بتایا تھا اس سے کہیں زیادہ نزدیک سے

اسے جانتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو، یہ ظاہر تھا کہ وہ دونوں اس وقت پہلی بار نہیں ملے تھے۔ میتروشکا دیکھنے میں کچھ نرالی وضع کا آدمی لگتا تھا۔ بےآستین کی صدری اور لال ریشم کی قمیص میں، اس کا تیکھا اور کسی قدر دلکش ناک نقشہ، خاصا جوان چہرہ، سانولا رنگ، تیز اور جرأت‌مند آنکھیں — یہ سب مل کر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے والی اور تجسس پیدا کرنے والی کیفیت رکھتے تھے۔ اس نے جو رویہ اختیار کیا اس میں جرأت کا اعلان پایا جاتا تھا لیکن ساتھ ساتھ خود کو لئے دئے بھی تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ذرا کاروباری اور صرف کام سے کام والی بےنیازی دکھائے۔

"ہاں تو سنو، وانیا،" مسلوبویف نے اس کے پاس سے واپس آکر کہا "آج شام کو سات بجے میرے ہاں آ جاؤ، شاید میں کچھ تھوڑا بہت بتا سکوں۔ میں بذات خود تو خیر، کیا چیز ہوں جو کسی کام آسکوں۔ کبھی کسی زمانے میں کوئی حیثیت تھی، اب کیا، اب تو صرف شرابی رہ گیا ہوں اور معاملوں سے کوئی خاص واسطہ نہیں رہ گیا۔ البتہ پرانے تعلقات اب بھی باقی ہیں۔ ممکن ہے کسی بات کا اتہ پتہ نکال سکوں۔ مختلف طرح کے تیز لوگوں میں سونگھ کر کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بس یہی ہے اپنا دھندا۔ جب خالی وقت ہوتا ہے، یعنی یوں کہو، جب ہوش میں ہوتا ہوں تو کچھ آپ سے بھی کر لیتا ہوں، یہ صحیح ہے کہ دوستوں کی مدد سے... خیر، زیادہ‌تر کھوج لگانے کے دھندے ہوتے ہیں یاروں سے۔ مگر اس میں کیا رکھا ہے۔ بس بہت ہوا... اچھا، یہ لے میرا پتہ یہ رہا — شیستیلاوچنایا سڑک پر۔ مگر اس وقت یار، میں بہت پی چکا۔ ایک سونے کا گھونٹ اور اتاروں گا اور پھر سیدھا گھر کو۔ ذرا لیٹوں گا۔ آؤگے نا؟ میں تمھیں الیکساندرا سیمیونوونا سے ملاؤں گا۔ اور وقت رہا تو شاعری پر بات ہوگی۔"

"اچھا مگر — وہ، اس کے بارے میں؟"

"وہ بھی دیکھا جائے گا۔"

"اچھا تو میں آؤں گا، یقیناً آؤں گا۔"

چھٹا باب

آننا اندریئونا کو بہت دیر سے میرا انتظار تھا۔ نتاشا کے بھیجے ہوئے پرزے کے بارے میں جو میں نے ان سے کل ذکر کیا تھا، اس سے ان کا اضطراب اور پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ اور انہیں امید تھی کہ میں صبح ہوتے ہی ان کے ہاں پہنچوں گا۔ زیادہ سے زیادہ دس بجے تک تو ضرور ہی پہنچ جاؤں گا۔ مگر مجھے پہنچتے پہنچتے ایک بج گیا۔ اور اس وقت تک بیچاری ماں کا کلیجہ پک گیا تھا اور بےقراری کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ انہیں اس بات کی بھی بےچینی تھی کہ کل کی گفتگو سے ان میں جو نئی امیدیں پیدا ہوئی ہیں ان کے بارے میں مجھ سے بات کریں اور بڑے میاں نکولائی سرگیئچ کے بارے میں، جو اسی وقت سے بیمار پڑے تھے، اداس ہو گئے تھے اور ساتھ ساتھ بڑی بی کی جانب ان میں زیادہ نرمی اور دلجوئی آ گئی تھی۔ جیسے ہی میں نے اپنی صورت انہیں دکھائی تو اول تو بڑی بی نے سردمہری کا رویہ اختیار کیا اور چہرے پر ناراضی طاری کرلی۔ منہ تک نہیں کھولا اور بالکل روکھی بن گئیں۔ ایسے جیسے اب کہنے والی ہوں "آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اور کیا روزانہ ہی تم پر یہاں کا آنا فرض ہو گیا ہے؟" میرے اتنی دیر سے پہنچنے پر انہیں غصہ تھا۔ مگر مجھے جلدی پڑی تھی چنانچہ میں نے تکلف یا تاخیر کئے بغیر وہ سب واقعہ تفصیل سے انہیں سنا دیا جو کل رات نتاشا کے ہاں پیش آیا تھا۔ جیسے ہی میرے منہ سے نکلا کہ پرنس خود وہاں آئے تھے اور انہوں نے باقاعدہ رشتہ تجویز کیا تو بڑی بی کا تکلف اور رکھ رکھاؤ ایک دم غائب ہو گیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو میں بیان کر سکوں کہ آننا اندریئونا کس قدر خوش ہوئیں، وہ پھولی نہیں سماتی تھیں۔ فوراً انہوں نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، آنکھوں سے آنسو بہا دئے، شبیہ پاک کے سامنے سجدۂ شکر ادا کیا، مجھے گلے لگا لیا اور قریب تھا کہ دوڑتی ہوئی نکولائی سرگیئچ کے کمرے میں پہنچ جائیں اور ان سے اپنی خوشی کا ماجرا کہہ سنائیں۔

"سمجھتے ہو میرے بچے، سب انہی ذلتوں اور رسوائیوں کی وجہ سے ان کے دماغ پر برا اثر پڑا ہے، اور جیسے ہی انہیں

خبر ہوگی کہ نتاشا کی کافی عزت‌افزائی ہوئی ہے تو پلک جھپکتے میں سب بھول جائیں گے۔،،

بڑی مشکل سے میں نے انہیں روکا۔ اگرچہ یہ نیک بخت پچیس برس شوہر کے ساتھ رہی تھیں لیکن اس پر بھی وہ انہیں ٹھیک سے نہیں پہچانتی تھیں۔ انہیں غضب کی بےچینی لگی ہوئی تھی اس بات کی کہ فوراً میرے ساتھ نتاشا کے ہاں چل پڑیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ دیکھئے اول تو خود نکولائی سرگیئچ غالباً اس حرکت کو ناپسند کریں گے اور پھر یہ بھی ہے کہ آپ کا جانا بنے بنائے کھیل کو بگاڑ سکتا ہے۔ سخت مشکل سے ان کی سمجھ میں یہ بات آئی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے خواہ مخواہ مجھے کوئی ڈیڑھ گھنٹے روکے رکھا اور تمام وقت خود ہی بولتی رہیں۔

''اور بھلا کس سے بات کروں۔ سینے میں ایسی خوشی بھرے ہوئے میں چاردیواری میں بیٹھی رہوں؟،، انہوں نے کہا۔ آخر میں نے بمشکل انہیں راضی کیا کہ مجھے رخصت دیں، یاد دلایا کہ وہاں نتاشا میرے انتظار میں بیٹھی اکتا رہی ہوگی۔ جب میں چلا تو انہوں نے راستے میں میری سلامتی کے لئے کئی بار مجھ پر صلیب کا نشان بنایا، نتاشا کو خاص طور سے دعائیں بھیجیں اور جب میں نے کہا کہ اگر نتاشا کے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا ہوگا تو میں آج شام کو دوبارہ آپ کے ہاں نہ آؤں گا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ اس موقع پر میں نکولائی سرگیئیچ سے نہیں ملا۔ رات بھر ان کی آنکھ نہیں لگی تھی، درد سر کی شکایت کرتے رہے تھے، جسم کی تھرتھری کی تکلیف تھی۔ اور اب وہ مطالعہ کے کمرے میں سو رہے تھے۔

نتاشا کو بھی صبح سے میرا سخت انتظار تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ حسب معمول کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی، ہاتھ باندھے ہوئے، اور کسی گہری سوچ میں غرق۔ اب بھی جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے آگے تصویر پھر جاتی ہے کہ وہ ایک حقیر سے کمرے میں اکیلی ہے، خواب آلود ہے، اداس اور اجڑی اجڑی ہے، ہاتھ کمر کے اوپر باندھے راہ دیکھ رہی ہے۔ آنکھیں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور ادھر سے ادھر بلاوجہ ٹہلے جا رہی ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے ہی اس نے دبی آواز میں مجھ سے پوچھا کہ آنے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ میں نے مختصر طور پر آج کی بیتی سب اسے سنا ڈالی۔ لیکن جیسے اس نے سنی ان‌سنی کر دی۔ مجھے صاف نظر آتا تھا کہ وہ کسی معاملے میں سخت پریشان تھی۔

''کوئی نئی بات؟،، میں نے پوچھا۔

''کوئی نئی بات نہیں،، اس نے جواب دیا مگر اس کے چہرے سے میں نے فوراً قیاس کر لیا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے اور اسی لئے نتاشا کو بےچینی سے میرا انتظار تھا۔ اور فوراً ابھی نہیں بتائے گی بلکہ جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی تھی اس وقت کہے گی جب میں چلنے کو آمادہ ہوں گا۔ میرے ساتھ اس کا ہمیشہ سے یہی برتاؤ تھا۔ مجھے بھی اس کی عادت سی ہو گئی تھی چنانچہ میں نے انتظار کیا۔

ظاہر ہے، ہم نے گزشتہ رات کا قصہ چھیڑا۔ خاص بات جو مجھے لگی یہ تھی کہ پرنس والکوفسکی کے بارے میں ہم دونوں قطعی متفق تھے۔ نتاشا کو وہ شخص کسی طرح بھی پسند نہ تھا اور کل سے پہلے تو کہیں زیادہ ناپسند تھا۔ جب ہم دونوں نے اس کی آمد کا تجزیہ ایک ایک بات لے کر کیا تو نتاشا ایک دم بولی:

''سنو، وانیا، تم جانتے ہو، ہمیشہ یہی ہوتا ہے، اگر کوئی آدمی شروع میں ہی ناپسند ہو تو یہ یقینی علامت ہے اس بات کی کہ بعد میں چل کر وہ پسند آ جائے گا۔ کم از کم میرے ساتھ تو ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔،،

''خدا یوں ہی کرے، نتاشا۔ اس معاملے میں میرا خیال یہ ہے اور یہ بالکل قطعی رائے ہے۔ میں نے اس پورے واقعے کو سامنے رکھ کر غور کیا اور سلجھا کر یہ نتیجہ نکالا کہ پرنس خواہ عیاری ہی کیوں نہ کر رہا ہو لیکن وہ دل سے تمہاری شادی کی رضامندی دے رہا ہے اور سنجیدگی سے اس پر راضی ہے۔،،

نتاشا کمرے کے بیچوں بیچ ایک دم تھم گئی اور اس نے کڑی نگاہ سے مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ یہاں تک کہ ہونٹ بھی ذرا سکڑے۔

''مگر بھلا وہ اس جیسے معاملے میں دھوکا فریب کیسے کر

سکتے ہیں اور ... جھوٹ بول سکتے ہیں؟،، اس نے اکڑ کے ساتھ حیرت کے عالم میں پوچھا۔

”یہی تو — بھلا یہی تو،، میں نے گھبراہٹ میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”یقیناً وہ کوئی جھوٹ تھوڑئی بول رہے تھے۔ میں تو جانوں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ کسی طرح کی مکاری کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر یہ کہ بھلا ان کی نظر میں میری ہستی کیا ہے جو یوں مجھے چڑائیں گے وہ؟ کیا کوئی شخص بھی اس قسم کی زیادتی کر سکتا ہے؟،،

”قطعی نہیں، قطعی نہیں،، میں نے ہاں کر دی۔ حالانکہ میں اپنے جی میں سوچ رہا تھا ”جب تم اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھیں تو تم بھی غالباً یہی بات سوچ رہی تھیں، میری بیچاری! اور ممکن ہے تمہیں مجھ سے بھی زیادہ شبہات ہوں۔،،

”ہائے، کیسا میرا دل چاہتا ہے کہ وہ جلدی سے واپس آجاتے!،، وہ بولی۔ ”وہ آدھی رات گئے تک یہیں میرے ہاں رہنا چاہتے تھے اور پھر ... ایسا ہی کوئی بڑا ضروری کام ہوگا جو انہیں سب چھوڑ چھاڑ کر جانا پڑا۔ وانیا، تمہیں معلوم ہے کہ بھلا کیا کام ہوگا؟ تم نے کسی سے کچھ سنا تو نہیں؟،،

”خدا ہی جانے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمیشہ وہ روپیہ بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ پیٹرسبرگ کے کسی ٹھیکے میں ساجھا کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کاروبار کیا ہوتا ہے، نتاشا۔،،

”ہاں واقعی، ہمیں کیا خبر۔ الیوشا نے کل کسی خط وط کا ذکر کیا تو تھا البتہ۔،،

”کوئی خیر خبر۔ کیا الیوشا آیا تھا؟،،

”ہاں۔،،

”صبح سویرے؟،،

”بارہ بجے آیا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے وہ دیر سے سوتا ہے۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھیرا۔ میں نے اسے کاتیرینا فیودوروونا کے یہاں چلتا کر دیا، بھیجنا ہی تھا، وانیا۔،،

”تو کیا وہ آپ سے وہاں نہیں جانے والا تھا؟،،

”نہیں، آپ سے ہی جانے والا تھا...،،

وہ کچھ اور کہتی مگر زبان روک لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور انتظار کرتا رہا کہ اب کہے۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ میں اس کی وجہ پوچھ لیتا مگر اسے کبھی کبھی یہ بات سخت ناپسند تھی کہ سوال پر سوال کئے جائیں۔

”عجیب لڑکا ہے یہ،، آخر وہ بولی، یہ جملہ کہتے وقت اس کا منہ ذرا بگڑا۔ وہ صاف اس کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھ سے نظر چار نہ ہو۔

”کیوں، کیا کچھ ہو گیا؟،،

”نہیں ہوا تو کچھ نہیں... یوں ہی میں نے سوچا... بلکہ وہ ذرا زیادہ ہی مہربان تھا۔ بس اتنا ہے کہ...،،

”اب تو اس کی ساری فکریں اور پریشانیاں ختم ہو گئیں نا،، میں نے کہا۔

نتاشا نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کسی بات کا کھوج لگانا چاہتی ہو۔ اس کے جی میں آئی غالباً کہ میری بات کا جواب دے دے: ”پہلے بھی اسے کون‌سی فکریں اور پریشانیاں تھیں؟،، لیکن اس نے اپنی جگہ خود سوچ لیا کہ میرے الفاظ کے پردے میں یہی خیال پوشیدہ ہے اور اس سے اس کا جی گھٹنے لگا۔

تاہم اسی وقت وہ پھر سے بےتکلفی اور خوشگواری کی باتوں پر اتر آئی۔ اس روز وہ غیرمعمولی طور پر خوش‌اخلاقی برت رہی تھی۔ اس کے پاس میں کوئی گھنٹے بھر سے زیادہ رہا۔ اندر سے اس کو بےچینی بھی بہت تھی۔ پرنس نے اسے گھبرا دیا تھا۔ مجھے اس کے بعض سوالوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ٹھیک ٹھیک یہ جاننے کو بےچین ہے کہ پرنس پر اس نے کیسا اثر ڈالا۔ کیا وہ ٹھیک سے پیش آئی تھی؟ کہیں اس نے اپنی خوشی حد سے گزر کر ظاہر تو نہیں کر دی؟ کیا بات بات پر وہ برا تو نہیں ماننے لگتی تھی؟ یا اس کے برخلاف ہر بات انگیز کرنے والی تو نہیں معلوم ہوتی تھی؟ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھیں؟ کہیں وہ اس کی ہنسی نہ اڑائیں؟ وہ ان کی نظر میں گر نہ جائے؟.. اس خیال سے ہی اس کے گال آگ کی طرح تمتما اٹھے۔

”بھلا، اس ادھیڑ بن سے کیوں خود کو پریشان کیا جائے کہ ایک برا آدمی جانے کیا سوچے گا، سوچتا ہے تو سوچے بلا سے!،، میں نے کہا۔

"تم نے انہیں برا آدمی کیوں کہا؟"، اس نے سوال کیا۔

نتاشا شکی مزاج کی تو تھی مگر دل بہت کھرا اور طبیعت صاف دوٹوک پائی تھی۔ اسے جو وہم گزرتے تھے وہ کسی ناپاک مقصد سے نہیں۔ اس میں خودداری کا بھی مادہ تھا مگر بےجا نہیں، البتہ یہ برداشت نہیں تھی کہ جس چیز کو اس نے اپنے خیال میں بہت اونچا سمجھا ہے لوگ اسی کے سامنے اس کا مذاق اڑائیں۔ اگر کوئی کمینہ آدمی اس کی توہین کرتا تو وہ بھی اسے ذلت کی نظر سے دیکھتی اور بس۔ مگر جس کو اس نے پاک و پاکیزہ یا احترام کے قابل سمجھا ہو اس کا کوئی مذاق اڑائے تو نتاشا کا دل ضرور دکھتا چاہے کوئی بھی مذاق اڑائے۔ یہ اس لئے نہیں کہ نتاشا کی طبیعت میں استقلال نہ تھا بلکہ وجہ اس کی کچھ تو یہ تھی کہ اسے دنیا کا علم بہت محدود تھا اور دوسرے لوگوں کا صحیح اندازہ نہیں تھا اور وہ اپنی چھوٹی سی چاردیواری میں ہی پلی بڑھی تھی۔ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے تنگ گوشے میں ہی بتائی تھی اور بمشکل اس سے باہر نکلی تھی۔ اور بڑی وجہ اس کی وہی تھی جو نیکسیرت لوگوں کی خصوصیت ہوتی ہے اور یہ نتاشا کو باپ سے ورثے میں ملی ہوگی کیونکہ انہیں عادت تھی کہ جن لوگوں سے ابھی ابھی ملے ہیں ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے قائم کر لیں گے اور جیسے وہ درحقیقت ہوتے ہیں، اس سے بہتر سمجھ بیٹھیں گے، ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دیکھیں گے — یہ عادت نتاشا میں بھی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں کے لئے ذرا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بعد میں لوگوں کے متعلق اپنی خوش‌فہمی سے باز آجائیں۔ اور سب سے زیادہ دشوار اس وقت ہوتا ہے جب یہ نیکسیرت لوگ خود کو ہی قابل الزام قرار دے لیتے ہیں کہ بھلا اس سے زیادہ کی ہم نے توقع ہی کیوں رکھی تھی؟ ایسے لوگوں کو ہمیشہ اسی طرح کی مایوسی مقدر ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے سب سے اچھا بھی ہے کہ اپنے الگ تھلگ کونے میں پڑے رہیں اور باہر کی دنیا میں نہ نکلیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے تو ایسے نیکسیرت لوگوں میں یہ بات بھی دیکھی ہے کہ وہ اپنے گوشۂ عافیت میں اتنے مگن رہتے ہیں کہ باہر نکلنے اور لوگوں سے ملنے جلنے سے کھچنے لگتے ہیں۔ نتاشا اب تک بہت سی بدبختیاں سہہ چکی تھی، بڑی ذلتیں اٹھا چکی تھی۔ پہلے ہی اس کا دل دکھا ہوا تھا اور اس پر

کوئی الزام نہیں آتا اگر اب تک جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں کوئی بات قابل الزام ہو تب بھی۔

ہاں تو، مجھے جانے کی جلدی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے حیرت ہوئی اور میرے اٹھنے پر تو وہ جیسے رو پڑی اگرچہ اتنی دیر سے جو میں اس کے پاس بیٹھا تھا تو اس نے کوئی خاص نظرالتفات نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ ذرا غیرمعمولی بےتکلفی سے کام لے رہی تھی۔ اس نے بڑی چاہ سے مجھے پیار کیا اور دیر تک عجب نظروں سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھا کی۔

"تمہیں خبر ہے"، وہ بولی "الیوشا آج صبح تو بہت مسخرےپن کی حرکتیں کر رہا تھا، اس نے مجھے تعجب میں ڈال دیا۔ بہت ہی پیارا، دیکھنے میں بڑا مگن، اڑا جاتا تھا، تتلی کی طرح، چھیلا بنا ہوا، اور آئینے کے سامنے بنتا سنورتا رہا۔ ذرا کچھ زیادہ ہی مزے میں نظر آیا... دیر تک ٹھیرا بھی نہیں۔ ذرا سوچو تو، میرے لئے آپ مٹھائی کی گولیاں لے کے آئے تھے۔"

"مٹھائی کی گولیاں، بھئی، بہت خوب! کیا عنایت ہے، کیا سادگی ہے۔ تم دونوں بھی بس کیا ہو! ابھی سے یہ شروع ہو گیا کہ ایک دوسرے پر کڑی نظر رہنے لگی۔ بھانپا جانے لگا، ایک دوسرے کا چہرہ پڑھنے لگے اور دل کا حال معلوم کرنے لگے (حالانکہ سمجھ میں خاک نہیں آتا)۔ خیر، وہ کوئی برا نہیں ہے۔ جیسا پہلے تھا ایسا ہی اب بھی ہنستا کھیلتا ہے اسکولی لڑکے کی طرح۔ مگر تم؟ تم تو؟"

اور ہمیشہ جب بھی نتاشا کا انداز بدلتا اور وہ الیوشا کی کوئی شکایت میرے سامنے لےکر آتی تھی یا کسی پیچیدہ نازک سوال کے سلجھانے میں مجھ سے مدد لینی ہوتی، یا مجھے کوئی راز کی بات بتانے لگتی، اس امید میں کہ میں ایک لفظ سے سب سمجھ لوں گا تو مجھے یاد ہے کہ وہ ہمیشہ میری طرف ایک دبی دبی مسکراہٹ سے دیکھتی اور ایسا لگتا جیسے وہ التجا کر رہی ہے کہ ایسا جواب دوں جو اس کے دماغ کا بوجھ ہلکا کر دے۔ مگر مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں خاص انہی موقعوں پر سخت اور بےرحم لہجہ اختیار کر لیتا تھا جیسے کسی کو ملامت کر رہا ہوں۔ مجھ سے یہ حرکت بےارادہ سرزد ہوا کرتی تھی مگر ہمیشہ کارگر رہتی تھی۔ میری

سختی اور سنجیدگی نہایت مناسب ثابت ہوتی تھیں۔ ان میں فیصلہ کن انداز ہوتا تھا۔ اور لوگوں میں بھی یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی دل سے اس کے مشتاق ہوتے ہیں کہ کوئی انہیں ڈانٹے پھٹکارے۔ کم از کم نتاشا کو تو میری اس سرزنش سے بعض اوقات بڑی تسکین ہوتی تھی۔

”نہیں، نہیں وانیا، دیکھو“، وہ میرے کاندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھے ہوئے اور دوسرے سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو ایسا خیال آیا کہ وہ کچھ ٹھنڈا سا تھا۔ جیسے گرہست مرد ہوتا ہے، کوئی شادی کو دس ایک برس گزر گئے ہیں تاہم بیوی کے ساتھ وضعداری نباہی جا رہی ہے۔ کیا یہ بات قبل از وقت نہیں ہے؟.. وہ خوب ہنستا رہا، گھومتا، مٹکتا رہا مگر ایسے جیسے مجھ سے اس کا کوئی خاص واسطہ نہیں ہے۔ جیسا ہوا کرتا تھا ویسا بہرحال نہیں ہے... اسے بڑی جلدی پڑی تھی کاتیرینا فیودوروونا سے ملنے جانے کی۔ میں اس سے بات کرتی ہوں وہ سنتا ہی نہیں یا کوئی اور بات چھیڑ دیتا ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ اونچے خاندانی لوگوں کی یہ بیہودہ، گری ہوئی عادت، اس سے چھڑانے کی ہم دونوں کتنی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اصل میں وہ اس قدر وہ تھا... یعنی لگتا تھا کہ کوئی واسطہ ہی نہیں... مگر میں یہ کہہ کیا رہی ہوں! میں نے یہ سب کیونکر کہہ ڈالا؟ ہم لوگ بھی کس درجہ قابل نفریں اور مردود لوگ ہیں، وانیا اب جا کے مجھے یہ نظر آنے لگا ہے! ہم کسی شخص کے چہرے کی معمولی سی تبدیلی بھی گوارا نہیں کر پاتے۔ مگر خدا جانے، اس کے چہرے میں یہ تبدیلی آئی کس وجہ سے؟ تم سچ کہتے تھے وانیا، تم نے جو ملامت کی ابھی ابھی تو ٹھیک ہی کی۔ سب میرا قصور ہے! خود اپنے ہاتھوں ہم مصیبتیں مول لیتے ہیں اور پھر ان کا رونا روتے ہیں... خیر، تمہارا شکریہ وانیا کہ تم سے میرے دل کو تسکین تو ہوئی۔ ہائے، کاش وہ آج ہی آ جائے۔ مگر کیا! افسوس، آج صبح جو کچھ ہوا ہے اس پر وہ اب بھی ناراض ہی ہوگا۔“

”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم اس سے لڑ بیٹھی ہو؟“، میں حیرت سے چیخا۔

”ویسے تو میں نے اظہار بھی نہیں کیا۔ ذرا دلگرفتہ تھی۔ وہ آیا تو ہنستا کھیلتا مگر فوراً ہی سوچ میں پڑ گیا اور مجھے ایسا لگا کہ چلتے وقت اس نے خدا حافظ بھی بےدلی سے ہی کہا۔ مگر میں اسے بلا بھیجوں گی... اور تم بھی آنا آج وانیا۔“

”ضرور بشرطیکہ ایک معاملے میں اٹک نہ گیا۔“

”اچھا — تو وہ معاملہ کیا؟“

”خود اپنے سر لے لیا ہے۔ خیر، کچھ بھی سہی، خیال ہے کہ آ ہی جاؤں گا۔“

ساتواں باب

ٹھیک سات بجے ہوں گے کہ میں مسلوبویف کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ شیستیلاوچنایا سڑک کے ایک چھوٹے سے ملحقہ مکان میں رہتا تھا۔ اس کے پاس تین کمرے تھے جو صاف ستھرے تو نہیں کہے جا سکتے البتہ خاصے معقول فرنیچر سے سجے ہوئے تھے۔ مکان دیکھنے سے کچھ خوش‌حالی ٹپکتی تھی مگر اسی کے ساتھ سلیقے کی کمی بھی۔ مکان کا دروازہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی نے کھولا، عمر ہوگی اس کی کوئی انیس سال۔ کپڑے سادہ مگر دیدہ زیب اور خود خاصی نفاست لئے ہوئے، آنکھیں نرم اور ہشاش بشاش۔ میں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہی ہے الیکساندرا سیمیونوونا جس کا اس نے صبح رواروی میں ذکر کیا تھا اور گویا اس طرح اس کے تعارف کو میرے لئے ایک ترغیب کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور جب اس نے میرا نام سنا تو بولی ”وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے مگر اس وقت اپنے کمرے میں سو رہے ہیں“۔ مجھے وہ کمرے تک لے گئی۔ دیکھتا ہوں کہ مسلوبویف ایک نہایت عمدہ صوفے پر اپنا میلا کچیلا اوورکوٹ اوڑھے اور میلا سا چمڑے کا تکیہ سر کے نیچے رکھے سو رہا ہے۔ وہ کچی نیند سو رہا تھا — جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے اس نے مجھے نام لے کر پکارا۔

”اچھا، تو تم آ گئے۔ تمہارا ہی انتظار تھا۔ میں نے ابھی خواب میں دیکھا کہ تم آئے ہو اور مجھے جگا رہے ہو۔ وقت بھی ہو گیا۔ چلو، چلتے ہیں۔“

''کہاں چلتے ہیں؟''

''ایک خاتون سے ملنے۔''

''کیسی خاتون؟ کس لئے؟''

''مادام بینوِوا سے ملنے۔ اس کا حساب چکا دیا جائے۔ واہ، کیا حسینہ ہے!'' اس نے الیکساندرا سیمیونووونا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے یہ الفاظ ذرا کھینچ کر کہے بلکہ مادام بینوِوا کے خیال پر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو بھی چٹ چٹ چوم لیا۔

''ہاں، تو اب چل دئے — سوجھ گئی کچھ!'' الیکساندرا سیمیونووونا نے ذرا سا غصہ دکھانے کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے یہ جملہ کہا۔

''تم دونوں کا تعارف نہیں ہے؟ تعارف ہو جائے۔ بھئی، الیکساندرا سیمیونوونا، یہ ہیں وہ صاحب جن سے میں تجھے ملاتا ہوں، بڑے ادبی سورما ہیں۔ صرف سال میں ایک بار دیکھنے کو مفت ملتے ہیں ورنہ اور وقت ملو تو روپیہ لگتا ہے۔''

''ہاں تو بنا رہے ہو بےوقوف، آپ اس شخص کی باتوں پر نہ جائیے، یہ تو یوں ہی مجھ پر ہنستا ہے۔ بھلا کہاں کے سورما رکھے ہیں؟''

''یہی بات تو میں کہہ رہا تھا تم سے کہ خاص آدمی ہیں یہ۔ مگر حضوروالا، آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم بس بےوقوف ہی ہیں۔ ہم اس سے کہیں زیادہ ہوشیار سمجھدار ہیں جتنے پہلی نظر میں دکھائی دیتے ہیں۔''

''اس کی باتوں پر نہ جائیے آپ۔ یہ ہمیشہ اچھے شریف آدمیوں کے سامنے میری پوزیشن نازک کر دیتا ہے۔ بےشرم کہیں کا۔ کاش مجھے کبھی تھیٹر لے جانے کی توثیق ہوتی۔''

''الیکساندرا سیمیونوونا، تم اپنے گھریلو دھندے سے پیار کرو۔ کہیں تم بھول تو نہیں گئیں کہ کس چیز سے محبت کرنی چاہئے۔ کہیں وہ لفظ تمہاری یاد سے جاتا تو نہیں رہا؟ وہ جو میں نے تمہیں سکھایا تھا؟''

''قطعی نہیں بھولی۔ توبہ، کیا فضول سا لفظ ہے۔''

''اچھا تو بھلا وہ کیا لفظ تھا؟''

''ہاں، میں مہمان کے سامنے تو ضرور ہی کہہ دوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شرم کی بات ہو اس لفظ کے مطلب میں۔ منہ سے نکل جائے تو زبان کٹ جائے گی میری۔''

''مطلب یہ کہ تم بھول گئیں؟''

''بھولتی کیوں، یاد ہے، پیناتی*۔ اپنے پیناتی سے محبت کرو... دیکھئے تو کیا لفظ سوجھا ہے ان کو۔ ممکن ہے دنیا میں نہ کوئی پیناتی تھے نہ ہوں گے۔ بھلا آدمی ان سے کیوں محبت کرے؟ فضول کی بات!''

''اسی لئے مادام بینوِوا کے پاس...''

''تف ہے تم پر اور تمہاری مادام بینوِوا پر!'' الیکساندرا سیمیونوونا پھٹکار برساتی ہوئی کمرے سے نکل بھاگی۔

''وقت ہو گیا، چل دئے۔ الیکساندرا سیمیونوونا، رخصت!''

ہم دونوں روانہ ہو گئے۔

''دیکھتے ہو وانیا، اول تو ہم اس گھوڑا گاڑی میں بیٹھ لیں۔ ایسے، اور پھر دوسرے یہ کہ میرے بھائی، صبح تجھ سے جدا ہونے کے بعد جو میں چلا تو تھوڑا بہت اور پتہ چلا، اور یوں ہی نہیں قیاس یا گمان سے، بلکہ ٹھیک ٹھیک۔ میں واسی‌لیفسکی جزیرے میں گھنٹہ بھر اور ٹھیرا رہا۔ وہ جو توندیل ہے نا، ایک ہی حرامی ہے — منحوس، پاجی کہیں کا، بگڑا ہوا، عیبی، طرح طرح کی چاٹ اسے لگی ہوئی ہے۔ اور مادام بینوِوا بھی اسی قسم کے کرتوتوں میں کچھ تھوڑا بہت ہاتھ رکھتی ہیں۔ آج نہیں، ایک زمانے سے نامور ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اس نے کسی اچھے شریف خاندان کی ایک لڑکی کو بس پھنسا ہی لیا تھا۔ وہ جو اس نے ململ کی فراکوں میں اس بن ماں باپ کی بچی کو سجانا شروع کر دیا ہے (تم ہی نے مجھ سے بیان کیا تھا) تو اس نے میرا چین آرام چھین لیا۔ کیونکہ میں نے اس سلسلے میں کچھ اور بھی سن رکھا ہے۔ اتفاق کی بات کہ آج صبح ہی میرے ہاتھ کچھ اور مسالہ بھی لگا، مگر اعتبار کے قابل بات لگتی ہے۔ بھلا، لڑکی کی کیا عمر ہوگی؟''

''صورت سے تو کوئی تیرہ برس کا اندازہ ہوتا ہے۔''

''قد میں اس سے بھی چھوٹی ہے۔ یہی حرکتیں ہیں اس عورت کی۔ جب ضرورت سمجھے گی کہہ دے گی، ابھی گیارہ برس کی ہے۔

---

* پیناتی — روم قدیم میں یہ گھر گرہستی کے خاص دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ (ایڈیٹر)

اور کسی اور وقت اسے پندرہ برس کی بتا دے گی۔ اب چونکہ بچی کا کوئی گھربار نہیں ہے اور نہ کوئی ہے جو اس کی دیکھ بھال کر سکے تو بیچاری کو...،،

''کیا واقعی؟ سچ؟،،

''اور تم کیا سمجھے تھے؟ کیا مادام بینووا نے بن ماں باپ کی بچی کو یوں ہی خدا ترسی کے مارے اپنی نگرانی میں لیا ہے؟ خاص طور سے جب وہ توندیل اس کے چکر کاٹ رہا ہو تو سمجھ لو، عین مین یہی معاملہ ہے۔ وہ آج ہی صبح اس سے ملا تھا۔ اور اس بدھو سیزوبریوخوف سے آج ایک حسینہ کا وعدہ کیا گیا ہے، جو شادی‌شدہ عورت ہے، کسی افسر کی بیوی، اونچے گھرانے کی حسینہ۔ یہ بیوپاریوں کی بگڑی ہوئی اولاد اسی پر مرتی ہے۔ بس اسے تو اونچا گھرانا چاہئے۔ یہ ویسا ہی اصول ہے جیسا وہ لاطینی زبان کی گرامر کا ہے، یاد ہے تمہیں؟ معنی مطلب سے لفظ کا آخر طے ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ صبح سے نشے میں ہوں۔ مگر بینووا کے حق میں یہی اچھا ہے کہ وہ ان معاملات میں ٹانگ نہ اڑائے۔ اور پولیس کو غچہ دینے چلی ہے۔ مگر میں بھی وہ ہاتھ دوں گا کہ بس، یاد رکھے... جانتی تو ہے پرانی یادداشت کی بدولت۔ خیر باقی یہ ہے کہ... سمجھے تم؟،،

میں حددرجہ حیران ہوگیا۔ یہ جو تمام باتیں کھلی ہیں تو میری روح دہل گئی۔ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں ہمیں دیر نہ ہو جائے اور برابر گاڑی والے سے تیز چلنے کو کہتا رہا۔

''فکر مت کرو۔ سب بندوبست کر لیا گیا ہے،، مسلوبویف بولا۔ ''میتروشکا وہاں پہنچ چکا ہے۔ سیزوبریوخوف کے تو مال پر ہی پڑے گی لیکن اس توندیل کی کھال پر۔ کمینہ کہیں کا۔ آج صبح سب طے ہو چکا تھا۔ اچھا بینووا میرے حصے میں آتی ہے... کیونکہ پھر اس کی ہمت نہیں پڑے گی...،،

ہم اسی ہوٹل کے پاس پہنچے مگر اس وقت میتروشکا وہاں موجود نہیں تھا۔ گاڑی والے سے ہم نے کہا کہ یہیں ہوٹل کے پاس ہمارا انتظار کرو اور پیدل مادام بینووا کے مکان تک ٹہلتے چلے گئے۔ میتروشکا دروازے پر ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ کھڑکیوں میں بہت تیز روشنی ہو رہی تھی۔ سیزوبریوخوف کے بدمست قہقہے خوب سنائی دے رہے تھے۔

''سب کے سب یہیں موجود ہیں، کوئی پندرہ منٹ سے،، میتروشکا نے بتایا۔ ''بس ابھی موقع ہے۔،،

''مگر اندر کیسے جائیں گے؟،، میں نے پوچھا۔

''مہمانوں کی طرح،، مسلوبویف نے جواب دیا۔ ''وہ مجھے جانتی ہے اور میتروشکا سے بھی واقف ہے۔ ٹھیک ہے کہ سب دروازے بند ہیں مگر ہمارے لئے تھوڑئی۔،،

اس نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ فوراً کھل گیا۔ چوکیدار نے پھاٹک کھولا اور میتروشکا کو آنکھ کے اشارے سے سلام کیا۔ ہم آہستہ سے اندر داخل ہو گئے۔ گھر میں کسی کو آہٹ تک نہیں ملی۔ چوکیدار نے ہی ہمیں زینے تک پہنچایا اور وہاں دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے پوچھا گیا ''کون ہے؟،، اس نے جواب دیا کہ اکیلا وہی ہے اور ضرورت سے اندر آنا چاہتا ہے۔ دروازہ کھلا اور ہم سب کے سب اندر داخل۔ چوکیدار غائب ہو گیا۔

''ہے — کون ہے یہ؟،، مادام بینووا جو شراب کے نشے میں چور اور بکھری ہوئی وہیں تنگ ڈیوڑھی میں شمعدان لئے کھڑی تھی، اس نے دبنگ آواز سے پوچھا۔

''کون؟،، مسلوبویف نے تڑک کر جواب دیا۔ ''تم پوچھتی ہو آنا تریفونوونا، معزز مہمانوں کو نہیں پہچانتی ہو؟.. ہمارے سوا کون ہوگا — فلپ فلیپچ۔،،

''اوہ — فلپ فلیپچ ہیں! تو یوں کہیے، آپ ہیں معزز مہمان! کیسے معلوم ہو کہ آپ ہیں... کوئی بات نہیں... ادھر آجائیے اس طرف...،،

اور وہ بالکل بوکھلا گئی۔

,,کہاں — ادھر؟ مگر یہاں تو روک لگی ہوئی ہے۔ نہیں، ایسے نہیں، آپ ذرا تواضع کیجئے ہماری۔ ہم تھوڑی سی شمپین پئیں گے۔ کیوں آج کوئی سندر چھوکری نہیں ہے کیا؟،،

اس عورت کو ایک دم جیسے اطمینان سا ہو گیا۔

''ایسے معزز مہمانوں کے لئے کیا کمی ہے۔ پاتال سے بھی لانا پڑے تو نکال لاؤں گی۔ آپ جیسوں کے لئے تو چین کی سلطنت سے بلوائی پڑے تو بلوا لوں گی۔،،

''دو لفظ، آنا تریفونوونا، میری جان، سیزوبریوخوف ہے یہاں؟،،

"ہاں — یہ... یہاں —"

"بس اسی سے کام ہے مجھے۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ پاجی، مجھے چھوڑ کے خود شراب لنڈھاتا پھرتا ہے؟"

"میں تو جانوں، وہ آپ کو نہیں بھولا۔ پتہ نہیں کسی کا انتظار تھا اسے، آپ ہی کا انتظار ہوگا، میں تو جانوں۔"

مسلوبویف نے دروازہ کو دھکا دیا اور ہم نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا۔ اس کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں، جن پر پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ بید کی کرسیاں تھیں اور ایک شکستہ سا پیانو۔ وہ سب چیزیں جن کی ایسے مقام پر توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر ہمارے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی، اس وقت جب ہم ڈیوڑھی میں کھڑے بات کر رہے تھے، میتروشکا غائب ہو چکا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس نے تو چوکھٹ بھی پار نہیں کی تھی بلکہ دروازے کی پشت پر ہی انتظار میں رک گیا تھا۔ بعد میں اس کے لئے دروازہ کھلنا تھا۔ وہ بکھری ہوئی اور رنگوں میں ڈوبی ہوئی عورت جسے میں نے صبح کو مادام بینووا کے پس پشت جھانکتا ہوا دیکھا تھا میتروشکا کی کچھ لگتی تھی۔

سیزوبریوخوف نقلی مہاگنی کے ایک پتلے سے صوفے پر میزپوش پڑی ہوئی ایک گول میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر نیم گرم شمپین کی دو بوتلیں رکھی تھیں۔ اور ایک تھی جس میں گھٹیا قسم کی رم بھری تھی۔ اور کئی پلیٹوں میں مٹھائی، بسکٹ، تین طرح کے خشک میوے رکھے تھے۔ سیزوبریوخوف کے سامنے جو میز تھی اس پر دوسری طرف ایک بھاری بھدی، چیچک ماری صورت کی عورت بیٹھی تھی جس کی عمر چالیس کے قریب ہوگی، سیاہ تفتان کا فراک پہنے اور کانسی کی مالا اور چوڑیاں پہنے۔ یہی تھی گویا، افسر کی بیوی، بنی ہوئی۔ سیزوبریوخوف مست تھا اور اپنے آپ میں بہت مگن۔ وہ توند والا یار اس وقت اس کے پاس موجود نہ تھا۔

"لوگوں کو ذرا دیکھو، کیا حرکتیں کرتے ہیں!"، مسلوبویف پورا حلق پھاڑ کر بولا "اور پھر دیوسو ہوٹل میں ملنے کی دعوت دیتے ہیں اوروں کو!"

"اوہو، فلپ فلپچ، کیا عزت بخشی ہے آپ نے مجھ کو!.."

سیزوبریوخوف بدبدایا اور بڑی مدارات کے انداز میں ہمیں لینے کے لئے اٹھا۔

"پی رہے ہو، کیوں؟"

"معاف کیجئے گا، میں..."

"معافی وافی کا کیا سوال، مہمانوں کو بھی دعوت دے ڈالو۔ ہم تو آج تمہارے ہی ساتھ عیش اڑانے آ پہنچے اور ایک اور مہمان کو لیتے آئے — اپنے دوست ہیں"، مسلوبویف نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوشی — واہ، کیا کہتے ہیں — خوش‌نصیبی کہ — ہی ہی!"

"اوف، اسی کو شمپین کہتے ہیں۔ یہ تو کھٹے گوبھی کا عرق لگتا ہے۔"

"آپ کے منہ سے ایسی بات!"

"جان پڑتا ہے کہ تم خود بھی وہاں دیوسو ہوٹل میں نہیں بھٹکتے ہو اور دوسروں کو وہاں کا بلاوا دیتے ہو!"

"ابھی تو یہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ پیرس رہ کے آیا ہے"، افسر کی بیوی بولی "یوں ہی اڑاتا ہوگا۔"

"فیدوسیا تیتیشنا، مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ہاں ہاں، وہاں رہ آیا ہوں میں، سچ۔"

"ارے ایسا دیہاتی لٹھ اور پیرس میں!"

"ہاں ہم گئے تھے وہاں۔ میں تھا اور کارپ وسی‌لیچ۔ کمال دکھائے ہم نے۔ آپ جانتی ہیں کارپ وسی‌لیچ کو؟"

"بھلا مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ تمہارے کارپ وسی‌لیچ کو جانتی پھروں۔"

"ہاں، یہی تو بات ہے۔ وہاں ہم دونوں ساتھ تھے وہ جو جگہ کہلاتی ہے پیرس ویرس۔ وہاں مادام ژبیر کے یہاں ہم نے ایک قدآدم انگریزی آئینہ توڑ دیا تھا۔"

"کیا توڑ دیا تھا؟"

"قدآدم آئینہ، اور کیا — اتنا بڑا آئینہ کہ زمین سے چھت تک لگا ہوا اور کارپ وسی‌لیچ کو ایسی چڑھی ہوئی تھی کہ وہ مادام ژبیر سے روسی زبان ہی جھاڑنے لگا۔ وہ آئینے سے لگا کھڑا تھا، ذرا اس پر جھک گیا۔ مادام ژبیر اس پر اپنی زبان میں چیخ پڑیں

که میرا شیشه سات سو فرانک کا ہے۔ ٹوٹ جائے گا! وہ مسکرایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں سامنے کے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک بلا کی حسینہ پہلو میں تھی، ارے ایسی تھوڑئی تھی جیسی یہ ھڈو ہے۔ وہ تو بس، کیا بتاؤں، واہ کیا لاجواب چیز تھی! کارپ وسی‌لیچ زور سے بولا 'استیپان تریشتیچ، اے استیپان تریشتیچ، توڑتا ہوں اسے، آدھوں آدھ ہو جائے؟'، میں نے بھی جواب دیا 'ہاں ہو جائے!'، اس نے دھڑاق سے ایک گھونسہ جو اس آئینے پر جمایا ہے تو اس کے پرزے اڑ گئے۔ مادام ژبیر غریب کی چیخ نکل گئی اور وہ اس پر برس پڑی اور سیدھی اس کے تھوبڑے کی طرف بڑھی — 'بڑا آیا ڈاکو کہیں کا، (یہ بات اس نے اپنی ھی زبان میں کہی تھی)۔ اس پر وہ بولا 'مادام ژبیر، تم اپنا ہرجانہ لے لو مگر میری مرضی میں دخل مت دو'۔ بس فوراً اس نے ساڑھے چھه سو فرانک کھن کھن گن دئے اور باقی کے پچاس مول بھاؤ میں کٹ گئے۔"

عین اسی وقت ایک خوفناک چیخ سنائی دی جو کئی دروازوں سے گزرکر پہنچی تھی۔ جس کمرے میں ہم تھے اس کے دو تین کمرے کے فاصلے سے یہ آواز آ رہی تھی۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی اور میں بھی چیخ پڑا۔ میں نے یہ چیخ پہچان لی تھی، صاف یلینا کی آواز تھی۔ جب وہ دردناک چیخ ہمارے کان میں پڑی ہے اس کے فوراً بعد ڈانٹنے کی، قسمیں کھانے کی، گتھم گتھا ہونے کی اور پھر آخر میں تڑاتڑ طمانچے مارنے کی صاف اور بلند آوازیں سنائی دیں۔ یہ غالباً میتروشکا اپنے پینترے دکھا رہا تھا۔ ایک دم دروازہ دھڑ سے کھلا اور یلینا کمرے میں ہڑبڑائی ہوئی آئی۔ اس کے چہرے پر لہو کا پتہ نہ تھا، آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں، سفید ململ کے فراک میں جو ملا دلا اور پھٹا ہوا تھا۔ اس کے بال جو نہایت اہتمام سے بنائے گئے ہوں گے اب کھینچ تان کی وجہ سے بری طرح بگڑے ہوئے تھے۔ میں دروازے کے ٹھیک سامنے کھڑا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی بدحواس آئی اور اپنی باھوں سے مجھے بھینچ لیا۔ ہر شخص چونک کر اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ جب وہ اندر سے نکل کر آئی تو ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اتنے میں میتروشکا دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ اپنے بیچھے بال پکڑکر اس توندیل دشمن کو گھسیٹ رہا تھا۔ اس

کی حالت بڑی ابتر تھی۔ وہ اسے کھینچ کر دروازے تک لایا اور کمرے میں جھونک دیا۔

"یہ رہا وہ۔ سنبھالئے اسے!"، میتروشکا نے نہایت اطمینان کے انداز میں زور سے اعلان کیا۔

"سنو"، مسلوبویف نے میرے قریب آکر شانہ تھپتھپایا اور بولا "ہماری گاڑی ہوگی، وہ لے لو اور بچی کو اپنے ساتھ گھر لےجاؤ۔ بس، اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ باقی ہم کل دیکھیں گے۔"

دوبارہ کہنے کی دیر نہیں تھی۔ میں نے یلینا کا بازو تھاما اور اسے بدمعاشی کے اڈے سے باہر لے آیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہاں پر معاملہ کیسے نمٹا۔ کسی نے ہمیں روکا ٹوکا نہیں۔ مکان کی مالکہ پہلے ھی دہشت کے مارے حواس‌باختہ ہو گئی تھی۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ بیچ میں دخل دے ھی نہ سکی۔ گھوڑا گاڑی ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ بیس منٹ کے اندر ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔

یلینا بالکل ادھ موئی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے فراک کے بند کھول دئے، اس پر پانی چھڑکا اور اسے صوفے پر لٹا دیا۔ اس پر بخار اور غشی کی حالت طاری ہو چلی تھی۔ اس کے ننھے سے پیلے چہرے کو دیکھا، رنگ اڑے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا، سیاہ بالوں پر نظر کی جو ایک طرف کو ڈھیر ہو گئے تھے اگرچہ انہیں بڑے اہتمام سے بنایا سنوارا گیا ہوگا اور ان میں خوشبو بھی لگائی گئی ہوگی، اس کے تمام سنگار کو دیکھتا رہا، ان گلابی فیتوں کو دیکھا جو اب بھی کپڑوں میں کہیں کہیں اٹکے رہ گئے تھے اور پوری طرح اس گھناؤنے معاملے کی اصلیت مجھ پر کھل گئی۔ بیچاری ننھی سی بچی! اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ میں نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا اور سوچ لیا کہ نتاشا کے ھاں آج نہیں جاؤں گا۔ ذرا ذرا دیر سے یلینا اپنی دراز پلکیں اوپر اٹھاتی تھی اور مجھ پر نظر ڈال‌لیتی تھی۔ وہ دیر تک اس طرح جم کر دیکھتی تھی گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ آدھی رات گزرچکی تھی اور کافی وقت ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھ لگی اور میں بھی اس کے پاس ھی فرش پر تھک کر لیٹ گیا۔

میں صبح تڑکے ہی اٹھ گیا۔ یوں بھی رات بھر قریب آدھے آدھے گھنٹے سے میری نیند اچٹتی تھی اور اپنے ننھے سے بیچارے مہمان کو اٹھ کر دیکھ لیتا تھا۔ اسے بخار تھا اور کچھ سرسامی کیفیت تھی۔ لیکن صبح ہوتے ہوتے اسے گہری نیند آ گئی۔ میں نے سوچا، یہ اچھی علامت ہے۔ مگر جیسے ہی صبح کو میری آنکھ کھلی تو میں نے طے کیا کہ جب تک وہ بچی غریب سو رہی ہے جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ ایک ڈاکٹر سے میری ملاقات تھی، اچھا خوش‌مزاج آدمی تھا، بڑی عمر کا کنوارا، پتہ نہیں کس زمانے سے ولادیمرسکی سڑک پر اپنی اکیلی جرمن ملازمہ کے ساتھ رہتا چلا آتا تھا۔ میں فوراً اسے بلانے چلا۔ اس نے وعدہ کیا کہ دس بجے پہنچ جاؤں گا۔ جب میں اس سے وعدہ لے کر چلا ہوں تو آٹھ بجے تھے۔ بہت ہی دل تڑپا کہ مسلوبویف کا مکان راستے میں پڑتا ہے، اس سے ملتا چلوں۔ مگر خیال آیا، اس وقت مناسب نہیں — کل رات کے واقعے کے بعد وہ ابھی تک سویا پڑا ہوگا۔ اور اس کے علاوہ اندیشہ یہ بھی تھا کہ یلینا کی آنکھ کھل جائے اور اپنے آپ کو میرے کمرے میں تن تنہا پا کر شاید ڈر جائے۔ اس سرسامی حالت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے یاد نہ آئے کہ کب اور کس طرح وہ یہاں پہنچ گئی۔

جب میں واپس اپنے کمرے میں داخل ہوا ہوں، عین اسی وقت یلینا کی آنکھ کھل گئی۔ میں اس کے قریب گیا اور بہت رکتے رکتے اس سے پوچھا کہ اب طبیعت کیسی ہے؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ مجھے اپنی بولتی ہوئی سیاہ آنکھوں سے ٹکرٹکر تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر میں نے جی میں سوچا کہ وہ پوری طرح ہوش میں ہے اور ہر بات سمجھ گئی ہے۔ یہ کہ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا غالباً اس کی مستقل عادت بن چکی تھی۔ کل بھی اور اس سے پہلے کے دن بھی جب وہ مجھے دیکھنے آئی تھی اس نے میرے بعض سوالوں کے جواب میں ایک لفظ زبان سے نہیں کہا تھا بلکہ صرف میرا منہ تکتی رہی تھی ایسی جمی ہوئی اور خاموش نظر سے جس میں عجیب قسم کی اکڑ بھی تھی اور حیرت اور وحشیانہ تجسس بھی۔ اب میں نے اس کی

نگاہ میں درشتی، بلکہ یوں کہوں کہ بےاعتباری جھلکتی دیکھی۔ میں اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا کہ دیکھوں اب بخار ہے یا نہیں۔ مگر اس نے اپنے چھوٹے سے ننھے ہاتھ سے میرا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیا۔ نہایت آہستگی اور خاموشی کے ساتھ اور میری طرف سے کروٹ بدل کر دیوار کی جانب ہو گئی۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اسے بےچین نہ کروں۔

میرے پاس ایک بڑی سی تانبے کی کیتلی تھی۔ میں سماوار کے بجائے اسے عرصے سے استعمال کر رہا تھا اور اسی میں پانی گرم کر لیتا تھا۔ ایندھن بھی بہت پڑا تھا، چوکیدار اتنا رکھ گیا تھا کہ پانچ دن چلتا۔ میں نے چولھا روشن کیا، تھوڑا سا پانی لیا اور کیتلی چڑھا دی۔ میز پر چائے کا سامان لگا دیا۔ یلینا میری طرف مڑی اور اس نے مجھے یہ سب کرتے دیکھا حیرت اور تجسس سے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کچھ چاہئے؟ لیکن پھر اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ "یہ بھلا مجھ سے کیوں ناراض ہے؟"، میں نے سوچا۔ "عجب لڑکی ہے!"

وعدے کے مطابق میرے بوڑھے ڈاکٹر صاحب ٹھیک دس بجے آ گئے۔ انہوں نے جرمنوں کی عام عادت کے مطابق بڑی چھان‌بین کے ساتھ مریض کو دیکھا بھالا۔ اور مجھے یہ کہہ کر بڑا اطمینان بخشا کہ اگرچہ بچی کو بخار ہے مگر ایسی کوئی خاص خطرے کی بات نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ غالباً اسے کوئی اور پرانی بیماری ہے — دل ٹھیک سے کام نہیں کرتا، اس کی کوئی خرابی ہوگی۔ "لیکن اس میں خاص معائنے کی ضرورت ہوگی، فی‌الحال تو مریض خطرے سے باہر ہے۔"، ضرورت کے بجائے رسمی طور سے انہوں نے ایک نسخہ بھی لکھ دیا جس میں پینے کی اور پھانکنے کی دوا تھی اور فوراً ہی مجھ سے پوچھا کہ وہ یہاں میرے پاس آئی کیسے؟ ساتھ ہی انہوں نے میرے کمرے میں چاروں طرف ذرا تعجب کی نظر ڈالی۔ بڑے میاں تھے بڑے ہی باتونی۔

یلینا نے تو ڈاکٹر صاحب کو حیرت میں ہی ڈال دیا۔ جب انہوں نے اس کی نبض دیکھنی چاہی تو اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور زبان دکھانے سے بھی انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نے جو کچھ پوچھا، وہ چپ سنتی رہی، ایک لفظ نہ بولی اور آنکھیں گاڑ کر ڈاکٹر کی

گردن سے لٹکتے ہوئے بڑے سے استانیسلاف تمغے * کو تکتی رہی۔

''غالباً اس کے سر میں سخت درد ہو رہا ہے،، بڑے میاں بولے ''مگر وہ دیکھتی کیسے ہے!،، میں نے اس وقت ضروری نہیں سمجھا کہ یلینا کے بارے میں ان کے سوالوں کا جواب دوں اور سب بتاؤں، اس لئے میں یہ کہہ کر ٹال گیا کہ یہ لمبی کہانی ہے۔

''اگر میری ضرورت ہو تو مجھے بتانا،، انہوں نے چلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔،،

میں نے طے کر لیا کہ یلینا کے ہی پاس دن بھر رہوں گا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جائے کوشش کروں گا کہ جہاں تک بن پڑے اسے اکیلا چھوڑ کر باہر نہ جاؤں۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اگر ان کا انتظار لاحاصل رہا تو نتاشا اور اس کی ماں آننا اندریئونا پریشانی کے عذاب میں مبتلا رہیں گی، میں نے تدبیر سوچی کہ نتاشا کو خط لکھ کر اطلاع کر دوں کہ آج اس کے ہاں نہیں پہنچ سکوں گا۔ مگر آننا اندریئونا کو تو خط لکھ کر بھی خبر نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ ایک بار جب نتاشا بیمار تھی اور میں نے خط سے انہیں اطلاع دی تھی تو انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ کبھی خط نہ لکھنا۔ ''بڑے میاں تمہارا خط دیکھ کر بہت پیچ و تاب کھاتے ہیں،، انہوں نے مجھ سے کہا تھا ''کیونکہ وہ بیچارے، خط کا مضمون تو جاننا چاہتے ہیں مگر پوچھ نہیں سکتے۔ خود سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کشمکش رہتی ہے اور سارے دن ان کا موڈ بگڑا رہتا ہے۔ اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ تمہارے خطوط سے میری بےتابی اور بڑھ جاتی ہے۔ درجن بھر سطریں لکھنے سے حاصل کیا۔ میں کرید کرید کر پوچھنا چاہتی ہوں اور تم موجود نہیں ہوتے۔،، چنانچہ میں نے صرف نتاشا کو ہی خط لکھ دیا اور جب دواخانے سے دوا لینے گیا تو خط ڈاک میں ڈال دیا۔

اتنے میں یلینا کو پھر گہری نیند آ گئی۔ وہ سوتے میں کراہتی جاتی تھی اور اس کے بدن میں جھرجھری آتی تھی۔ ڈاکٹر کا اندازہ صحیح نکلا — اس کے سر میں سخت درد تھا۔ ذرا ذرا دیر

* مقدس استانیسلاف کا تمغہ، پرانے روس میں نچلے درجے کے شہری اور فوجی تمغوں میں سے ایک تمغہ۔ (ایڈیٹر)

سے وہ چیخ مارتی اور آنکھ کھل جاتی۔ مجھے وہ سچ مچ غصے بھری نظر سے دیکھتی، جیسے میری یہ دیکھ بھال خاص طور سے ناگوار گزر رہی ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس بات سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

گیارہ بجے مسلوبویف آیا۔ وہ اپنے خیالوں میں الجھا ہوا اور ذہنی طور پر گم تھا۔ صرف دم بھر کو آیا تھا اور اسے جلدی سے جانے کی پڑی تھی۔

''اچھا یار، میں تو سمجھتا تھا کہ تم ٹھاٹھ سے نہیں رہتے ہوگے،، اس نے چاروں طرف نظر گھما کر جملہ کسا ''مگر ہاں واقعی یہ خیال کب تھا کہ تمہیں ایسے صندوق میں رکھا ہوا پاؤں گا۔ بھلا، یہ مکان ہے کہ صندوق! خیر کوئی ایسی بات نہیں۔ اصل مصیبت تو یہ ہے کہ تمہیں باہر کی فکریں جو لگی ہیں وہ کام سے توجہ ہٹاتی ہیں۔ کل جب ہم ببنووا کے ہاں جا رہے تھے، اس وقت بھی مجھے اس کا خیال آیا تھا۔ تم جانو، یار، طبیعت کچھ ایسی پائی ہے اور پھر سوشل حالات میرے ایسے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ سے تو کوئی بھلا کام کرتے دھرتے نہیں، ہاں دوسروں کو نصیحت کیے جاتے ہیں۔ سنو، میں یا تو کل آؤں گا شاید، یا پھر پرسوں۔ اور تم بھول مت جانا، اتوار کو مجھ سے ملنے ضرور آنا۔ امید ہے مجھے کہ اس وقت تک اس بچی کا معاملہ بالکل طے ہو جائے گا۔ تو پھر ہم ذرا بیٹھ کے سنجیدگی سے بات کریں گے کیونکہ یار، تجھے تو سنجیدگی سے مٹھی میں لینے کی ضرورت ہے۔ اس طرح سے تیری زندگی ٹھیک نہیں رہے گی۔ میں نے کل صرف اشارے میں بات کہی تھی مگر اب میں دلیل سے تجھے قائل معقول کروں گا۔ ایک بار قطعی طور سے مجھے بتا دے کہ کیا عارضی طریقے سے مجھ سے روپیہ لیتے تجھے ذلت معلوم ہوتی ہے؟،،

''خیر، چلو، جھگڑا نہ کرو،، میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اچھا ہو جو اتنا بتا دو کہ وہاں کل تم لوگوں کا وہ قصہ کیسے ختم ہوا؟،،

''ہاں، وہ تو نہایت مناسب طریقے سے انجام پا گیا تھا اور مقصد بھی پورا ہو گیا تھا، سمجھے؟ میرے پاس اب وقت بالکل نہیں ہے۔ میں منٹ بھر کے لئے تم سے صرف یہ کہنے آیا تھا کہ بہت

مصروف ہوں اور تمہارے لئے فرصت نہیں نکال سکوں گا، یوں ہی جاننا چاہتا تھا کہ آگے کیا ارادہ ہے، اس لڑکی کو کہیں اور رکھوگے یا اپنے پاس ہی رکھ لینے کا خیال ہے؟ کیونکہ یہ معاملہ ایسا ہے جس پر غور کرکے فیصلہ کرنا چاہئے۔''

''ابھی تک کچھ یقینی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی کہہ دوں کہ مجھے انتظار ہی تھا کہ تم سے مشورہ لوں گا۔ اچھا تو کس بنیاد پر میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟''

''اس میں کیا رکھا ہے، تم نوکرانی کی حیثیت سے رکھ سکتے ہو...''

''صرف ایک درخواست ہے کہ ذرا دھیمے بولو۔ اگرچہ وہ بیمار ہے لیکن ہوش میں ہے۔ میری نظر پڑی کہ تمہیں دیکھتے ہی وہ چونک گئی تھی۔ مطلب یہ کہ کل جو کچھ گزری ہے وہ اسے یاد آ گیا...''

پھر میں نے اسے اس بچی کا طورطریقہ اور جتنی باتیں اس میں نوٹ کی تھیں، سب بتائیں۔ میرے اس بیان سے مسلوبویف کو دلچسپی معلوم ہوئی۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ممکن ہے ایک خاندان میں اسے رکھ دوں جس سے میرے مراسم ہیں اور ساتھ ہی اپنے پرانے مراسم والے گھرانے کا ذکر کر دیا۔ مجھے یہ جان کے حیرت ہو گئی کہ اسے نتاشا کا قصہ کچھ نہ کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اور جب میں نے سوال کیا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا تو وہ بولا:

''بہت دن ہوئے ایک خاص کام کے سلسلے میں کچھ بھنک میرے کان میں پڑی تھی۔ تمہیں بتا تو چکا ہوں کہ پرنس والکوفسکی سے میری ملاقات ہے۔ تمہارا یہ خیال مناسب لگتا ہے کہ لڑکی کو انہی لوگوں میں بھیج دو۔ نہیں تو تمہارے کام میں ہی ہرج پڑےگا اس سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لڑکی کو کسی نہ کسی حیثیت کی ضرورت ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرنا۔ یہ ذمہ‌داری میں اپنے سر لئے لیتا ہوں۔ اچھا رخصت۔ مجھ سے ملنے آتے رہا کرو۔ کیا اس وقت وہ سو رہی ہے؟''

''لگتا تو یہی ہے'' میں نے جواب دیا۔

لیکن جیسے ہی وہ نکل کے گیا یلینا نے مجھے پکارا۔

''یہ کون تھے؟'' اس نے سوال کیا۔ آواز کانپ رہی تھی اور

اب کی بار بھی اس نے مجھے اسی جمی ہوئی نظر سے ناک چڑھاکے دیکھا۔ ناک چڑھاکے دیکھنے کے علاوہ اور کوئی مناسب لفظ اس کے لئے ملتا نہیں۔

میں نے یلینا کو مسلوبویف کا نام بتایا اور یہ بھی کہا کہ اسی کی مدد سے میں نے تمہیں ببنووا کے ہاں سے بچاکر نکالا اور یہ کہ ببنووا اس سے بہت ڈرتی ہے۔ لڑکی کے گال ایک دم تیزی سے تمتما اٹھے۔ یہ بات لازمی طور پر کل رات کے واقعے کے یاد آ جانے سے ہوئی ہوگی۔

''اور اب وہ نہیں آئےگی یہاں کبھی؟'' یلینا نے پتہ چلانےوالی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے جلدی سے اطمینان دلایا۔ وہ چپ ہو گئی اور میرا ہاتھ اپنی جلتی ہوئی انگلیوں میں لے لیا مگر فوراً ہی چھوڑ دیا جیسے سنبھل گئی ہو۔

میں نے سوچا ''یہ تو ہونے سے رہا کہ اسے درحقیقت مجھ سے اس درجہ نفرت ہے مگر ہاں یا تو یہ اس کی عادت بن گئی ہے، یا پھر... پھر یہی ہے کہ بیچاری لڑکی نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں اتنے دکھ جھیلے ہیں کہ دنیا میں اب اسے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔''

مقررہ وقت پر میں دوا لینے نکلا اور اسی دوران ایک ہوٹل میں چلا گیا جہاں میری جان پہچان تھی اور ادھار مل جایا کرتا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت میں نے اپنے ساتھ ایک ناشتہ‌دان بھی لے لیا تھا چنانچہ یلینا کے لئے مرغی کا شوربہ اس میں ڈلوا لیا۔ مگر اس نے کھانا ہی نہ چاہا اور شوربہ چولھے پر رکھا رہ گیا۔

میں نے یلینا کو دوا پلا دی اور خود اپنے کام پر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا، وہ سو رہی ہے۔ لیکن جیسے ہی نظر گھما کر اس کی جانب دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر اٹھاکر بہت غور سے مجھے لکھتے دیکھ رہی ہے۔ میں ایسے بن گیا جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔

آخر وہ خود ہی گہری نیند سو گئی۔ اور مجھے یہ جان کے بڑا اطمینان ہوا کہ وہ مزے سے سوئی ہے، اب نہ کراہ ہے اور نہ سرسام کی تکلیف۔ اب مجھے یہ فکر پڑ گئی کہ نتاشا کو اصل سبب تو معلوم ہے نہیں، اسے مجھ پر بڑا غصہ آئےگا کہ آنے کا وعدہ

کیا اور آیا نہیں، پھر یہ بھی سوچا کہ اس وقت جب اسے خاص طور پر میری ضرورت ہے، غالباً میری لاپرواہی سے بڑا رنج ہوگا۔ ممکن ہے جب وہ کسی خاص پریشانی میں مبتلا ہو اور مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہو، بدقسمتی سے عین اسی وقت میں وہاں موجود نہ ہوں۔

آنا اندریئونا کے معاملے میں تو کچھ بھی نہ سوجھتی تھی کہ کل جا کر کیسے معذرت کروں گا۔ میں سوچتا رہا، سوچتے سوچتے آخر ایک دم سے میں نے جی میں ٹھانی کہ جلدی سے دونوں کے ہاں کا ایک چکر لگا لوں۔ اس طرح گھر سے صرف دو گھنٹے غائب رہوں گا اور بس۔ یلینا گہری نیند سو رہی تھی اور خیال تھا کہ اسے میرے جانے کی آہٹ تک نہ ہوگی۔ میں نے فوراً جھپٹ کر فراک کوٹ اور ٹوپی اٹھائی۔ مگر ابھی باہر نکلنے ہی والا تھا کہ یلینا نے مجھے آواز دی۔ سخت حیرت ہوئی — کیا واقعی وہ جھوٹ موٹ سوتی بن گئی تھی؟

میں یہاں ایک جملہ معترضہ کہتا چلوں کہ اگرچہ یلینا ظاہر یہی کرتی تھی کہ وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی لیکن بار بار اس کا مجھ سے مخاطب ہونا، اور جب شک وشبہ ہو تو مجھ سے اس کی صفائی چاہنا ہی بتا رہا تھا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اور اس بات سے میرے دل کو تسکین ہوئی۔

”آپ مجھے کہاں بھیجنے والے ہیں؟“، جب میں قریب آیا تو اس نے سوال کیا۔ سوال کرنے کا اس کا اپنا ایک انداز تھا کہ اچانک پوچھ بیٹھتی تھی جب اس کا گمان بھی مجھے نہیں ہوتا تھا۔ اس بار میں قطعی نہیں سمجھ پایا کہ وہ کیا معلوم کرنا چاہتی ہے۔

”ابھی آپ اپنے دوست سے کہہ رہے تھے نا کہ مجھے کسی کے گھر میں رکھ دینے والے ہیں۔ میں اب کہیں نہیں جانا چاہتی۔“

میں ذرا اس پر جھکا۔ دیکھا کہ سارا جسم پھنک رہا ہے۔ بخار کا ایک اور حملہ شروع ہو گیا تھا۔ میں اسے تسلی دینے اور تھپکنے لگا اور یہ اطمینان دلاتا رہا کہ اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہو تو میں تمہیں کسی کے ہاں نہیں بھیجوں گا۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا کوٹ اور ٹوپی اتار لی۔ دل نہ مانا کہ ایسی حالت میں اسے مکان میں تن تنہا چھوڑ کر چل دوں۔

”نہیں، نہیں، آپ جائیے!“، اس نے یہ اندازہ کر کے کہ میں نے

جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کہا۔ ”مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ ابھی آنکھ لگ جائے گی۔“

”مگر تم تن تنہا کیسے رہوگی؟“، میں نے بےیقینی سے کہا۔ ”اگرچہ مجھے واپس آنے میں بس دو گھنٹے لگیں گے...“

”اچھا تو آپ جائیے۔ فرض کیجئے کہ میں سال بھر بیمار رہوں تو بھی کیا آپ ہر وقت گھر بیٹھے رہیں گے؟ نہیں“، اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور مجھے عجب طریقے سے دیکھا جیسے دل میں کوئی مہربانی کی لہر اٹھ رہی ہے اور وہ اس سے کش مکش کر رہی ہے۔ بیچاری ننھی سی لڑکی! اس کا صاف پاکیزہ اور نرم و نازک دل اس پر بھی کہ وہ بےنیاز اور بظاہر چڑچڑی لگتی تھی، اپنی جھلک دکھا ہی جاتا تھا۔

اول تو میں دوڑا ہوا آنا اندریئونا کے ہاں پہنچا۔ وہ میرا انتظار ہی کر رہی تھیں، اور بےصبری سے ان کے غصے کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ مجھ پر لعنت ملامت کی بوچھار برس پڑی۔ بےحد موڈ بگڑا ہوا تھا — نکولائی سرگیئچ تیسرے پہر کا کھانا کھاتے ہی گھر سے باہر چلے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں۔ مجھے یہ احساس ہو گیا کہ بڑی بی کے منہ سے ضرور سب کچھ نکل گیا ہے۔ وہ ضبط نہیں کر سکیں اور اپنی ہمیشہ کی عادت کے مطابق اشاروں کنایوں میں سب کچھ کہہ دیا ہوگا۔ بلکہ انہوں نے خود ہی اس کا اعتراف کر لیا اور مجھے بتایا کہ ایسی خوشی کی لہر کو شوہر سے روک کر نہیں رکھ سکتی ہیں۔ لیکن نکولائی سرگیئچ سن کر، بقول ان کے ”کالی گھٹا“، بن گئے، ”منہ سے انہوں نے کچھ نہیں کہا اور ایسی چپ لگی کہ میرے سوالوں تک کا جواب نہیں دیا“۔ کھانے سے نمٹ کر فوراً تیار ہوئے اور چل دئے۔ یہ بیان کرتے وقت آنا اندریئونا کا حال یہ تھا کہ وہ خوف سے بس کانپ رہی تھیں۔ مجھ سے التجا کرنے لگیں کہ نکولائی سرگیئچ کے آنے تک ٹھیر جاؤں۔ میں نے مجبوری ظاہر کی اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل بھی شاید آپ کے ہاں نہ آ سکوں گا اور اسی لئے جلدی جلدی یہاں پہنچا تھا کہ آپ کو پہلے سے یہ بتا دوں۔ اس بار ہمارا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ رو پڑیں اور مجھے بہت سخت سست کہہ ڈالا۔ اور جب میں اٹھ کر چل دیا اور دروازے کے پاس پہنچ گیا تو وہ لپکیں اور انہوں نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ دونوں

بازوؤں سے مضبوط پکڑ لیا اور کہنے لگیں کہ مجھ جیسی بیچاری ''اکیلی،، عورت سے خفا نہ ہونا اور میری بات کا برا مت ماننا۔

نتاشا کو خلاف توقع میں نے پھر اکیلا ہی پایا۔ اور یہ کہنا عجیب لگتا ہے کہ اس بار کسی طرح بھی وہ مجھے دیکھ کے اتنی خوش نہیں ہوئی جتنی کل ہوئی تھی یا دوسرے موقعوں پر ہوا کرتی تھی۔ جیسے میری آمد سے کسی کام میں خلل پڑ گیا ہو یا میں اسے تنگ کر رہا ہوں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا الیوشا آیا تھا آج؟ تو وہ بولی:

''ہاں آیا تو تھا، مگر دیر تک ٹھیرا نہیں۔ وعدہ کر گیا تھا کہ آج شام کو پھر ادھر ہوتا جائے گا،، جھجکتے ہوئے اس نے کہہ دیا۔

''تو پھر کل رات آیا؟،،

''نہیں، اسے روک لیا گیا،، اس نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں، وانیا، تم اپنی سناؤ، کیسے چل رہا ہے؟،،

میں نے دیکھا کہ وہ اس گفتگو کو ٹال دینا اور موضوع سخن کو بدل دینا چاہتی ہے۔ میں نے ذرا غور سے اس پر نظر ڈالی۔ واقعی وہ الجھن میں تھی۔ مگر جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ میں اس کی ٹوہ لینا چاہتا ہوں اور غور کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں تو اس نے فوراً چمک کر ایک غضبناک نظر مجھ پر ڈالی، اس زور سے گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جلا ڈالے گی۔ ''بیچاری پھر مصیبت میں ہے،، میں نے جی میں سوچا ''لیکن مجھ سے اس کے بارے میں کہنا سننا نہیں چاہتی۔،،

اس نے پوچھا تو میں نے یلینا کا پورا قصہ تفصیل کے ساتھ اسے سنا دیا۔ بہت ہی زیادہ دلچسپی ہوئی اس کو اور واقعے کا اثر بھی بہت ہوا۔

''توبہ، توبہ! اور تم اس غریب کو اکیلا اور بیمار چھوڑ کر چلے آئے!،، وہ چیخ پڑی۔

میں نے نتاشا سے کہا کہ آج میرا آنے کا ارادہ قطعی نہیں تھا لیکن ڈر لگا کہ تم مجھ سے ناراض ہو جاؤگی اور ممکن ہے تمہیں میری ضرورت ہو۔

''ضرورت،، اس نے اپنے طور پر کسی اور طرف خیال دوڑاتے

ہوئے کہا ''غالباً مجھے تمہاری ضرورت تو ہے، وانیا۔ مگر بہتر ہو کہ پھر کبھی۔ ہمارے گھر والوں کے ہاں گئے تھے؟،،

میں نے اس سے بیان کر دیا۔

''ہاں، خدا جانے، میرے ابا ان نئے معاملات کو کس طرح قبول کریں۔ مگر اب اس میں قبول کرنے کو کیا رکھا ہے!..،،

''مطلب کیا تمہارا؟ قبول کرنے کو کیا رکھا ہے؟،، میں نے دھرایا ''یعنی ایسی الٹ پلٹ!،،

''ہاں، یوں ہی سمجھو... بھلا وہ کہاں گئے ہوں گے اب؟ پچھلی بار تو تمہارا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ملنے نکلے تھے۔ سنو، وانیا، اگر ہو سکے تو کل تم یہاں ہو جاؤ۔ تب میں تمہیں کچھ بتا سکوں گی... تمہیں تکلیف دیتے ہوئے مجھے شرم تو آتی ہے۔ مگر اس وقت تم کو اپنے مہمان کے پاس گھر واپس جانا چاہئے۔ نکلے ہوئے، میرے اندازے سے، دو گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے تمہیں!،،

''ہو تو گئے۔ اچھا، رخصت، نتاشا۔ چلا میں۔ مگر ہاں، الیوشا آج تمہارے ساتھ پیش کیسے آیا؟،،

''الیوشا کا کیا۔ کچھ نہیں... تمہارے تجسس پر تو خاصا تعجب ہوتا ہے مجھے۔،،

''اچھا۔ خدا حافظ، دوست!،،

''خدا حافظ۔،،

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیا، ایسے جیسے یوں ہی بےخیالی میں، اور میری آخری رخصتی نگاہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ میں باہر چلا آیا — بہت ہی حیران اور متعجب۔ میں نے سوچا ''واقعی کتنی باتیں ہیں جن پر وہ سوچتی رہتی ہوگی۔ یہ معاملات کوئی ہنسی کھیل تو ہیں نہیں۔ اور کل ہونے دو، وہی پہلے مجھ سے سب کچھ کہہ ڈالے گی۔،،

جب میں گھر لوٹا ہوں تو دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اور گھر کا دروازہ کھولتے وقت بہت ہی خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ شام ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں یہ تو نظر آ گیا کہ یلینا صوفے پر بیٹھی ہے اور اس کا سر سینے پر اس طرح جھکا ہوا ہے جیسے بہت غور میں ڈوبی ہو۔ اس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ معلوم ہوتا تھا ہر چیز سے بےنیاز ہے۔ میں اس کے پاس

پہنچا۔ وہ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ ''کہیں دماغ کو گرمی تو نہیں چڑھ گئی؟'' میں نے سوچا۔

''یلینا، میری بچی، کیا ہوا تجھے؟'' میں نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اور اسے اپنے بازو کی لپیٹ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں چلی جانا چاہتی ہوں... اچھا ہے کہ اسی کے پاس چلی جاؤں'' اس نے جواب دیا مگر مجھے دیکھنے کو سر تک نہیں اٹھایا۔

''کہاں؟ کس کے پاس؟'' میں نے حیران ہوکر کہا۔

''اسی کے، ببنووا کے پاس۔ وہ ہمیشہ کہتی رہتی ہے کہ اس کا مجھ پر بہت روپیہ چاہئے۔ اماں کے کفن دفن کا خرچ اسی نے اٹھایا تھا... میں نہیں چاہتی کہ وہ میری اماں کو کوسے... میں اس کے گھر کام کروں گی اور سارا روپیہ اتار دوں گی... اور پھر میں خود ہی وہاں سے چل دوں گی۔ اور اب تو میں لوٹ کے وہیں جاؤں گی۔''

''صبر کرو، یلینا۔ تمہیں وہاں نہیں جانا چاہئے'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہیں دکھ دے گی۔ تمہیں بالکل برباد کر دے گی...''

''برباد کر لینے دو۔ دکھ دینے دو'' یلینا نے تیزی میں آکر میرے وہی لفظ پکڑ لئے۔ ''میں پہلی ہی تھوڑی ہوں، اور بھی کئی، مجھ سے اچھی اچھی دکھ جھیل رہی ہیں۔ سڑک پر ایک بھکاری عورت نے مجھے بتایا یہ۔ میں غریب ہوں، غریب ہی رہنا چاہتی ہوں۔ عمر بھر غریب رہوں گی۔ جب میری اماں مرنے لگی تھیں تو انہوں نے مجھے یہی نصیحت کی تھی۔ میں کام کروں گی... مجھے یہ کپڑے نہیں پہننے...''

''میں کل تمہیں دوسرے کپڑے دلوا دوں گا۔ تمہارے لئے کتابیں لا دوں گا۔ تم میرے پاس رہوگی۔ کسی کے حوالے ہرگز نہیں کروں گا جب تک تم خود نہ جانا چاہو۔ اطمینان رکھو اب...''

''میں گھر کی نوکری کروں گی۔''

''اچھا، اچھا، کر لینا... ابھی آرام کرو۔ لیٹ جاؤ۔ سو جاؤ۔''

مگر بیچاری بچی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو سبکیوں میں تبدیل ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں اس کا۔ میں نے اسے پانی دیا۔ کنپٹیوں کو اور سر کو

بھگویا۔ آخر وہ نڈھال ہوکر صوفے پر گر پڑی اور بخار سے پھر کانپنے لگی۔ جو کچھ مجھے مل سکا وہ میں نے اس کو اڑھا دیا۔ اور وہ بےچینی کی نیند سو گئی۔ بار بار چونکتی تھی اور جاگ پڑتی تھی۔ اگرچہ اس روز میں بہت زیادہ نہیں چلا تھا لیکن تھکن بہت ہو گئی تھی اور میں نے طے کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے سو جاؤں۔ دماغ میں سخت پریشان کن خیالات کا ہجوم تھا۔ پہلے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس بچی کی وجہ سے آئندہ بڑی مصیبت جھیلنی ہوگی۔ لیکن اصل فکر تو نتاشا اور اس کی پریشانیوں کی تھی۔ اب بھی جب مجھے یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ اس بدبخت رات کو سوتے وقت میں جتنا پریشان اور فکرمند تھا اتنا شاید ہی کبھی اور رہا ہوں گا۔

نواں باب

میں صبح کو دیر سے کوئی دس بجے سوکر اٹھا۔ طبیعت ذرا خراب تھی۔ چکر آ رہے تھے اور سر میں درد تھا۔ میں نے یلینا کے بستر کی طرف دیکھا۔ بستر خالی تھا۔ اسی وقت داہنے ہاتھ پر جو میرا چھوٹا کمرہ تھا وہاں سے آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی فرش پر جھاڑو دے رہا ہو۔ میں دیکھنے گیا۔ یلینا کے ایک ہاتھ میں جھاڑو تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی اس خوبصورت فراک کو اوپر چڑھائے ہوئے جو پرسوں رات سے اس کے بدن پر تھی، وہ جھاڑو دے رہی تھی۔ ایندھن کی لکڑی چولھے میں رکھنے کے لئے ایک کونے میں چن دی گئی تھی۔ میز جھاڑ پونچھ کر صاف کی جا چکی تھی اور کیتلی دھلی ہوئی تھی۔ ایک لفظ میں یوں کہئے کہ یلینا نے گھر کا کام کاج شروع کر دیا تھا۔

''سنو، یلینا!'' میں نے باآواز بلند کہا ''فرش صاف کرنے کو تم سے کس نے کہا تھا؟ میں یہ بالکل پسند نہیں کرتا۔ تم بیمار ہو۔ تو کیا تم میرے ہاں نوکرانی بن کے آئی ہو؟''

''تو پھر فرش کون صاف کرے گا؟'' وہ سیدھی ہوکر سامنے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اب بیمار نہیں ہوں۔''

''مگر میں تمہیں کام کرانے نہیں لایا ہوں، یلینا۔ شاید یہ ڈر لگتا ہے تمہیں کہ میں بھی ببنووا کی طرح ڈانٹوں ڈپٹوں گا کہ مفت میں

کیوں میرے ساتھ رہتی ہو۔ اور تم نے یہ واہیات جھاڑو کہاں سے پا لی؟ میرے ہاں تو جھاڑو تھی ہی نہیں،، میں نے اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

،،یہ میری جھاڑو ہے۔ میں ہی لائی تھی۔ نانا جب رہتے تھے تو میں ہی ان کے کمرے میں جھاڑ پونچھ کیا کرتی تھی۔ تبھی سے جھاڑو چولھے کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔،،

میں سوچتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن مجھے ایسا اندازہ ہوا کہ یلینا میری دیکھ بھال اور خاطر تواضع سے خود کو دبا ہوا محسوس کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ جیسے بھی بن پڑے وہ یہ ثابت کر دے کہ رہتی ہے تو کام بھی کرتی ہے۔ ،،کیسی تلخی بھری ہے اس کردار میں،، اس وقت مجھے خیال آیا۔

دو ایک منٹ بعد وہ اندر چلی آئی اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر کل کی طرح صوفے پر خاموش بیٹھ گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے کچھ جاننا چاہتی ہو۔ اسی اثنا میں میں نے کیتلی تیار کر دی اور چائے بنا کر ایک پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ چائے کے ساتھ گیہوں کی ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس نے چپ چاپ سر جھکا کر چائے اور روٹی لے لی۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے کہ اس نے قریب قریب کچھ کھایا نہیں تھا۔

،،دیکھو، جھاڑو سے تم نے اپنا یہ اچھا فراک بگاڑ لیا نا،، میں نے اس کے فراک کے دامن پر کوڑے کا ایک دھبہ دیکھ کر کہا۔

اس نے اوپر سے نیچے تک خود پر نظر ڈالی اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا — پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور بڑے اطمینان اور خاموشی سے ململ کے فراک کے عرض میں سے ایک سرا دونوں ہاتھ میں پکڑ کر اوپر سے نیچے تک کھینچ ڈالا اور فراک سے سر تا پا دھجی اڑ گئی۔ یہ حرکت کرنے کے بعد اس نے اپنی ضدی اور چمکتی ہوئی آنکھیں خاموشی سے میری جانب اٹھائیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

،،یہ کیا کر رہی ہو، یلینا؟،، میں چیخا، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس پر پاگل پن سوار ہے۔

،،یہ فراک ہی نحس ہے،، اس نے زیرلب کہا اور طیش کے مارے حلق میں اس کا سانس پھنس گیا۔ ،،آپ نے اسے اچھا فراک کیوں کہا؟ میں اسے بالکل پہننا نہیں چاہتی،، اپنی جگہ سے اچھل کر

اس نے ایک دم زور سے کہا۔ ،،میں اس کے ٹکڑے کر دوں گی، میں نے نہیں کہا تھا کہ مجھے کپڑے بنوا دو۔ اس نے خود ہی زبردستی مجھے یہ بنوا کے دیا۔ اور اس سے پہلے بھی ایک ایسے فراک کے ٹکڑے اڑا چکی ہوں۔ اس کی بھی دھجیاں کر ڈالوں گی۔ دھجیاں کر ڈالوں گی! پرزے پرزے کر دوں گی! ٹکڑے اڑا دوں گی!..،،

غصے کی آگ میں بھری ہوئی وہ اس کمبخت لباس پر ٹوٹ پڑی۔ لمحے بھر میں اس کی تمام دھجیاں اڑ چکی تھیں۔ یہ کر چکنے کے بعد اس کا چہرہ ایسا پیلا پڑا کہ وہ بمشکل اپنی جگہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ میں اس کے طیش کو حیرت سے تک رہا تھا اور وہ مجھے ایسے نافرمانی کے انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے بھی اس کی کوئی نہ کوئی توہین کر دی ہو۔ مگر اب میری سمجھ میں آگیا کہ کیا کرنا چاہئے۔

میں نے طے کیا کہ آج ہی صبح کو اس کے لئے نیا لباس خرید کر لاؤں گا۔ یہ وحشی اور بپھری ہوئی ننھی سی چڑیا صرف مہربانی کے برتاؤ سے ہی رام ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ پہلے کسی نے مہربانی کا سلوک ہی نہیں کیا۔ اگر ایک بار سخت سزا پانے کے باوجود وہ اسی قسم کے لباس کے ٹکڑے اڑا چکی ہے تو اس نئے فراک سے بھی اسے کیسی نفرت لگتی ہوگی، کیونکہ اسے دیکھ کر ابھی دو دن پہلے کے ہیبت ناک لمحے اسے یاد آ جاتے ہوں گے۔

پرانے کپڑوں کے بازار میں سادہ، اچھے خاصے دیدہ زیب کپڑے مل جاتے ہیں اور بہت سستے۔ مشکل یہ تھی کہ ان دنوں میرے پاس پیسہ بالکل نہیں تھا۔ مگر کل رات جب میں سونے لیٹا تو اسی وقت سوچ لیا تھا کہ صبح کو ایک جگہ جاؤں گا جہاں سے کچھ روپیہ مل جانے کی امید تھی، پھر یہ جگہ پرانے کپڑوں کے بازار کے راستے میں بھی پڑتی تھی۔ میں نے ٹوپی اٹھائی۔ یلینا غور سے دیکھتی رہی جیسے اسے کسی بات کی توقع ہو۔

،،کیا پھر آپ مجھے تالے میں بند کر کے جانے والے ہیں؟،، اس نے سوال کیا جب میں نے چابی اٹھائی کہ جاتے وقت دروازے کو تالا لگا دوں گا جیسے کل اور پرسوں کر چکا تھا۔

،،میری پیاری بچی،، میں نے اس کے نزدیک جا کر کہا ،،تم اس پر خفا مت ہو۔ میں تو دروازے میں اس لئے تالا لگاتا ہوں کہ

کوئی اور آ نہ جائے۔ تم بیمار ہو اور تمہیں ڈر لگے گا۔ پتہ نہیں کون خواہ مخواہ چلا آئے۔ کیا ہو جو بینووا ہی آ پہنچے...،،

میرے دل میں یہ بات نہیں تھی۔ میں تو اس لئے تالا لگاتا تھا کہ مجھے لڑکی پر اعتبار نہیں تھا۔ اور ڈر تھا کہ کہیں اس کے دماغ میں ایک دم یہ بات نہ آ جائے کہ چلو، چھوڑو ان کو۔ میں تھوڑے دنوں بہت احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا۔ یلینا کچھ نہ بولی اور میں نے پھر اسے تالے میں بند کر دیا۔

ایک پبلشر سے میری ملاقات تھی جو پچھلے دو سال یا اس سے زیادہ عرصے سے کئی کئی جلدوں کی تالیفیں شائع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ جب کبھی مجھے فوری کام سے روپیہ کمانے کی ضرورت پڑتی تو میں اس کے ہاں سے کچھ کام لے لیا کرتا تھا۔ وہ وقت پر روپیہ ادا کر دیتا تھا۔ میں نے اسی کے یہاں دستک دی اور اس نے مجھے پچیس روبل پیشگی دے دئے اس شرط پر کہ ہفتے کے آخر تک ایک مضمون تیار کر دوں گا۔ مجھے امید تھی کہ ناول کے لئے بعد میں وقت نکال لوں گا۔ جب کبھی روپے سے ہاتھ بہت تنگ ہوتا تو میں اکثر یہی کیا کرتا تھا۔

روپیہ مل گیا تو میں بازار کی طرف چلا۔ پہنچتے ہی ایک جان پہچان کی بڑی بی مل گئیں جو ہر قسم کے پرانے کپڑے فروخت کیا کرتی تھیں۔ میں نے انداز سے انہیں یلینا کا سائز بتایا اور انہوں نے فوراً میرے لئے ہلکے رنگ کا ایک سوتی لباس چن کر نکال دیا جس کی قیمت بھی بہت ہی کم تھی اگرچہ یہ لباس دیکھنے میں اچھا مضبوط تھا اور ایک بار سے زیادہ دھلا بھی نہیں تھا۔ ساتھ ہی میں نے ایک گلوبند اٹھا لیا۔ قیمت ادا کرتے وقت مجھے خیال آیا کہ یلینا کو ایک پوستین کا کوٹ یا اوڑھنی یا اسی قسم کی کوئی چیز درکار ہوگی۔ موسم سرد ہو چلا تھا اور اس کے پاس قطعی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ مگر سوچا کہ اس خریداری کو آئندہ کسی وقت کے لئے ملتوی رکھا جائے۔ یلینا میں اکڑ اس قدر تھی کہ وہ بات بات پر برا مان جاتی تھی۔ خدا جانے، یہ بھی وہ کیسے گوارا کرے۔ اگرچہ میں نے جان بوجھ کر بہت ہی سستے قسم کا کپڑا اور جتنا سادہ اور صوفیانہ ممکن تھا، خریدا تھا۔ بہرحال میں نے اس کے لئے دو جوڑ تو سوتی اور ایک جوڑ اونی موزے خرید لئے۔ یہ کہہ کر اسے موزے دئے جا سکتے تھے کہ

تم بیمار ہو اور کمرے میں سردی ہے۔ نیچے پہننے کا لباس بھی اسے چاہئے ہوگا۔ مگر یہ بھی اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیا جب میرے اس کے درمیان تکلف ذرا اور کم ہو جائے۔ پھر میں نے بستر کے لئے کچھ پرانے پردے خریدے۔ ان کی ضرورت بھی تھی اور اس سے یلینا کو خوشی بھی ہوتی۔

سہ پہر کا ایک بجا تھا جب گھر لوٹا۔ تالے میں چابی گھمائی تو اس کی آواز تک نہ ہوئی۔ میں کمرے میں سامان لئے داخل ہوا تو آہٹ کے بغیر اس طرح کہ یلینا نے مجھے آتے نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میز کے پاس کھڑی میری کتابوں اور کاغذوں کو الٹ پلٹ رہی ہے۔ اندر آنے کی آہٹ پاتے ہی اس نے جلدی سے وہ کتاب بند کر دی جسے اس وقت پڑھ رہی تھی اور میز سے ہٹ گئی اور گھبراہٹ کے مارے سرخ ہو گئی۔ میں نے کتاب پر نظر ڈالی — یہ میرا پہلا ناول تھا جو کتابی شکل میں چھپا تھا۔ اور سرورق پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔

”جب آپ گئے ہوئے تھے تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا،، اس نے ایسے لہجے میں کہا جس کا مطلب یہ لگتا تھا کہ وہ مجھے تالا لگا کر چلے جانے کا طعنہ دے رہی ہے۔

”ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر ہو۔ تم نے پکار کر پوچھا نہیں یلینا؟،،

”نہیں۔،،

پھر میں نے کچھ نہیں کہا بلکہ سامان کا بنڈل رکھ دیا، اسے کھولا اور جو کپڑے خریدے تھے اس میں سے نکالے۔

”لو، یہ ہے یلینا، میری بچی،، میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا ”یہ جو چیتھڑے تم لگائے ہوئے ہو، ان میں تو کہیں آ جا بھی نہیں سکتیں۔ تو میں نے تمہارے لئے کپڑے خرید لئے ہیں۔ یوں ہی معمولی سے ہیں، سستے، روزمرہ کے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ ایک روبل بیس کوپک میں کام چل گیا۔ شوق سے پہن ڈالو۔،،

میں نے کپڑے اس کے پاس ہی رکھ دئے۔ ایک دم سرخ ہو کر وہ ذرا دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ اسے سخت حیرت تھی۔ ساتھ ہی مجھے یوں لگا کہ وہ کسی بات سے بےانتہا شرمائے جا رہی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں

ہلکی سی، نرم سی روشنی جگمگائی۔ یہ دیکھ کر کہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا میں اپنی میز کی طرف مڑ گیا۔ جو کچھ میں نے کیا اس سے وہ ظاہراً متاثر تو ضرور ہوئی تھی لیکن کوشش کرکے خود کو روکے رہی اور آنکھیں جھکا کر بیٹھ گئی۔

میرا سر چکرا رہا تھا اور درد بڑھتا جا رہا تھا۔ تازہ ہوا کھانے سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اسی اثنا میں مجھے نتاشا کے ہاں بھی جانا تھا۔ کل سے اس کے بارے میں میرے تفکرات ذرا بھی کم نہ ہوئے تھے بلکہ اس کے برخلاف برابر بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ایک دم مجھے خیال گزرا کہ یلینا نے مجھے پکارا، میں اس کی طرف مڑا۔

''جب آپ باہر جایا کریں تو مجھے تالے میں بند نہ کیجئے،'' اس نے دور کہیں دیکھتے ہوئے اور صوفے کے کنارے کو ٹھونکتے ہوئے اس طرح کہا گویا وہ بس، اسی میں غرق رہی ہو۔ ''میں آپ کے پاس سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا، یلینا۔ میں مانتا ہوں، لیکن کوئی اجنبی آ گیا تو کیا ہوگا؟ پتہ نہیں کون آ جائے!''

''اچھا تو چابی مجھے دے جائیے۔ میں اندر سے تالا لگا لوں گی اور اگر کوئی دروازہ کھٹکھٹائے گا تو کہہ دوں گی: گھر پر نہیں ہیں۔'' اور اس نے مجھے یوں تیکھے پن سے دیکھا گویا کہتی ہو ''لو، اب کہو، کیسی سیدھی سی بات ہے''۔

''آپ کے کپڑے کون دھوتا ہے؟'' اس نے ایک دم سوال کیا، ابھی میں اسے جواب بھی نہ دینے پایا تھا۔

''یہاں ایک عورت ہے اس مکان میں، وہی دھو دیتی ہے۔''

''مجھے کپڑے دھونے آتے ہیں۔ اور آپ کو کل کھانا کہاں سے ملا؟''

''ایک ہوٹل سے۔''

''میں کھانا بھی پکا سکتی ہوں۔ آپ کا کھانا پکا دیا کروں گی۔''

''بس، بس، یلینا۔ تمہیں کیا آتا ہے کھانا پکانا، فضول کی بات کر رہی ہو...''

یلینا چپ رہ گئی اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ صاف ظاہر

تھا کہ اسے میرے جملے سے ٹھیس پہنچی ہے۔ کم از کم دس منٹ یوں ہی گزر گئے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔

''شوربہ'' وہ اچانک بول پڑی۔ مگر سر ویسے ہی جھکا ہوا تھا۔

''شوربہ، کیا مطلب تمہارا شوربے سے؟ کیسا شوربہ؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''میں شوربہ بنا سکتی ہوں۔ اماں کے لئے بھی بنایا کرتی تھی جب وہ بیمار تھیں۔ میں بازار سامان خریدنے بھی جایا کرتی تھی۔''

''یہ دیکھو، یلینا، دیکھتی ہو، تم کیسی نک چڑھی ہو'' میں نے اس کے پاس جاتے ہوئے اور صوفے پر برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ وہ برتاؤ کرتا ہوں جو میرا دل کہتا ہے۔ تم اکیلی ہو۔ کوئی عزیز رشتہ دار نہیں۔ دکھ میں ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کام آؤں۔ اگر مجھ پر مصیبت ہوگی تو تم بھی اسی طرح میرے کام آؤگی۔ لیکن تم نہیں چاہتی ہو کہ اس طرح سے معاملے کو جانچو۔ تمہیں تو مجھ سے نہایت معمولی درجے کی چیز لیتے بھی گراں گزرتا ہے۔ تم چاہتی ہو کہ ہاتھ کے ہاتھ اس کا بدلہ کر دو اور اجرت کے طور پر چیز حاصل کرو۔ یعنی میں کوئی بنوا ہوں اور تمہیں اس کے طعنے دوں گا۔ اگر یہ بات ہے تو بڑے شرم کی بات ہے، یلینا۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف منہ بسور کر رہ گئی۔ لگتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ضبط سے کام لیا اور چپ رہی۔ میں نتاشا کے ہاں جانے کو اٹھا۔ اب کے میں نے چابی یلینا کے ہی پاس رہنے دی۔ اس سے کہہ دیا کہ کوئی آئے اور دروازہ کھٹکھٹائے تو تم پکار کر پوچھ لینا کہ کون ہے۔ میرے دل کو پکا یقین تھا کہ نتاشا کے ساتھ کوئی بڑی ناگوار بات پیش آئی ہے مگر وہ فی الحال مجھے بتا نہیں رہی ہے جیسا کہ پہلے بھی کئی بار کر چکی ہے۔ بہرحال میں نے طے کیا کہ ذرا دم بھر کو اس کے ہاں ہوتا آؤں تاکہ کہیں اسے میرے بار بار آ بیٹھنے سے چڑ نہ ہو جائے۔

جو میں نے انداز کیا تھا صحیح نکلا۔ وہ پھر مجھ سے سخت ناگواری کی نظر سے ملی۔ میں اسے فوراً اسی حال میں چھوڑ کر چل دیتا لیکن قدموں نے جواب دے دیا۔

"میں تو صرف منٹ بھر کو آیا تھا، نتاشا،" میں نے زبان کھولی "تم سے مشورہ لینے کہ مجھے اپنے مہمان کا کیا کرنا چاہئے۔" پھر میں نے اسے یلینا کے متعلق سب کچھ بتانا شروع کیا۔ نتاشا خاموش میری بات سنتی رہی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا مشورہ دوں، وانیا،" اس نے جواب دیا۔ "ہر بات سے یہی ثبوت ملتا ہے کہ وہ بالکل ہی عجیب و غریب قسم کی بچی ہے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہو اور اس کے دل میں خوف بیٹھ گیا ہو۔ وقت دو کہ وہ ذرا ٹھیک ہو جائے کچھ۔ کیا تمہارے خیال میں اس کو میرے گھروالوں کے پاس رکھ دینا ٹھیک ہوگا؟"

"وہ تو برابر یہ کہتی رہتی ہے کہ اب میرے پاس سے کہیں اور کسی جگہ نہیں جائےگی۔ اور خدا جانے، تمہارے گھروالے اسے کس طرح قبول کریں۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اچھا، تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہے؟ کل کچھ طبیعت ناساز معلوم ہوتی تھی،" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"ہاں... آج بھی میرے سر میں درد ہو رہا ہے،" اس نے بےخیالی سے جواب دیا۔ "آج تم ہمارے گھروالوں میں سے تو کسی سے نہیں ملے تھے؟"

"نہیں۔ وہاں کل جاؤںگا، کل ہفتے کا دن ہے نا..."

"کیوں، کل کی کیا خصوصیت؟"

"شام کو پرنس جو آ رہے ہیں..."

"تو کیا ہے؟ میں بھولی نہیں ہوں۔"

"نہیں، میں تو..."

وہ بالکل میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہی۔ اس کی آنکھوں میں کسی عزم کی، کسی قسم کے ضدی‌پن کی جھلک تھی، جیسے حدت اور شدت طاری ہو۔

"جانتے ہو کیا، وانیا،" وہ بولی "مجھ پر بس یہ کرم کرو کہ یہاں سے ٹل جاؤ۔ تم میرے کام میں بہت حارج ہوتے ہو..."

میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف بھونچکے ہوکر دیکھنے لگا۔

"نتاشا، پیاری، کیا ہوا تمہیں؟ کیا معاملہ ہے؟" میں خوف سے چیخ پڑا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ کل تمہیں سب معلوم ہو جائےگا۔ مگر اس وقت میں تنہائی چاہتی ہوں۔ سنتے ہو وانیا؟ ابھی چلے جاؤ۔ بس۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ تمہیں دیکھنا بھاری پڑتا ہے!"

"مگر کم سے کم یہ تو بتاؤ..."

"سب کچھ معلوم ہو جائےگا۔ کل سب پتہ چل جائےگا۔ اف خدایا، جاؤگے کہ نہیں؟"

میں چلا گیا۔ اس قدر حواس‌باختہ ہو گیا تھا کہ کچھ احساس ہی نہ رہا کہ کیا کر رہا ہوں۔ ماورا ڈیوڑھی میں میرے پیچھے پیچھے دوڑی ہوئی آئی۔

"غصے میں ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "میں ان کے پاس جاتے ڈرتی ہوں۔"

"مگر ہوا کیا ان کو؟"

"تین دن ہو گئے ہیں کہ صاحب‌زادے نے ادھر آ کر جھانکا بھی نہیں۔"

"کیا کہتی ہو؟" میں نے حیرت سے دہرایا "ابھی کل ہی تو اس نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ صبح آیا تھا اور پھر شام کو آنے کا کہہ گیا تھا۔"

"شام میں آنا کیا ہوتا، وہ تو صبح کو بھی نہیں آیا۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ ہم نے تین دن سے اس کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔ کیا واقعی انہوں نے کل تم سے کہا تھا کہ وہ صبح آیا تھا؟"

"ہاں، ہاں، خود نتاشا نے کہا۔"

"تو یہ بات ہے،" ماورا سوچتے ہوئے بولی "بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہیں وہ کہ تمہارے سامنے بھی اقرار کرنا نہیں چاہتی ہیں کہ وہ نہیں آیا۔ کمال ہے!"

"مگر یہ سب قصہ کیا ہے؟" میں چیخ پڑا۔

"قصہ یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا کروں،" ماورا نے مجبوری اور بےبسی سے کاندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ تو کل مجھے بھیج رہی تھیں اس کے پاس۔ لیکن دو

بار راستے سے ہی واپس بلا لیا۔ اور آج مجھ سے بات بھی نہیں کر رہی ہیں۔ اچھا ہوتا کہ تم اسے دیکھ آتے۔ میں ان کو چھوڑ کر جا نہیں سکتی۔"

میں آپے سے باہر ہو کر زینے سے اترنے لگا۔

"آج شام کو آؤ گے تم؟" ماورا نے پیچھے سے مجھے پکار کر پوچھا۔

"دیکھا جائے گا" میں نے راستے ہی میں جواب دیا۔ "ممکن ہے ذرا دیر کو تمہارے پاس ہوتا جاؤں اور پوچھ لوں کہ کیا ہے، کیسے ہے؟ اگر خود میری زندگی رہی تو۔"

مجھے واقعی ایسا لگ رہا تھا کہ خاص دل پر کوئی کڑی چوٹ لگی ہے۔

دسواں باب

میں سیدھا الیوشا کے ہاں پہنچا۔ وہ باپ کے ساتھ مالایا مارسکایا میں رہتا تھا۔ پرنس والکوفسکی کے پاس کافی کشادہ بڑا مکان تھا اگرچہ وہ اس میں تنہا رہتا تھا۔ اس مکان میں الیوشا کے پاس دو نہایت شاندار کمرے تھے۔ اتفاق سے ہی میں کبھی اس سے ملنے گیا ہوں گا۔ ایک بار گیا تھا مجھے یاد ہے۔ وہ البتہ مجھ سے ملنے اکثر آتا رہا، خاص طور سے شروع میں، جب نتاشا سے اس کے تعلقات کا ابتدائی زمانہ تھا۔

وہ مکان پر موجود نہیں تھا۔ میں سیدھا اس کے کمرے میں پہنچا اور اسے یہ رقعہ لکھا:

"الیوشا، معلوم ہوتا ہے، آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ منگل کی رات کا واقعہ، کہ آپ کے والد نے بذات خود نتاشا سے درخواست کی کہ وہ آپ کی بیوی بننے کا شرف آپ کو عطا کرے، اور آپ کو اس بات کی خوشی بھی ہوئی تھی، جس کا میں خود گواہ ہوں، تو آپ خود تسلیم کریں گے کہ موجودہ صورت حال میں آپ کا رویہ کسی قدر عجیب ہے۔ آپ کو خبر بھی ہے کہ نتاشا کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ بہرحال میری یہ سطریں آپ کو جتا دیں گی کہ اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ نہایت نامناسب اور

حد درجہ لاپروائی کا ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کو ٹوکوں یا نصیحت کروں لیکن مجھے اس کی قطعی کوئی پروا نہیں ہے۔

بعد نوشت۔ اس رقعے کے بارے میں نتاشا کو کچھ خبر نہیں۔ بلکہ آپ کے بارے میں اس نے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں ہے۔"

میں نے خط کو سربمہر کیا اور اس کی میز پر رکھ دیا۔ میرے پوچھنے پر ملازم نے بتایا کہ چھوٹے صاحب گھر پر بہت کم رہتے ہیں اور وہ غالباً صبح تڑکے سے پہلے گھر نہیں لوٹیں گے۔

بڑی مشکل سے گھر پہنچا۔ سر چکرا رہا تھا اور ٹانگیں جواب دے رہی تھیں، پاؤں کانپ رہے تھے۔ دروازے پر تالا نہیں لگا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ نکولائی سرگیئچ اخمنیف میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وہ میز کے پاس بیٹھے خاموش حیرت سے یلینا کو تک رہے تھے۔ اور یلینا بھی اسی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی اگرچہ بالکل ہونٹ سیے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا "وہ انہیں عجیب نظر آتی ہوگی"۔

"ہاں، بھائی، تمہارا پورے گھنٹے بھر سے انتظار کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی کہہ دوں کہ مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ... تمہیں اس حال میں پاؤں گا" انہوں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا اور یلینا کی طرف اس طرح اشارہ کیا کہ وہ نہ دیکھ پائے۔ ان کے چہرے پر حیرت کی جھلک تھی۔ مگر جب میں نے انہیں اور قریب سے دیکھا تو ان کے اندر بےتابی اور اندرونی پریشانی نظر آئی۔ ان کا چہرہ غیرمعمولی طور پر زرد تھا۔

"بیٹھ جاؤ، بیٹھو" انہوں نے مجھ سے بہت گھبرائے ہوئے اور فکرمند انداز میں کہا "میں تمہارے پاس اس لئے دوڑا ہوا آیا کہ کام تھا۔ ہاں، تمہیں کیا ہوا؟ صورت پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ صبح سے سر چکرا رہا ہے۔"

"ذرا خیال رکھو۔ لاپروائی سے کام نہیں چلے گا، کہیں سردی تو نہیں لگ گئی؟"

''نہیں۔ بس ذرا اعصابی حملہ ہے۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی تو سنائیے۔ بخیریت ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ بس، یوں ہی کچھ پریشان ہو گیا ہوں۔ کام ہے تم سے۔ بیٹھ جاؤ۔''

میں نے ایک کرسی موڑی اور میز پر ان کے سامنے منہ کرکے بیٹھ گیا۔ بڑے میاں میری طرف اور جھک گئے اور بہت دھیمے دھیمے کہنے لگے:

''خیال رکھو۔ اس لڑکی کی طرف نہ دیکھنا۔ بلکہ ایسے بن جاؤ جیسے ہم کوئی اور بات کر رہے ہیں۔ ہاں، یہ بتاؤ۔ کون ہے یہ جو تمہارے ہاں آئی ہوئی ہے؟''

''نکولائی سرگیئچ، یہ سب قصہ میں آپ کو بعد میں سنا دوں گا۔ یہ غریب بیچاری لڑکی ہے جس کا کوئی والی وارث نہیں۔ یہ اسی اسمتھ مرحوم کی نواسی ہے جو اس مکان میں رہتا تھا اور مٹھائی والے کی دکان میں مرا تھا۔''

''اچھا تو گویا، اس کی نواسی بھی تھی! مگر سنو، بیٹے، یہ لڑکی بہت عجیب ہے۔ دیکھو تو کیسے آنکھیں گاڑ کے دیکھتی ہے! صاف کہوں تم سے۔ اگر تم آ نہ گئے ہوتے تو میں اور پانچ منٹ اس کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اول تو وہ دروازہ ہی نہیں کھول رہی تھی، پھر تب سے اس نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا ہے۔ اسے دیکھ کے ہول آتا ہے۔ عام انسانوں کا طور طریقہ ہی نہیں ہے اس میں۔ مگر وہ یہاں پہنچ کیسے گئی؟ اچھا تو، میں سمجھا، میں جانوں وہ اپنے نانا سے ملنے آئی ہوگی اور اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ مر چکے ہیں؟''

''جی ہاں، یہ لڑکی بہت دکھ جھیل چکی ہے۔ بڑے میاں کو مرتے وقت اس کا خیال آیا تھا۔''

''ہونہہ، تو جیسا نانا ویسی نواسی۔ تم مجھے اس کے بارے میں بعد میں بتانا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی کچھ مدد کر سکیں کسی صورت سے، بیچاری جب اس قدر تکلیف میں ہے تو۔ ہاں، مگر بیٹے، کیا اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس سے تھوڑی دیر کو کہیں اور چلے جانے کو کہہ دو۔ کیونکہ مجھے تم سے ایک سنجیدہ معاملے پر بات کرنی ہے۔''

''مگر جانے کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ یہیں رہتی ہے وہ۔''

میں نے بڑے میاں کے سامنے جس قدر بھی مجھ سے ہو سکا، وضاحت کی کہ آپ فکر نہ کیجئے، اس کی موجودگی میں ہی بات کیجئے کیونکہ وہ تو بچی ہے۔

''اچھا... ہاں تو بچی ہی ہے۔ تم نے تو بھئی مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ بھلا تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ خدایا رحم کر!''

اور بڑے میاں نے ایک بار پھر اسے حیرت کی نظر سے دیکھا۔

یلینا کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی اور صوفے کا کنارہ انگلیوں سے مروڑ رہی تھی۔ اس نے اپنا نیا لباس پہن لیا تھا اور وہ اس پر بالکل ٹھیک بیٹھا تھا۔ بال خاص طور سے اچھی طرح بنے سنورے تھے شاید نئے لباس کی خوشی میں۔ یوں کہنا چاہئے کہ اگر اس کی نگاہ میں اس قدر عجیب وحشی‌پن نہ ہوتا تو وہ بڑی ہی خوبصورت بچی لگ رہی تھی۔

''مختصر اور صاف صاف۔ اب بتاؤں تمہیں کہ اصل بات کیا ہے، میرے بھائی،'' بڑے میاں نے پھر گفتگو شروع کی۔ ''معاملہ ذرا طولانی ہے۔ اہم معاملہ ہے...''

وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چہرے پر گمبھیر اور گہری سوچ بچار کی کیفیت تھی۔ اگرچہ انہوں نے جلدی مچائی تھی اور ''مختصر اور صاف صاف'' کی بات کی تھی لیکن انہیں بات شروع کرنے کو لفظ نہیں ملے۔ میں نے سوچا ''دیکھئے، اب یہ کیا کہتے ہیں''۔

''تم جانو وانیا، میں تمہارے پاس ایک خاص غرض سے آیا ہوں۔ لیکن اول تو... جیسا کہ میں اب اندازہ کر رہا ہوں، تمہارے سامنے وہ خاص حالات رکھ دوں... تمہیں سمجھا دوں کہ کیسے نازک حالات ہیں...''

وہ ذرا کھنکھارے اور کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ دیکھا اور سرخ ہو گئے۔ شرما کے سرخ ہو گئے اور اپنے اوپر پیچ و تاب کھایا کہ ان سے بات نہیں بن رہی ہے۔ اور پیچ و تاب کھانے میں ہمت پڑ گئی۔

''بتانے کو رہا کیا ہے۔ تم خود جانتے ہو، لے دے کے ساری

بات یہ ہے کہ میں پرنس کو ڈوئل* کی دعوت دیتا ہوں۔ اور تم سے میری عرض اتنی ہے کہ اس کا انتظام کر دو اور میرے وکیل بن کر ساتھ کھڑے ہو جانا۔،،

دھچکے سے میری پیٹھ کرسی پر لگی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں تکنے لگا۔

’’میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ دماغ نہیں چلا میرا۔،،

’’مگر معاف کیجئے نکولائی سرگیئچ، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کس مقصد سے؟ اور پھر یہ بھی کہ ایسا ہونا ممکن کیوں کر ہوگا...،،

’’سبب؟ مقصد؟،، بڑے میاں چیخ پڑے۔ ’’اچھی کہی!..،،

’’اچھا، بہت اچھا، میں جانتا ہوں اب آپ کیا کہیں گے۔ لیکن آپ کے اس فعل سے حاصل کیا ہوگا؟ اس ڈوئل سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔،،

’’میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ تم کچھ نہیں سمجھوگے۔ تو سنو۔ ہمارا مقدمہ ختم ہو گیا (یعنی یہ کہ آجکل میں ختم ہو جائےگا۔ بس، ایک آدھ خالی خولی خانہ پری رہ گئی ہے)۔ میں مقدمہ ہار گیا۔ مجھے کوئی دس ہزار کی رقم ادا کرنی ہوگی۔ عدالت کی ڈگری ہے یہ۔ اخمینفکا کی جائداد سے ادا ہوگا۔ چنانچہ اب اس کمینے پاجی کو روپیے کی طرف سے اطمینان ہے۔ اور میں اخمینفکا کی جائداد سے ہاتھ دھوکر بالکل فارغ ہو جاتا ہوں۔ تب تو میں اپنے سر کی بازی لگا سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں: ’حضور والا، دو سال سے میری توہین کر رہے ہیں۔ میرے نام کو اور میرے خاندان کے نام کو آپ نے بٹہ لگایا۔ اور مجھے یہ ساری رسوائیاں سہنی پڑی ہیں۔ اس وقت میں آپ کو ڈوئل کے لئے للکار نہیں سکتا تھا۔ ورنہ آپ کہتے کہ 'بڑے ہوشیار ہو۔ اب مجھے گولی سے اڑا دینے کا چیلنج دے رہے ہو تاکہ وہ رقم دینے سے بچ جاؤ جو تم خود سمجھتے ہو کہ جلد یا بہ‌دیر تمہیں ادا کرنی ہی پڑےگی۔ ذرا ٹھیر جاؤ۔ پہلے مقدمے کا فیصلہ دیکھ لیں اور پھر ڈوئل کا چیلنج بھی دے دینا۔ اچھا، تو اب،

---

* آمنے سامنے گولی چلانے کا مقابلہ۔ (مترجم)

حضور والا، پرنس صاحب، لیجئے، مقدمہ فیصل ہو چکا۔ اب آپ کو اطمینان ہے، کوئی خطرہ نہیں رہا، کوئی رکاوٹ نہیں رہی اب تو۔ کیا آپ اتنی عنایت فرمائیں گے کہ مجھ سے گولی کی باڑھ پر ملاقات فرمائیں؟، مجھے بس، تم سے یہی کہنا تھا۔ اچھا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے بالآخر اپنا انتقام لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا؟ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس سب کا، اس سب کا انتقام!،،

ان کی آنکھوں میں بجلی دوڑ گئی۔ میں دیر تک زبان سے کچھ کہے بغیر انہیں تکتا رہا۔ میں ان کے خیالات کی تہہ میں اتر جانا چاہتا تھا۔

’’سنئے، نکولائی سرگیئچ،، میں نے آخر یہ ٹھان کر کہا کہ جو اصل بات ان سے کہنی ہے اور جس کے بغیر ہم ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں سکتے، کہہ ڈالوں۔ ’’کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے قطعی کھل کر بات کریں؟،،

’’ہاں، ضرور،، انہوں نے ڈٹ کر جواب دیا۔

’’تو آپ مجھے صاف صاف بتائیے۔ کیا صرف ایک انتقام کا ہی جذبہ ہے جو اس چیلنج کے لئے آپ کو اکسا رہا ہے یا کوئی اور مقصد بھی ہے آپ کی نظر میں؟،،

’’وانیا،، انہوں نے جواب دیا ’’تم جانتے ہو کہ بعض ایسے سوال ہیں جن پر میں کسی کی بات سننا پسند نہیں کرتا۔ مگر اس بار استثنا کئے دیتا ہوں کیونکہ تم نے اپنی دوررس نظر سے یہ قیاس کر لیا کہ اس سوال سے قطع نظر کرنا ممکن نہ ہوگا۔ ہاں، ایک اور مقصد بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ میں اپنی گمراہ بیٹی کو بچاؤں اور اسے بربادی کے اس راستے سے ہٹا لوں جس پر حال کے واقعات لئے جا رہے ہیں۔،،

’’مگر آپ ڈوئل کرکے اسے بچا کیسے سکتے ہیں؟ سوال اصل میں یہ ہے۔،،

’’جو کچھ وہ لوگ ان دنوں سازش کر رہے ہیں اس میں کھنڈت ڈال کر۔ بات سنو۔ یہ کہیں مت سمجھ لینا کہ میں پدرانہ شفقت سے یا اسی طرح کی کسی اور کمزوری سے جوش میں آ گیا ہوں۔ یہ تو سب بکواس ہے۔ میں اپنا دل چیرکر تو کسی کو دکھانے سے رہا۔ خود تمہیں بھی اس کی خبر نہیں۔ بیٹی نے

مجھے چھوڑ دیا۔ میرا گھر چھوڑ کے وہ اپنے چہیتے کے ساتھ فرار ہو گئی۔ تو میں نے بھی اسے دل سے نکال پھینکا۔ اسی رات کو میں نے اسے بالکل اپنے دل سے محو کر دیا، ہمیشہ کے لئے۔ یاد ہے تمہیں؟ اگر نتاشا کی تصویر پر مجھے تم نے روتا دیکھ لیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے معاف کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے تب بھی معاف نہیں کیا تھا، میں اپنی گم‌شدہ مسرت کے لئے رویا۔ میرے خوابوں کی دنیا اجڑ گئی، اس پر رویا۔ مگر یہ نہیں کہ بیٹی پر، یعنی جیسی وہ اب ہے، اس پر رویا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اکثر رو پڑتا ہوں... مجھے اس کا اقرار کرتے شرم نہیں ہے، بالکل ایسے جیسے مجھے اس بات پر شرم نہیں ہے کہ مجھے کبھی اپنی بیٹی دنیا کی ہر شے سے پیاری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اب اسی سے میرے قول کی تردید نکالی جائے۔ مثلاً تم کہوگے کہ اچھا اگر ایسا ہے اور آپ کو اس کی تقدیر سے کوئی واسطہ مطلب نہیں ہے جسے آپ اب اپنی بیٹی نہیں سمجھتے تو آپ اس میں کیوں دخل دیں کہ وہ لوگ کیا منصوبہ گانٹھ رہے ہیں۔ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اول تو یہ ہے کہ میں اس کمینے اور تکڑمی آدمی کی فتح نہیں دیکھ سکتا، دوسرے عام انسان‌دوستی کا سوال ہے۔ اگر وہ میری بیٹی نہیں ہے تب بھی ایک کمزور، بےبس اور فریب خوردہ ہستی تو ضرور ہے جسے اب اور زیادہ دغا دی جا رہی ہے، اور اندیشہ ہے کہ وہ بالکل ہی غارت ہو جائے۔ میں سامنے سے سیدھے سیدھے تو نہیں البتہ بالواسطہ دخل دے سکتا ہوں — ڈوئل کر کے۔ اگر میں اس میں مارا گیا یا میرا خون بہا تو یقین ہے کہ وہ میری کھٹیا پر سے، بلکہ میری لاش پر سے گزر کر میرے قاتل کے بیٹے کا ہاتھ میں ہاتھ لئے کلیسا کے محراب و منبر کے سامنے نہیں کھڑی ہوگی۔ جیسے اس بادشاہ کی بیٹی نے کیا تھا (تمہیں خیال ہوگا اس کتاب کا جس سے تم نے پڑھنا سیکھا تھا) کہ اپنے رتھ میں سوار باپ کی لاش پر سے گزر گئی تھی*۔ اور پھر اس کے علاوہ اگر

---

* یہاں روم کے ایک مورخ ٹیٹس لیویئس (۵۹ق‌م تا ۱۷ء) کی کتاب سے ایک واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں روم کے بادشاہ سیرویئس ٹولیئس کے قتل اور ترکوینیئس کے ہاتھوں اس کا تخت

ڈوئل کی ٹھہر گئی تو خود ہمارے پرنس آپ ہی شادی کا خیال ترک کر دیں گے۔ مختصر یہ کہ میں اس شادی کو ہونے نہیں دینا چاہتا۔ اور جیسے بھی مجھ سے بن پڑے گا میں اس میں رکاوٹ ڈالوں گا۔ اب سمجھے تم میری بات؟"

"نہیں، اگر آپ نتاشا کا بھلا چاہتے ہیں تو آپ جان‌بوجھ کر اس کی شادی میں رکاوٹ کیسے ڈال سکتے ہیں؟ یعنی ایسی چیز میں رکاوٹ جو اس کی آبرو پھر سے بحال کر سکتی ہے۔ اس کے آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ اور نیک‌نامی اس کے لئے بےحد ضروری ہے۔"

"اور دنیا بھر کی رائے کی پروا کرنے کی اسے کیا ضرورت! اس طرح سوچنا چاہئے اس کو۔ اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ سب سے بڑھ کر ذلت اس کے لئے اس شادی میں ہے، یعنی ان کمینے لوگوں سے رشتہ رکھنے میں، اس پاجی برادری سے تعلق قائم کرنے میں۔ شریفانہ خودداری — بس اعلی سوسائٹی کو اس کا یہی جواب ہونا چاہئے۔ تب شاید میں بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھانے پر راضی ہو جاؤں گا اور پھر دیکھوں تو کس کی مجال ہے کہ میری بچی پر انگلی اٹھا سکے۔"

حد سے گزرے ہوئے اس آدرش‌واد (آئڈیل‌ازم) نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مگر فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس وقت وہ آپے میں نہیں ہیں اور طیش میں بول رہے ہیں۔

"کچھ زیادہ ہی خیال پرستی ہے اس میں"، میں نے جواب دیا "اور اسی لئے بےدردی بھی ہے۔ آپ اس سے اتنی قوت کا مطالبہ کر رہے ہیں جو غالباً آپ نے اسے پیدائش کے وقت نہیں دی تھی۔ کیا وہ اس شادی پر اس وجہ سے رضامند ہے کہ پرنسس بننا چاہتی ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ محبت کرتی ہے۔ یہ جذبہ ہے، یہ آدمی کی مجبوری ہے۔ پھر اس کے علاوہ آپ نتاشا سے چاہتے ہیں کہ وہ رائے عامہ کو ٹھوکر مار دے اور خود رائے عامہ کے

الٹنے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ سیرویئس ٹولیئس کی لاش باہر پھینک دی گئی تھی اور اس کی بیٹی، ترکوینیئس کی بیوی، جو ترکوینیئس کو بادشاہ قرار دئے جانے کی رسم سے واپس آ رہی تھی، اپنے رتھ میں سوار باپ کی لاش پر سے گزر گئی تھی۔ (ایڈیٹر)

آگے گھٹنے ٹیکتے ہیں۔ پرنس نے آپ کی توہین کی اور آپ پر کھلم کھلا یہ الزام لگایا کہ آپ اندر اندر جوڑ توڑ کرکے پرنس کے خاندان سے رشتہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اب آپ اپنے جی میں سوچ رہے ہیں کہ جب ان لوگوں کی طرف سے شادی کے رشتے کی باقاعدہ تجویز ہو چکی ہے تو اس شادی کی تجویز کو ٹھکرا کر پرانی بدنامی کا بھرپور اور منہ‌توڑ جواب دیا جا سکتا ہے۔ آپ خود پرنس کی رائے کے آگے سر جھکائے دے رہے ہیں۔ آپ اس کوشش میں ہیں کہ وہ اپنی غلطی کو مان لے۔ یعنی آپ کے دل میں ہے کہ لوگ پرنس پر ہنسیں اور آپ اس سے اپنا انتقام لے لیں۔ اور اس غرض کے لئے آپ اپنی بیٹی کے راحت و آرام کو قربان کر دینے پر تلے ہیں۔ کیا یہ خودغرضی نہیں ہے؟،،

بڑے میاں منہ پھلا کر دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ ایک لفظ کا بھی جواب نہیں دیا۔

’’وانیا، تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا،، آخر انہوں نے کہا اور پلکوں میں آنسو کی بوند جھلک کر رہ گئی۔ ’’میں قسم کھا کے کہتا ہوں، تم نے زیادتی کی۔ خیر، مگر اس کو چھوڑو۔ میں تمہارے سامنے دل نکال کر رکھنے سے رہا،، وہ کہتے چلے گئے اور اٹھے، اٹھ کر اپنا ہیٹ لیا۔ ’’ایک بات کہتا ہوں — تم نے ابھی میری بیٹی کے راحت و آرام کا ذکر کیا۔ مجھے قطعی طور پر اور حرف بحرف اس عیش و راحت کا بھروسہ نہیں ہے۔ اور اس سے قطع‌نظر یہ بھی ہے کہ اگر میں دخل نہ دوں تب بھی یہ شادی ہونے‌والی نہیں ہے۔،،

’’مگر یہ کیوں؟ آپ نے ایسا کیوں سوچا؟ کیا آپ کو کچھ اطلاع ہے؟،، میں استعجاب سے چیخ پڑا۔

’’نہیں، مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہے۔ لیکن وہ منحوس لومڑی کی اولاد کسی طرح اس پر آئے گا نہیں۔ یہ سب بکواس ہے۔ بس جال بچھایا جا رہا ہے۔ مجھے اس کا پکا یقین ہے۔ اور میرے لفظ یاد رکھنا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی ہو کر رہے گا۔ اچھا اور مان لو کہ شادی ہو بھی گئی — اور یہ شادی تبھی ہو سکتی ہے کہ اس کمینے پاجی کی کوئی خاص پوشیدہ غرض اس سے پوری ہوتی ہو، وہ خاص غرض کیا ہوگی کوئی نہیں کہہ سکتا اور میں تو بالکل خیال ہی نہیں دوڑا سکتا کہ وہ کیا

ہوگی — تو مجھے بتاؤ، خود اپنے دل سے پوچھو، کیا نتاشا کو اس شادی سے راحت مل جائے گی؟ ملامتیں، ذلتیں، برا بھلا سننا۔ اور ایسے لڑکے کی رفاقت جو ابھی سے اس کی صحبت سے اکتا گیا ہے۔ اور ادھر شادی ہوئی ادھر اس کی عزت کرنا وہ ترک کر دے گا، توہین کرنا شروع کرے گا، اس کی ذلت کرے گا، نگاہ سے گرائے گا۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ نتاشا کی طرف سے محبت کی شدت ہوگی اور دوسری طرف سے سردمہری۔ پھر رقابت، جلن، صدمے، جہنم، طلاق اور ہو سکتا ہے کہ کوئی نازیبا حرکت... نہیں، وانیا! اگر تم لوگ ایسی کوئی کھچڑی پکا رہے ہو اور تم بھی اس میں سہارا دے رہے ہو تو میں تمہیں پہلے سے خبردار کر دوں، خدا کو جواب دینا پڑے گا تمہیں اور وقت نکل جائے گا۔ اچھا، اب رخصت!،،

میں نے انہیں روک لیا۔

’’سنئے نکولائی سرگیئچ، یوں طے کریں — ابھی ٹھیرتے ہیں، دیکھتے ہیں۔ یقین کیجئے صرف دو آنکھیں ہی اس پورے معاملے کو نہیں دیکھ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی حل نکل آئے آپ سے آپ، نہایت ہی مناسب طریقے سے، بغیر کسی زبردستی یا مصنوعی حل نکالنے کے، مثلاً یہی ڈوئل‌والی بات۔ وقت سب سے بڑھ کر فیصلہ کرنے‌والا ہے۔ اور پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ نے جو تدبیر سوچی وہ تو بالکل ہی ناممکنات میں سے ہے۔ کیا آپ واقعی ایک لمحے کے لئے یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ پرنس آپ کا چیلنج قبول کر لے گا؟،،

’’کیوں؟ قبول کیوں نہیں کرے گا؟ تم کیا سمجھتے ہو؟،،

’’آپ سے قسم کھا کے کہتا ہوں، وہ کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اور میری مانئے، وہ کوئی سبیل نکال لے گا جس سے صاف بچ نکلے۔ وہ ایسا نقشہ جمائے گا کہ اپنا کام کر جائے گا اور آپ دوسروں کی ہنسی کا نشانہ بن کر رہ جائیں گے۔،،

’’نہیں، نہیں، میرے بھائی، مانو! تم تو بالکل مجھے ہڑبڑائے دیتے ہو۔ بھلا وہ چیلنج قبول کرنے سے انکار کیسے کردے گا؟ نہیں وانیا، تم تو جیسے کوئی شاعر ہو، واقعی سچ مچ کے شاعر ہو تم! یہ کیوں سمجھتے ہو کہ مجھ سے مقابل ہونا اس کے درجے سے گری ہوئی بات ہے؟ واہ، میں کوئی اس سے نیچا ہوں!

میں ایک عمررسیدہ باپ ہوں جس کی ذلت کی گئی ہے۔ تم روسی ادیب ہو اور اس لئے صاحب حیثیت آدمی ہو۔ تم میری طرف سے وکیل بن سکتے ہو... اور... اور... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اور تم کیا چاہتے ہو؟...''

''اچھا تو دیکھ لیجئے گا آپ۔ وہ ایسے ایسے بہانے تراش کر نکالے گا کہ سب سے پہلے خود آپ ہی مان جائیں گے کہ اس کو مقابلے پر لانا آپ کے لئے بالکل ممکن نہیں ہے۔''

''ہونہہ تو... میرے دوست، اچھا، جیسے تم کہتے ہو ویسے ہی ہونے دو۔ میں ایک خاص وقت تک انتظار کروں گا۔ دیکھتے ہیں کہ وقت کیا کرتا ہے۔ ہاں، مگر ایک بات ہے، میرے بھائی، وعدہ کرو مجھ سے کہ نہ تو وہاں اس گفتگو کے بارے میں کچھ کہوگے اور نہ آننا اندریئونا کو کچھ بتاؤ گے۔''

''وعدہ کرتا ہوں۔''

''ایک اور عنایت کرنا وانیا، کہ اب آئندہ اس معاملے پر مجھ سے بھی کبھی بات نہ کرنا۔''

''اچھا یہ بھی وعدہ رہا۔''

''آخری درخواست اور ہے — مجھے معلوم ہے میرے پیارے کہ شاید ہمارے یہاں تمہارا جی نہیں لگتا ہوگا پھر بھی آتے رہا کرو جب بھی بن پڑے۔ میری بیچاری آننا اندریئونا تم سے اس قدر محبت کرتی ہیں اور... اور یہ بھی ہے کہ تم نہیں آتے تو وہ بےچین رہتی ہیں... سمجھے میری بات؟''

اور انہوں نے تپاک سے میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے تہہ دل سے وعدہ کر لیا۔

''آخر میں اب ایک نازک سوال ہے۔ تمہارے پاس روپیہ تو نہیں ہوگا؟''

''روپیہ؟'' میں نے تعجب سے وہی لفظ دہرایا۔

''ہاں'' (اور بڑے میاں کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور وہ دور دیکھنے لگے) ''میرے بھائی، میں تمہارا فلیٹ دیکھتا ہوں... تمہارے حالات پر نظر کرتا ہوں... اور خیال آتا ہے کہ تمہارے دم کے ساتھ دوسرے خرچے بھی لگے ہوں گے، ایسے جن کا پہلے سے گمان نہیں ہوتا (اور آجکل تو ہو ہی سکتے ہیں) تو یہ ہے

کہ... میرے بھائی، ڈیڑھ سو روبل ہونا چاہئے جو وقت پڑے پر ہاتھ تلے ہو...''

''ڈیڑھ سو روبل... اور وہ بھی وقت پڑے پر ہاتھ تلے۔ ایسے عالم میں جب کہ آپ مقدمہ ہار چکے ہیں؟''

''وانیا، میں دیکھتا ہوں کہ تم میری بات سمجھے نہیں قطعی۔ ایسے اتفاقی خرچے آجاتے ہیں آدمی پر۔ تم سمجھو یہ بات۔ بعض موقعوں پر روپیہ یہ کام کر جاتا ہے کہ آدمی کو مشکل سے نجات دلا دے اور وہ آزادی سے فیصلہ کر سکے۔ ممکن ہے تمہیں فی الحال اس کی ضرورت نہ ہو مگر کیا کبھی کسی وقت آئندہ بھی ضرورت نہ پڑ جائے گی؟ احتیاط کے طور پر میں یہ رقم تمہارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ بس کل یہی ہے جو میں جمع کر سکا۔ اگر خرچ نہ ہو تو واپس کر دینا۔ اور اب میں چل دیا۔ افوہ! خدایا، تم کس قدر پیلے پڑ گئے ہو۔ بالکل بیمار لگتے ہو...''

میں نے کچھ اعتراض نہ کیا اور رقم لے لی۔ یہ بات کافی صاف تھی کہ انہوں نے روپیہ میرے پاس کیوں چھوڑا ہے۔

''مشکل سے قدموں پر کھڑا ہوں'' میں نے انہیں جواب دیا۔

''اس کی طرف سے غفلت مت برتو۔ وانیا، میرے پیارے غفلت مت برتو! آج کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آننا اندریئونا سے تو خیر، میں خود کہہ دوں گا کہ تم کس حال میں ہو۔ ڈاکٹر کی تو ضرورت نہیں تمہیں؟ کل آکر دیکھ جاؤں گا، اپنی سی پوری کوشش کروں گا اگر میری ٹانگوں نے جواب نہ دے دیا تو۔ اور اب تم بستر پر لیٹ جاتے تو ٹھیک تھا... اچھا رخصت... اے لڑکی، خدا حافظ۔ اس نے تو منہ ہی پھیر لیا! سنو، میرے دوست! یہ اور پانچ روبل رہے، اس بچی کے لئے۔ اتنا کہہ دوں کہ تم اسے مت بتانا کہ میں نے دئے تھے۔ بس اس پر خرچ کر دینا۔ جوتے ووتے خرید دینا، یا چھوٹے کپڑے وغیرہ... جن کی ضرورت سمجھو۔ اچھا، خدا حافظ میرے بھائی...''

میں نے انہیں پھاٹک تک پہنچا دیا۔ مجھے چوکیدار سے ویسے بھی کہنا ہی تھا کہ کھانا لے آئے کیونکہ یلینا نے ابھی تک تیسرے پہر کا کھانا نہیں کھایا تھا...

گیارھواں باب

مگر ابھی میں گھر لوٹا ہی تھا کہ میرا سر چکرانے لگا اور میں کمرے کے بیچوں بیچ گر پڑا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں سوائے یلینا کی چیخ کے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر میری طرف لپکی کہ مجھے گرنے سے سنبھال لے۔ یہی آخری لمحہ تھا جو مجھے یاد رہ گیا ہے...

اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ بعد میں یلینا نے بتایا کہ چوکیدار جو اس وقت ہمارے لئے کھانا لے کر آیا تھا اس کی مدد سے اس نے مجھے صوفے پر لٹایا۔ کئی بار میری آنکھ کھلی اور ہر بار میں نے دیکھا کہ یلینا کا فکرمند، پریشان اور حواس باختہ ننھا سا چہرہ میری خبرگیری میں جھکا ہوا ہے۔ یہ سب ایسا یاد ہے جیسے خواب میں دیکھا ہو، جیسے کہرے میں نظر آیا ہو۔ اور بیچاری لڑکی کا پیارا چہرہ جب کبھی ذرا ہوش آ جاتا تھا تو خواب کی طرح، تصویر کی طرح جھلک جاتا تھا۔ وہ میرے پاس کچھ پینے کو لائی، اس نے میرا بستر ٹھیک کیا یا میرے سامنے بیٹھی رہی، غمزدہ، سہمی ہوئی اور اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے میرا سر سہلاتی رہی۔ ایک بار یہ بھی خیال پڑتا ہے کہ اس نے دھیرے سے میرے چہرے پر پیار کیا۔ ایک بار اچانک رات کو میری آنکھ کھل گئی تو صوفے کے قریب چھوٹی میز پر موم بتی کی ٹمٹماتی ہوئی لو کے پاس میں نے دیکھا کہ یلینا میرے تکیے پر سر رکھے اور اپنے گرم گالوں کو ہاتھ کا سہارا دئے ہوئے لیٹی ہے اور اس کے پیلے ہونٹ ادھ کھلے ہیں جس کے معنی ہیں کہ نیند بےفکری کی نہیں ہے۔ دوسرے دن صبح سویرے کہیں مجھے ٹھیک سے ہوش آیا۔ موم بتی جل کر بالکل ختم ہو گئی تھی اور صبح تڑکے کی پہلی گلابی کرنیں دیوار پر چمچما رہی تھیں۔ یلینا میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گہری نیند سو رہی تھی اور اس نے اپنا تھکاماندہ سر بائیں ہاتھ کے سہارے سے ٹکا رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت دیر تک میں اس کی صورت تکتا رہا۔ بچکانہ چہرہ، جو نیند کی حالت میں بھی ایسے غم سے بھرا ہوا تھا جو بچوں میں نہیں ہوا کرتا اور اس پر عجب حسن بیمار کی سی کیفیت تھی۔ پیلا چہرہ،

لمبی لمبی پلکیں ان سوکھے گالوں پر، اس کے گرد گھنے سیاہ بالوں کا حلقہ جو ڈھیر کے ڈھیر اور الجھے ہوئے لچھے بن کر ایک طرف یوں ہی بےپروائی سے پڑے ہوئے تھے۔ اور اس کا دوسرا ہاتھ میرے تکیے پر پسرا تھا۔ بہت دھیرے سے میں نے اس کے ننھے سے پتلے ہاتھ کو چوم لیا۔ لیکن بچی کی نیند میں خلل نہیں پڑا صرف مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر اس کے ہونٹوں پر لہراتی گزر گئی۔ میں اس کی صورت دیر تک تکتا رہا اور تکتے تکتے خود میری آنکھ لگ گئی اور خوب گہری سکون‌بخش نیند آ گئی۔ اس بار ایسی آنکھ لگی کہ دوپہر تک سوتا رہا۔ اور جب اٹھا ہوں تو ایسا لگا کہ قریب قریب تندرست ہو گیا ہوں۔ صرف کمزوری اور اعضا کا بھاری‌پن ہی ایسی علامتیں رہ گئی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ میں بیمار تھا۔ اس قسم کے اچانک اعصابی حملے مجھ پر پہلے بھی ہو چکے تھے۔ میں ان سے خوب واقف تھا۔ یہ دورہ کوئی چوبیس گھنٹے میں گزر جاتا تھا۔ مگر جب پڑتا تھا تو چوبیس گھنٹے میں ہی بہت سخت ہوتا تھا اور ہلا ڈالتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ آنکھ کھلتے ہی پہلی نظر جس چیز پر پڑی وہ پردے تھے جو میں کل خرید کر لایا تھا، وہ کونے میں ایک طرف لٹکے ہوئے تھے۔ یلینا نے پردے لٹکا کر اپنے لئے ایک الگ کمرہ نکال لیا تھا۔ وہ چولھے کے آگے بیٹھی پانی کے جوش کھانے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ میں جاگ گیا ہوں وہ خوشی سے مسکرائی اور اٹھ کر میرے پاس آئی۔

”میری بچی،“ میں نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا ”تم رات بھر میری دیکھ بھال کرتی رہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر اچھی ہو۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں رات بھر دیکھ بھال کرتی رہی ہوں؟ ممکن ہے میں رات بھر سوتی رہی ہوں،“ اس نے مجھے دیکھا اور زندہ‌دلی اور شرمیلےپن سے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔ پھر اپنے ہی لفظوں پر شرما کر وہ سرخ ہو گئی۔

”کئی بار میری آنکھ کھلی اور میں نے تمہیں دیکھا۔ تم صرف صبح ہوتے سوئی ہو...“

”چائے پیئیں گے آپ؟“ اس نے بات کاٹ کر کہا گویا اس

گفتگو کو جاری رکھنا اسے دشوار ہو رہا ہو۔ ان تمام شریف نیک‌دل اور راست‌باز لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے جن کی ان کے منہ پر تعریف کی جا رہی ہو۔

”ہاں پیوں گا،، میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تم نے کل سہ‌پہر کا کھانا بھی کھا لیا تھا یا نہیں؟،،

”تیسرے پہر کا تو نہیں، البتہ رات کا کھانا کھا لیا تھا۔ چوکیدار لے آیا تھا۔ مگر آپ بولئے نہیں۔ چپ چاپ لیٹے رہئے۔ ابھی آپ کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے،، اس نے میرے پاس چائے لاتے ہوئے اور میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”چپ کیسے لیٹا رہوں، لیٹوں گا شام ہونے تک۔ پھر باہر جانا ہے مجھ کو۔ جانا ہی ہوگا یلینا!،،

”کیا واقعی؟ جانا ہوگا! اور کس کے پاس جانا ہے آپ کو؟ انہیں کے پاس جو کل ہمارے گھر مہمان آئے تھے؟،،

”نہیں، ان کے ہاں نہیں۔،،

”تب تو اچھا ہے کہ ان کے ہاں نہیں جانا۔ کل وہی آپ کی طبیعت خراب کر گئے۔ تو کیا ان کی بیٹی کے ہاں جائیں گے؟،،

”تمہیں کیسے خبر ہو گئی ان کی بیٹی کی؟،،

”کل میں نے سب کچھ سن لیا،، اس نے نظریں نیچی کرکے جواب دیا۔ وہ چہرہ پھلائے ہوئے تھی اور بھویں چڑھی ہوئی تھیں۔

”برے آدمی ہیں وہ بڑے میاں،، تھوڑی دیر میں اس نے اضافہ کیا۔

”تو کیا تم انہیں جانتی ہو؟ اس کے برعکس وہ بہت نیک‌دل شریف آدمی ہیں۔،،

”نہیں نہیں۔ بد آدمی ہیں — میں سن چکی ہوں،، اس نے زناٹے سے جواب دیا۔

”کیا سن لیا تم نے بھلا؟،،

”یہی کہ وہ اپنی بیٹی کو معاف کرنے پر تیار نہیں ہیں...،،

”لیکن وہ اسے بہت چاہتے ہیں۔ وہی لڑکی قصوروار ہے اور اب وہ اس کی وجہ سے دکھ بھر رہے ہیں اور پریشان رہتے ہیں۔،،

”تو پھر معاف کیوں نہیں کر دیتے اسے؟ اگر وہ اسے معاف کر دیں تو بھی بیٹی ان کے پاس واپس نہیں جائے گی۔،،

”کیوں، بھلا ایسا کیوں؟،،

”کیونکہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ بیٹی ان سے محبت کر سکے،، اس نے گرم ہوکر جواب دیا۔ ”بلا سے بیٹی ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ دے۔ اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتی پھرے در در اور وہ بیٹی کو بھیک مانگتے دیکھیں اور زیادہ دکھ بھریں۔،،

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور گال تمتما گئے۔ میں نے سوچا ”یہ لفظ بے‌سبب اس کی زبان سے نہیں نکلے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔،،

”تو کیا آپ انہی بڑے میاں کے گھر مجھے بھیجنے‌والے تھے؟،، اس نے ذرا تھم کر پوچھا۔

”ہاں، یلینا۔،،

”نہیں، اس سے تو اچھا ہے کہ میں کہیں نوکرانی بن کر رہ لوں۔،،

”افوہ، سب بے‌جا ہے، جو تم کہہ رہی ہو، یلینا! کیا فضول کی بات ہے۔ اور تمہیں نوکر کون رکھے گا؟،،

”کوئی بھی گنوار رکھ لے گا،، اس نے بے‌صبری سے جواب دیا اور وہ زیادہ سے زیادہ ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے بری طرح طیش آتا تھا۔

”کسی گنوار کو تم جیسی نوکرانی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے،، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا تو کوئی شریف گھرانا سہی۔،،

”ایسا مزاج لے کر تم گویا کسی شریف گھرانے میں رہ بھی سکتی ہو؟،،

”میں گزر کر لوں گی۔،،

جتنا وہ بگڑتی گئی اتنے ہی اس کے جواب بے‌تکے ہو گئے۔

”تم خود ہی وہاں نہیں ٹھیروگی۔،،

”ہاں، ضرور ٹھیر جاؤں گی۔ وہ ڈانٹیں ڈپٹیں گے، میں جان بوجھ کر چپ لگا جاؤں گی۔ وہ ماریں پیٹیں گے، میں بولوں گی ہی نہیں۔ بالکل زبان نہیں کھولوں گی۔ مارنے دو۔ چاہے کچھ ہو جائے — میں روؤں گی ہی نہیں۔ وہ غصے سے جل جائیں گے کہ یہ تو روتی بھی نہیں۔،،

”کیسی باتیں کرتی ہو یلینا! تم میں کتنا زہر بھرا ہے۔ کتنی اکڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی میں بہت دکھ جھیلے ہیں...،،

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بڑی میز کی طرف بڑھا۔ یلینا صوفے پر ہی بیٹھی رہی اور سوچ میں ڈوبی ہوئی فرش کو دیکھتی رہی۔ اور صوفے کا کنارہ انگلیوں سے مروڑتی رہی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے خیال آیا کہ ’’کہیں یہ میری بات سے رنجیدہ تو نہیں ہو گئی؟،،

میز کے پاس کھڑے کھڑے میں نے یوں ہی بے خیالی میں وہ کتابیں کھولیں جو کل تالیف کی غرض سے لے کر آیا تھا اور رفتہ رفتہ مطالعے میں محو ہوتا گیا۔ اکثر میرے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ میں یوں ہی کوئی کتاب ذرا کھول لیتا ہوں نظر ڈالنے کے لئے اور پھر پڑھنے میں ایسا گم ہوتا ہوں کہ دین دنیا کی کچھ خبر نہیں رہتی۔

’’آپ ہمیشہ کیا لکھتے رہتے ہیں؟،، یلینا نے خاموشی سے میرے پاس میز تک آتے ہوئے دبی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

’’سبھی طرح کی چیزیں، یلینا۔ اس کام کا مجھے روپیہ ملتا ہے۔،،

’’درخواستیں، اپیلیں؟،،

’’نہیں، وہ نہیں،، پھر جتنا ہو سکتا تھا میں نے اسے سمجھایا کہ مختلف قسم کی کہانیاں، مختلف قسم کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہوں۔ اور پھر یہ کہانیاں جڑکر کتابیں تیار ہو جاتی ہیں جنہیں لمبی کہانیاں اور ناول کہتے ہیں۔ اس نے میری باتیں نہایت تجسس سے سنیں۔

’’اور جو باتیں آپ لکھتے ہیں وہ کیا سچ ہوتی ہیں؟،،

’’نہیں، میں اپنی طرف سے گڑھ لیتا ہوں۔،،

’’تو بھلا جھوٹی سچی کیوں لکھتے ہیں؟،،

’’اچھا تو لو، یہ پڑھو۔ دیکھتی ہو، یہ رہا کتابچہ۔ ایک بار تم اسے دیکھ ہی چکی ہو۔ تمہیں پڑھنا تو آتا ہے نا؟،،

’’ہاں آتا تو ہے۔،،

’’تب تو خود دیکھ لو۔ یہ کتاب میں نے لکھی ہے۔،،

’’آپ نے لکھی ہے؟ پڑھوں گی...،،

کوئی بات تھی جو وہ کہنا تو بہت چاہتی تھی مگر شدت اضطراب میں کہنا مشکل ہو گیا۔ اس کے سوالوں کے پس پردہ کوئی نہ کوئی چیز پوشیدہ تھی۔

’’کیا اس کے آپ کو بہت روپے ملتے ہیں؟،، اس نے بالآخر پوچھ لیا۔

’’ہاں، جیسا موقع ہوا۔ کبھی بہت سے، کبھی کچھ بھی نہیں کیونکہ کام ہو نہیں پاتا۔ یلینا، یہ کام بڑا کٹھن ہے۔،،

’’تو گویا آپ مالدار آدمی نہیں ہیں؟،،

’’ہاں، مالدار نہیں ہوں میں۔،،

’’اچھا تو میں کام کروں گی اور آپ کا سہارا بنوں گی...،،

اس نے مجھے تیزی سے دیکھا۔ جھینپ آ گئی۔ آنکھیں جھکا لیں۔ جلدی سے میری طرف دو قدم بڑھا کر اس نے اپنی باہوں سے مجھے جکڑ لیا اور چہرہ بہت ہی زور سے میرے سینے سے بھینچا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

’’میں آپ سے محبت کرتی ہوں... میں مغرور لڑکی نہیں ہوں،، اس نے کہا۔ ’’آپ نے کل کہا تھا کہ میں بہت مغرور ہوں۔ نہیں، نہیں۔ میں ایسی نہیں ہوں... میں آپ سے پیار کرتی ہوں۔ صرف اکیلے آپ ہیں جو مجھے چاہتے ہیں...،،

آنسوؤں سے اس کا گلا رندھ گیا۔ اور منٹ بھر بعد ایسے پھوٹ پھوٹ کے روئی جیسے دورہ پڑنے کے وقت کل رو چکی تھی۔ میرے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئی اور میرے ہاتھوں کو، پیروں کو چومنے لگی...

’’آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں!..،، اس نے وہی جملہ دہرایا ’’آپ ہی اکیلے ہیں جنہیں میرا خیال!..،،

اس نے بے اختیار ہو کر میرے دونوں گھٹنے اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ وہ تمام جذبات جو اتنے دن سے گھوٹے ہوئے تھی ایک دم بے قابو ہو کر پھٹ پڑے اور تب میں سمجھا کہ اس دل کا عجیب و غریب اکھڑپن کیا ہوتا ہے جو معصومیت سے وقتی طور پر خود کو پردے میں رکھتا ہے اور ایسے وقت سخت ضبط و برداشت سے کام لیتا ہے جب کہ اظہار و بیان کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہو۔ پھر یہاں تک نوبت آجاتی ہے کہ یہ بند ٹوٹ جائے اور دل اچانک پوری سپردگی کے ساتھ خود کو فراموش کرکے محبت کے دھارے میں، احسان مندی، جذبات اور آنسوؤں کے دھارے میں بہہ جائے...

وہ سبکیاں لیتی رہی یہاں تک کہ اسے دورہ پڑ گیا اور جسم

اکڑ گیا۔ بہت زور لگاکر میں نے اس کے ہاتھ کھولے جو اب تک مجھے جکڑے ہوئے تھے۔ اسے اٹھایا اور صوفے تک لے گیا۔ دیر تک وہ سبکتی رہی۔ اپنا چہرہ تکیے میں چھپائے رہی جیسے مجھے دیکھتے شرماتی ہو۔ لیکن میرا ہاتھ اس نے بڑی سختی سے پکڑ رکھا تھا اور اسے اپنے دل سے لگاکر بھینچے ہوئے تھی۔

آہستہ آہستہ اسے سکون ہوتا گیا۔ لیکن اس پر بھی وہ میری طرف سر نہیں اٹھا رہی تھی۔ دو ایک بار اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں بڑی نرمی اور ایک طرح جھینپ تھی۔ آخر چہرے پر سرخی دوڑی اور وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''اب سکون ہو گیا تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''میری بچاری چھوٹی موٹی یلینا، میری بیمار بچی۔''

''نہیں، یلینا نہیں...'' وہ بدبدائی اور اب تک مجھ سے منہ چھپائے جا رہی تھی۔

''یلینا نہیں تو پھر کیا؟''

''نیلی۔''

''نیلی؟ مگر نیلی ہی کیوں؟ اگرچہ یہ بھی بہت اچھا نام ہے۔ خیر، میں تمہیں اسی نام سے پکاروں گا اگر تم خود یہی چاہتی ہو۔''

''اماں مجھے اسی نام سے پکارا کرتی تھیں... اور کسی نے مجھے اس نام سے نہیں پکارا۔ کسی نے بھی نہیں سوائے ان کے... اور میں خود نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے اس نام سے پکارے سوائے اماں کے... اور اب آپ پکارئیے، میں یہی چاہتی ہوں... میں آپ سے ہمیشہ محبت کروں گی۔ ہمیشہ محبت کروں گی...''

''یہ محبت کرنے والا دل پرغرور ہے'' میں نے اپنے جی میں سوچا۔ ''کتنا وقت لگ گیا مجھے یہ حق حاصل کرنے میں کہ تمہیں 'نیلی' کے نام سے پکارسکوں!'' مگر اب میں سمجھ گیا کہ اس کا دل سدا کے لئے میری محبت میں اسیر ہو گیا ہے۔

''نیلی، سنو،'' جیسے ہی اسے پوری طرح سکون ہو گیا میں نے فوراً سوال کیا۔ ''تم نے ابھی کہا تھا کہ صرف ماں نے تم سے محبت کی اور کسی نے نہیں۔ تو کیا تمہارے نانا سچ مچ تمہیں نہیں چاہتے تھے؟''

''نہیں، وہ نہیں چاہتے تھے...''

''پھر بھی تم ان پر رو پڑیں۔ یاد ہے جب تم زینے پر روئی تھیں؟''

وہ منٹ بھر سوچتی رہی۔

''نہیں، وہ مجھے نہیں چاہتے تھے... وہ برے آدمی تھے۔'' اور کوئی دردناک احساس اس کے چہرے پر جھلکا۔

''مگر انہیں کیا الزام دیا جا سکتا ہے، نیلی۔ تم جانو۔ ان کی تو عقل میں بالکل فتور آ چکا تھا۔ موت بھی ایسی ہوئی ان کی بالکل پاگل کی سی۔ میں تمہیں سنا تو چکا ہوں کہ وہ کیسے مرے۔''

''یہ تو عمر کے آخری مہینے میں ہی ان کا حال ہوا تھا کہ ہر بات بھولنے لگے تھے۔ بیٹھے ہیں بس، سارے سارے دن بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اگر میں ان کے پاس نہ آتی تو دو تین دن ایسے ہی بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے۔ پہلے ایسے نہیں تھے، اس سے کہیں اچھے تھے۔''

''پہلے کے لفظ سے کیا مطلب، کب؟''

''جب اماں زندہ تھیں۔''

''تو مطلب یہ کہ تم ہی ان کے لئے کھانے پینے کو لایا کرتی ہوگی، نیلی؟''

''ہاں میں بھی لے آتی تھی۔''

''کہاں سے لاتی تھیں تم۔ ببنووا کے یہاں سے؟''

''نہیں، میں نے اس کے ہاں سے کبھی کچھ بھی نہیں لیا'' اس نے بہت سختی سے جواب دیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''پھر تم کہاں سے لاتی تھیں؟ تمہارے پاس تو کچھ تھا نہیں، ہے نا؟''

نیلی اس پر چپ ہو گئی اور بری طرح پیلی پڑ گئی۔ پھر مجھے ذرا دیر تک تکتی رہی اور بولی:

''میں باہر سڑک پر نکل جاتی تھی اور بھیک مانگتی تھی۔ جہاں پانچ کوپک ملے اور میں نے ان کے لئے روٹی اور نسوار کا تمباکو خریدا...''

''اور وہ تمہیں اس کی اجازت دیتے تھے؟ نیلی! نیلی!''

''شروع شروع میں ان سے کہے بغیر ایسا کرتی رہی۔ پھر

انہیں معلوم ہو گیا تو وہ خود ہی دھکے دے دے کر بھیک مانگنے بھیجا کرتے تھے۔ میں پل پر کھڑی ہو جاتی اور راہ گیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتی۔ وہ خود پل کے پاس گھومتے رہتے۔ تاک میں لگے رہتے۔ جیسے ہی ان کی نظر پڑتی کہ مجھے کچھ ملا فوراً مجھ پر جھپٹتے اور روپیہ اینٹھ لیتے۔ جیسے میں کوئی ان سے چھپا لینا چاہتی ہوں اور ان کے لئے نہیں رکھ رہی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ کڑوی ہنسی سے مسکرائی۔ کس بلا کا زہرخند تھا۔

''جب اماں مر گئیں تب سے ایسا ہونے لگا تھا،'' وہ بولی۔ ''ان کی حالت اس وقت بالکل پاگل کی ہو گئی تھی۔''

''تو مطلب یہ کہ تمہاری اماں سے انہیں بہت محبت ہوگی۔ پھر وہ ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے تھے؟''

''نہیں، محبت نہیں تھی... وہ بدذات آدمی تھے، انہوں نے اماں کو معاف نہیں کیا... جیسے وہ تھے کل والے بدذات بڑے میاں،'' اس نے بہت دھیمے سے کہا جیسے کان میں کہہ رہی ہو اور زرد سے زردتر ہوتی چلی گئی۔

میں چونک پڑا۔ پورے ایک ناول کا پلاٹ میری نظر کے سامنے پھر گیا۔ ایک غریب عورت جو کفن‌ساز کی کوٹھری میں ایڑیاں رگڑکر مر گئی، اس کی یتیم یسیر بچی جو اپنے بوڑھے نانا کے پاس کبھی کبھی آتی رہی، جس بوڑھے نے اس کی ماں کو عاق کر دیا تھا۔ بےحواس عجیب قسم کا بوڑھا جو ایک مٹھائی‌والے کی دکان میں مر گیا اپنے کتے کی موت کے بعد!..

''پہلے یہ کتا ازورکا اماں کا تھا،'' نیلی نے ایک دم کسی بات کو یاد کرتے ہوئے مسکراکر کہا۔ ''نانا ابا پہلے تو اماں کو بہت چاہتے تھے مگر جب وہ انہیں چھوڑکر چلی گئیں تو کتا وہیں رہ گیا۔ اسی لئے نانا ابا کو کتے سے محبت ہو گئی... اماں کو تو انہوں نے معاف نہیں کیا لیکن جیسے ہی ازورکا مرا وہ بھی اسی کے ساتھ مر گئے،'' نیلی نے کرخت لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر آئی ہوئی مسکراہٹ گم ہو گئی۔

''نیلی، یہ تو بتاؤ، وہ پہلے کیا تھے؟'' میں نے ذرا دیر ٹھیر کر پوچھا۔

''وہ کھاتے پیتے آدمی تھے... مجھے نہیں معلوم کیا تھے...''

اس نے جواب دیا۔ ''کوئی بڑا کارخانہ تھا ان کا... یہ اماں نے مجھے بتایا تھا۔ شروع میں تو اماں سمجھتی تھیں کہ میں بہت چھوٹی ہوں اور مجھ سے سب کچھ نہیں کہتی تھیں۔ مجھے چمکارتیں اور پیار کرکے کہتیں: 'تجھے سب معلوم ہو جائےگا۔ وقت آئےگا، میری ننھی سی دکھیا غریب بچی، تو تجھے ایک ایک بات کی خبر ہو جائےگی'۔ وہ مجھے ہمیشہ دکھیا غریب بچی کہا کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھی رات کو جب وہ سمجھتی تھیں کہ میں سو رہی ہوں (اگرچہ میں بن‌کے لیٹ جاتی تھی) تو وہ مجھ پر آنسو بہایا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں۔ میری غریب دکھیا بچی!''

''تمہاری ماں کاہے سے مر گئیں؟''

''دق کی بیماری سے۔ اب چھ ہفتے ہو جائیں گے انہیں مرے۔''

''تمہیں وہ زمانہ یاد ہے جب تمہارے نانا امیر آدمی تھے؟''

''مگر میں تو اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری پیدائش سے پہلے ہی اماں انہیں چھوڑکر چلی گئی تھیں۔''

''کس کے ساتھ چلی گئی تھیں؟''

''مجھے نہیں معلوم،'' نیلی نے جواب دیا۔ آہستہ سے اور جیسے خیال دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''وہ پردیس چلی گئی تھیں۔ میں وہیں پیدا ہوئی۔''

''پردیس؟ کہاں یعنی؟''

''سوئٹزرلینڈ میں۔ میں ہر جگہ رہ چکی ہوں۔ اٹلی میں بھی رہی۔ پیرس میں رہی۔''

میں حیرت میں پڑ گیا۔

''اور تمہیں یاد ہے، نیلی؟''

''ہاں بہت کچھ یاد ہے۔''

''مگر تمہیں اتنی اچھی روسی زبان کہاں سے آ گئی، نیلی؟''

''اماں مجھے وہاں بھی روسی زبان سکھایا کرتی تھیں۔ اماں روسی تھیں کیونکہ میری نانی روسی تھیں۔ نانا انگریز تھے لیکن وہ بھی روسی جیسے تھے۔ اور جب ڈیڑھ سال پہلے میں یہاں اپنی اماں کے ساتھ لوٹ کر آئی تو میں نے اچھی طرح روسی سیکھ لی۔ اماں اس زمانے میں بیمار تھیں۔ ہم لوگ غریب سے غریب ہوتے چلے گئے۔ اماں ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ پہلے تو وہ بہت دنوں

تک یہاں پیٹرسبرگ میں نانا ابا کو تلاش کرتی رہیں، ہمیشہ کہتی تھیں کہ میں ان کی قصوروار ہوں۔ اور رویا کرتی تھیں... اس قدر، اس قدر وہ روتی تھیں کہ بس! جب انہیں معلوم ہوا کہ نانا مفلس ہوگئے ہیں تو اور بھی زیادہ رویا کرتی تھیں۔ وہ اکثر انہیں خط لکھا کرتی تھیں مگر نانا ابا نے کبھی جواب ہی نہیں دیا۔،،

”تمہاری اماں یہاں لوٹ کے کیوں آ گئیں؟ کیا اپنے باپ کی وجہ سے؟،،

”مجھے خبر نہیں۔ مگر وہاں پردیس میں ہماری زندگی اس قدر آرام کی تھی!،، نیلی کی آنکھیں اس ذکر پر چمک اٹھیں۔ ”اماں اکیلی رہتی تھیں۔ بس میں تھی ان کے ساتھ۔ ان کا ایک دوست تھا۔ بڑا اچھا آدمی، آپ کی طرح کا... وہ انہیں تبھی سے جانتا تھا جب وہ یہاں دیس میں تھیں۔ اس کا وہاں انتقال ہو گیا اور اماں وطن کو لوٹ آئیں...،،

”تو گویا تمہاری اماں اپنے باپ کو چھوڑکر اسی کے ساتھ چلی گئی ہوں‌گی؟،،

”نہیں، اس کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ پہلے تو وہ کسی اور کے ساتھ گئی تھیں مگر اس نے انہیں چھوڑ دیا...،،

”وہ کون شخص تھا، نیلی؟،،

نیلی نے مجھے نظر بھرکر دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس شخص کا نام جانتی تھی جس کے ساتھ اس کی ماں گھر چھوڑکر نکلی ہوگی اور جو غالباً نیلی کا باپ تھا۔ میرے سامنے بھی اس کا نام لیتے ہوئے نیلی کو ناگوار گزر رہا تھا...

میں اسے اور سوالوں سے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ عجیب کیرکٹر تھا اس کا، ناہموار اور غصہ‌ور مگر اپنے اندرونی جذبات کو دبائے رکھنے‌والا۔ پیارا دلکش، لیکن اکڑ اور کم‌سخنی کے پردے میں خود کو چھپائے رکھنے‌والا۔ اگرچہ وہ مجھے تہہ‌دل سے پیار کرتی تھی اور اس کی محبت میں بڑی پاکیزگی اور اجلاپن تھا قریب قریب ویسے ہی جیسے وہ اپنی اس مرحوم ماں سے کرتی تھی جس کو یاد کرنے سے بھی اس کا دل دکھے بغیر نہ رہتا تھا، مگر اس کے باوجود جتنے عرصے میرا اس کا واسطہ رہا اس نے شاید ہی کبھی مجھ سے کھل کر بات کی ہوگی اور اس خاص دن

کے علاوہ مشکل سے ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ وہ جذبے میں آکر آپ‌بیتی سنانے بیٹھ جائے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مجھ سے بات کرنے میں کھچی کھچی رہتی تھی۔ لیکن اس روز کئی گھنٹوں کے دوران، دردناک سبکیوں اور آہوں کے درمیان، جو اس کی کہانی میں خلل انداز ہو جاتی تھیں، اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا، وہ سب جو اس کے ذہن میں چبھتا تھا اور اسے غم‌زدہ کرتا تھا۔ میں کبھی اس ہولناک کہانی کو بھول نہیں سکتا۔ مگر اس کہانی کا اصل حصہ آگے کہا جائے گا...

واقعی یہ بڑی ہولناک کہانی تھی۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی تھی جسے لاوارث چھوڑ دیا گیا اور جو اپنے عیش لٹ جانے کے بعد جیتی رہی۔ بیمار رہی، قوت زائل ہوگئی۔ ہر شخص نے اس پر تھوتھو کیا۔ اور وہ آخری آدمی جس کا سہارا لینا چاہا اس نے بھی دھتکار دیا۔ یہ آخری شخص خود اس عورت کا باپ تھا جس کے ساتھ ایک بار وہ زیادتی کر چکی تھی اور جو بیٹی کی زیادتی اور دنیا بھر کے مصائب اور ذلتوں سے تنگ آکر عقل کھو چکا تھا۔ یہ ایسی عورت کی کہانی تھی جو ہر طرف سے مایوس و نامراد ہوکر پیٹرسبرگ کی سڑکوں پر اپنی بچی کو، جسے وہ ابھی بہت کم‌سن سمجھتی تھی، لئے ہوئے، کیچڑ پانی میں، سردی پالے میں بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ ایسی عورت کی کہانی تھی جو مہینوں ایک سیلے ہوئے تہہ‌خانے میں پڑی مرتی رہی جب کہ اس کا باپ جس نے مرتے دم تک اسے معاف کرنے سے انکار کیا، بالکل آخری وقت ترس کھاتا ہوا آیا کہ بیٹی کو معاف کر دے لیکن وہاں اس عورت کی جگہ جسے وہ دنیا میں سب سے عزیز سمجھتا تھا، ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔

یہ ایک عجب کہانی تھی بہت پراسرار بلکہ بمشکل سمجھ میں آنے‌والے ان تعلقات کی جو ایک بوڑھے، عقل سے معذور آدمی کے اپنی اس کم‌عمر نواسی سے تھے جو نانا کو سمجھتی تھی۔ اور اپنی کمسنی کے باوجود ایسی بہت سی باتیں سمجھتی تھی جو کچھ لوگ جنہیں آسائش اور بےفکری کی زندگی میسر ہے، عمریں گزر جانے کے باوجود نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ یہ بڑی گمبھیر کہانی تھی ان گمبھیر اور دردناک کہانیوں میں سے ایک جو اکثر پیٹرسبرگ کے بوجھل آسمان کے نیچے، ان‌دیکھی انجانی، بلکہ

پراسرار طریقے سے اس وسیع شہر کے تاریک کونوں کھدروں میں ہوتی رہتی ہیں۔ زندگی کے دم گھونٹنے والے گتھم گتھا ماحول میں، مردار خود پرستی کے پیچوں بیچ، ایک دوسرے سے متصادم خود غرضیوں کے اور بے ہودہ سازشوں اور پوشیدہ جرائم کے درمیان اور ایک بے حس اور بگڑی ہوئی زندگی کی رستی ہوئی جہنم کے هجوم میں...

مگر یہ کہانی آگے کہی جائے...